

غارِ حرا میں ایک رات

(سفرنامہ)

PDFBOOKSFREE.PK

مستنصر حسین تارڑ

غارِ حرا میں ایک رات

(سفرنامہ)

مستنصر حسین تارڑ

نگ میل پبلی کیشنز، لاہور

910.4 Tarar, Mustansar Hussain
Ghar-e Hira Mein Aik Raat/
Mustansar Hussain Tarar.- Lahore : Sang-e-
Meel Publications, 2017.
296pp.
I. Urdu Literature - Travelogue.
I. Title.

اس کتاب کا کوئی بھی حصہ سنگ میل پبلی کیشنز یا مصنف سے باقاعدہ
تحریری اجازت کے بغیر کہیں بھی شائع نہیں کیا جاسکتا اگر اس قسم کی
کوئی بھی صورت حال نمود پڑے تو قانونی کارروائی کا حق محفوظ ہے

2007

نیاز احمد نے

سنگ میل پبلی کیشنز لاہور

سے شائع کی۔

تپش شوق نے ہر ذرے پہ اک دل باندھا
(عالب)

ISBN 969-35-1895-0

Sang-e-Meel Publications

25 Dulekha-Pakistan (New Map), P.O. Box 907 Lahore-54000 PAKISTAN
Phones: 7220100-7228143 Fax: 7245101
http://www.sang-e-meel.com e-mail: smep@sang-e-meel.com

عالمی طیف ایڈیٹرز پرائیویٹ لاہور

ترتیب

صفحہ	عنوان	باب
7	شہر رسولؐ	
7	"پھر مدینے میں ہونا کیسا ہوتا ہے..."	1
8	"جہاں میں اپنے رسولؐ سے ملاقات... اندھے گداگر کے کشکول میں ایک سنہری سکہ"	2
16	"مکہ ماہِ قبلہ کے گھر... جہاں وہاں سنہاری تھیں بابا کے ہم شکل حضرت ابراہیمؑ کو کھلاتی تھیں"	3
26	"کعب بن اشرف کا قلعہ، ہونٹنیر کی ہستی... جہاں حضورؐ نے ایک پتھر سے ایک لکائی..."	4
36	"ہنوقریفہ کے آثار... حضرت لہاب کی پشیمانی..."	5
40	"مجموہوں کے جھنڈ میں پوشیدہ مسجدِ راتونہ کے کھنڈر... جہاں تیرا آتش قدم دیکھتے ہیں..."	6
48	"جو تو دریائے سے ہے تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا... بیڑ غرض کے کنویں کے پانیوں پر حضورؐ کے ہونٹ اور میری آنکھیں"	7
56	"برادرِ بال مسجدِ قباء میں رسولؐ کی باتیں کرتے ہیں"	8
58	"آتش پرست کہتے ہیں اہل جہاں مجھے... فارس کا سلمان"	9
62	"سلمان فارسی کی شندق... اور بابا نے جہاں خیمہ لگایا تھا"	10
67	"تیرا اندازوں کا نیا اور جس گڑھے میں حضورؐ گرے تھے... عشق پر پلستر نہیں کیا جاسکتا"	11
74	"اندرو... اندر میرے رسولؐ کی خوشبو ہے"	12
	"شہرِ لہاں حوا"	
87	"حدہ میں ہونا بس ایسا ویسا ہی ہوتا ہے... غار حرا پر انکی ہوئی سوئی "برسورے"	13
96	"فہرستِ سامان برائے غار حرا... تہی رک سیک میں"	14
99	"تخت ہزارے لے چل بلہیا..."	15
101	"مکہ مکرمہ... 90 کلومیٹر"	16
108	"تہش شوق نے ہر ڈرے پاک دل باندھا... میں کیسے غار حرا..."	17
	"غارِ رسولؐ میں"	
112	"غار حرا میں ایک رات..."	18



”پھر مدینے میں ہونا کیسا ہوتا ہے“

میں پھر مدینے میں تھا..

اور مدینے میں ہونا کیسا ہوتا ہے..

جیسے قصر الحمر کے حصار کی ایک شکستہ دیوار پر میکسیکو کے شاعر اکازا کے یہ مصرعے کندہ دکھائی دیتے ہیں جو اس نے غرناطہ میں ایک اندھے گداگر کو دیکھ کر لکھے تھے..

”اے عورت! اس گداگر کو بھیک دو

کہ غرناطہ جیسے شہر میں ہونا..

اور آنکھوں سے محروم ہونا..

زندگی میں اس سے بڑی لذت اور کوئی نہیں..“

تو وہ غرناطہ تو محض ایک کوئٹل تھی..

تو محض ایک کوئٹل کی اس شجر محل ریز سے کیا نسبت جس کی شاخوں سے ایسی غرناطہ جیسی ہزاروں کوئٹلیں پھوٹی تھیں..

ایک غرناطہ.. ایک کوئٹل اگر ایسی تھی تو جس شجر.. مدینے سے وہ پھوٹی تھی وہ کیسا ہوگا..

مدینے ایسے شہر میں تو انسان بے شک اندھا ہو تو بھی یہ اس کی سب سے بڑی خوش قسمتی

ہوگی..

مدینے میں ہونا ایسا ہوتا ہے..



”تنہائی میں اپنے رسولؐ سے ملاقات..“

اندھے گداگر کے کشکول میں ایک سنہری سکہ!“

میں پھر مدینے میں تھا۔ اس فرق کے ساتھ کہ اسی برس فروری میں حج کے ایام میں میرے
عراق اور اب آکٹوبر کے اوائل میں میوند میرے ساتھ تھی۔

ان سات ماہ کے اندر اندر فیصہ سے میرے لیے یہ بندوبست کر دیا گیا تھا کہ میں پھر مدینے
میں آ جاؤں۔

میں لاہور میں ابھی حج کی حکمن اتار رہا تھا کہ مجھے اطلاع کی گئی کہ اس برس قطری انجمن
فروع اردو ادب کا معتبر ایوارڈ، زندگی بھر کی نثری کاوشوں کے صلے میں مجھے عطا کیا جا رہا ہے۔ اور یونہی
قطر میں ایک عالی شان محفل میں مجھے ایک شیلڈرے کرٹریا نہیں جانا تھا بلکہ اس کے ہمراہ ایک خلیفہ رقم
کا چیک بھی تھایا جاتا تھا۔ مجھے یہ بھی خبر ملی کہ مشتاق احمد یوسفی صاحب کی سربراہی میں جو جویری تھی اس
نے نہ صرف متفقہ طور پر یہ فیصلہ سنایا تھا بلکہ ایوارڈ کی تاریخ میں کم سے کم، یعنی دو تین منٹ کے اندر اندر
یہ فیصلہ سنایا تھا۔

میں کسٹمنی سے کام نہیں لے رہا لیکن مجھے اس ایوارڈ کی سمجھ نہ آئی۔ کہ یہ کیوں مجھے مل گیا
ہے۔ مجھ سے پیشتر یہ ایوارڈ جن بزرگان ادب کو ملتا تھا میں ان کے ہم پلہ نہ تھا۔ میں نے جو سیکھا تھا ان
سے سیکھا تھا۔ یوسفی صاحب، احمد ندیم قاسمی، مختار مسعود، اشفاق احمد، محمد خالد اختر اور پچھلے برس شوکت
صدیقی کے بعد مجھ ایسے نابالغ ادیب کو کیوں عطا کیا گیا تھا۔

اس کی صرف ایک ہی وجہ تھی۔

اس کے علاوہ کوئی جواز نہ تھا۔

یہ ایوارڈ محفل ایک ہی جگہ تھا جہاں سے مدینے جانے کا۔

یہ سب اٹنی کا کیا دھرا تھا۔

اور شادب کے باپا لوگ کے بعد مجھ ایسے بچے لوگ کو اتنا بڑا ایوارڈ دینے کا اور کوئی جواز نہ تھا۔

نہ جویری کو کچھ خبر ہوئی اور نہ ایوارڈ دینے والوں کو۔ کہ اس بندے کی تو سفارش آگئی ہے۔

قطر سے جدہ کچھ دور نہ تھا، اور جدہ سے مدینہ تو بالکل دور نہ تھا۔

میں نے ایک سفارشی کے طور پر دو جہ کی ایک شاندار ادبی محفل میں یہ ایوارڈ وصول کیا اور ملک
”صیب الرحمان نے میرے لیے قطر اور جدہ کے درمیان فاصلے طے کرنے کا بندوبست کر دیا۔“

تو میں پھر مدینے میں تھا۔

سلجوق ابھی تک جدہ میں قیامت تھا۔ ہمارا منتظر تھا۔ چلکا اپنی امی کا منتظر تھا۔

جدہ ایئر پورٹ پر سلجوق کے ہمراہ رنگین آنکھوں والی اپنی بہو راہ کو کچھ کرہم دونوں کھل
اٹھے۔ وہ ہمیں گھر لے گئے۔ ششابی سے ایک عمر و کروایا اور پھر ہم مدینے کے مسافر ہو گئے۔

جس نے سفارش کی تھی اس کے شہر کے مسافر ہو گئے۔

مسجد نبویؐ کے مقفل ہو جانے کا لمحہ گیارہ بجے رات کے لگ بھگ ہوتا ہے۔

اور دس بجے رہے تھے۔

اور مسافر میں تھا۔ میوند تھی اور جو شخص ہم مسافروں کو غریب الوطن نہیں ہونے دیتا تھا اور ہمارا
”ساربان“ تھا، سلجوق تھا۔

اور ساربان اپنی سواری کو حسب معمول بھاگتا چلا جاتا تھا۔ ”ابو۔۔۔ جوئی مسجد نبویؐ کے بند

ہونے کا وقت قریب آتا ہے“ لوگ اٹھتے جاتے ہیں اسے خالی کرتے جاتے ہیں تو یہی وہ وقت ہوتا

ہے جب آپ اس میں داخل ہو جائیں تو ہر مقام ویران ہو رہا ہوتا ہے۔ ریاض الجنۃ کا سفید قالین

خالی نظر آتا ہے۔ منبر رسولؐ اور خراب رسولؐ کے پاس کم لوگ ہوتے ہیں۔ اور ابو۔۔۔ حضورؐ کی چالیوں

کے سامنے بھی۔“

”کیا ہم اس وقت تک مدینہ پہنچ جائیں گے۔“

”انشاء اللہ۔۔۔“

وائیں ہاتھ پر تاریکی میں سمجھو کہ وہ بارخ گزرتا جاتا تھا جس کے درمیان میں کوئی قدیم

رہائش گاہ تھی اور اس کی ایک کھلی کڑی میں روشنی تھی۔

اس کے کھنوں میں سے کوئی جاگ رہا تھا۔

میں نے کھلی آمدن کی جڑ صپ میں اس بارخ کو دیکھا تھا۔ مدینے کی قربت کی نشانی نہ تھی کہ تھا۔

ہم پہنچنے والے تھے۔

اور پھر سامنے روشنیاں جھلکانے لگیں ایک شہر کی، ایک مقرر شہر، نئی کاشمیر۔

رات سے مکہ کی پہاڑیوں پر دسکتے چراغ خشب میں اترتے ہیں۔

جب کہ مدینہ کی روشنیاں ایک آہستہ رودریا کی مانند ہموار سطح پر بہتی چلی جاتی ہیں۔

مدینے میں جرمی چراغ جلتا ہے، ایک مدھم بہاؤ پر تیرتا چلا جاتا ہے۔

شہر میں چہل پہل کم تھی کہ یہ حج کے موسم نہ تھے۔

اور یوں بھی رات ہو چکی تھی۔

مدینے میں داخل ہوتے ہی ہماری نظریں جس عمارت کی تلاش میں پھنکتی تھیں اس نے ایک

فلانی اور کے پار، سمجھوروں کے ایک گھنے جھنڈ سے پرے اپنے روشنی میں نہائے مینار صرف ہماری

سہولت کی خاطر دھیرے دھیرے بلند کیے۔

مسجد نبوی کی مکمل روشن تصویر ایک پکچر پوسٹ کارڈ کی طرح مدینے کے دروویار کے ماتھے پر

آویزاں تھی۔ اور پھر صرف ایک پل کے لیے مسجد کی چکا چند میں گوشہ نشین سبز پوش گنبد نمائش اور امارت

سے الگ تھلک، آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی روشنیوں سے اعلق۔ ایک خرقہ پوش بزرگ کی مانند اپنے

ہی دھیان میں گم اور اپنے رجبہ بلند پر قانع کہ اس کے تلے کل کائناتوں کا محبوب خواہید ہے۔ صرف ایک

پل کے لیے نظر آ یا گوشہ نشین سبز پوش گنبد اور پھر پوشیدہ ہو گیا، ہوٹلوں، مہمان خانوں اور پرنسپل

کے انبار کے پیچھے۔

مسجد نبوی کا محن اتنا وسیع ہے کہ بس چلتے چلتے دن سے رات ہو جاتی ہے۔ پر ابھی اتنی رات

نہیں ہوئی تھی کہ اس کے سب دروازے بند ہو جائیں۔

ہم تینوں اس محن میں ہانپتے ہوئے بھاگتے ہوئے چلتے تھے۔

باب السلام کی جانب تیز قدم اٹھاتے تھے۔

سبلوق بہت آگے تھا۔ پھر میں تھا بار بار پیچھے دیکھتا۔ اس دیکھنے میں پیچھے آنے والی میمونہ

سے التجا تھی کہ ذرا ہمت کرو۔ تم تھکی ہوئی ہو تو میں بھی تھک چکا ہوں۔ کہیں کارواں سرائے کا رکھوالا بڑا

چھانک بند نہ کر دے اور ہم بے آسرا نہ ہو جائیں۔ ہمارا بیٹا ہم سے پہلے پہنچ کر رکھوالے کی منت تو کرے

گا کہ دور کے شہروں سے آنے والے میرے عمر رسیدہ ماں باپ دو دیکھو مسجد کے محن میں پاؤں تھپتھپتے جو

سائے نظر آتے ہیں وہ چلے آتے ہیں ابھی چھانک بند نہ کرنا۔

باب السلام نظر آ یا تو کچھ عمارتیں بندھی، اس کی بلند بالا چھتیں نہ ترک کار نگہروں کی دھچکے و

دھنکی ایک گھنے جھلکی ایسی آرائش کی صورت نمایاں ہو رہی تھی اور میں ان اور ایک لائوس ترک دولی اہمال

کی انکساست سے مزین ہو گیا رہا تھا۔

پہرے دار ایک سٹول پر بیٹھا بیٹھائیاں لے رہا تھا اور مسجد کے اندرون سے باہر آنے والوں کو

دیکھتا تھا کہ کب آخری زائر باہر آئے اور وہ باب السلام متقل کر کے اپنے گھر جائے۔

مجھے تو ابھی اندر جانا تھا۔

میمونہ پچھلے برس حج سے لوٹی تو اس کی ایک شکایت میں کڑواہٹ بہت تھی۔ وہ والدہ رسولی

کی ایک بھلک بھی دیکھ نہ پائی تھی۔ باب جبریل کے گرد جھوم کرتی خواتین جو سب کی سب اندر جھانکنے

کی کوشش کرتی تھیں، شہرلوں سے ڈرتی پیچھے پیچھے بھی ہوتی تھیں اور ان کی تمنائی آنکھیں روتے روتے

کی جالی کا بس ایک ڈوہ دیکھنے کی تمنائی بھی تھیں لیکن سوائے ایک مردانہ جھوم کے انہیں کچھ دکھائی نہ دیتا

تھا۔ مونہ بھی ان میں سے ایک تھی اور اسے یہ مذہبی منطق سمجھ میں نہ آتی تھی کہ عورتوں کو یہاں

نہ دھڑکیوں بتا دیا گیا تھا۔ جب کہ اس کی بڑی بہن طاہرہ کا کہنا تھا کہ پندرہ برس پیشتر انکی اولی

پابندی نہ تھی اور خواتین بھی حاضر ہو سکتی تھیں۔ پتا چھ سبلوق اسے مسجد نبوی کی بیرونی دیوار کے سائے

سائے باب جبریل کی جانب لے کر چارہا تھا کہ شاید ادھر سے اماں کو ایک جھلک دکھائی دے جائے

باہر کھڑے ہو کر جالی کا کوئی حصہ نظر آ جائے۔

اس لیے مجھے تو ابھی اندر جانا تھا۔

باب السلام اور اس کے برابر میں باب ابو بکر صدیق میں سے اکاؤنٹ لوگ مسجد سے باہر آ

رہے تھے لیکن کوئی ایک فرد بھی اندر نہیں جا رہا تھا۔

میں تو ابھی تمنائی تھا۔

میں کچھ دیر کے لیے سٹول پر بیٹھے جھانپاں لیتے پہرے دار کو نکلتا رہا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ مجھے

روک لے گا۔ اندر نہیں جانے دے گا۔

باب ابو بکر صدیق کے اندر مسجد کا جو وسیع اور روشن پھیلاؤ نظر آ رہا تھا وہ سارے کا سارا غامی

ہو چکا تھا۔

میں کیسے بیٹوں، آیا تھی، کچھ دیر کا لہاؤہ اولاد کر نظر میں چھکانے پہرے دار سے

آنکھیں ملائے بغیر اندر داخل ہو جاؤں، سکر ۱۹۲۱ء سر لانا کہ بھائی جان آپ کی مہربانی میں تو

ابھی گیا اور ابھی آیا، کچھ گشت جھانپاں ۱۹۱۱ء لہاؤہ اولاد کے سب جھانپاں لیتا ہوا پہرے دار،

اصحاب صفہ کا تھرا اہا نہیں بھائیں کر رہا تھا۔

اور باب السلام سے شروع ہونے والی وہ راہداری جو روضہ رسولؐ کو جاتی تھی وہ بھی ویران پڑی تھی اور میں دیکھ سکتا تھا کہ اس کے آخر میں سبز گنبد تلے جو سنہری چالیاں ہیں ان کی قربت میں بھی گئے چنے لوگ ہیں۔

پہلے تو یہی خیال آیا کہ گدا گرا اگر اندھا ہے تو بھی سب سے پہلے ان چالیوں کو چھو کر انہیں بریل کی عبارت کی مانند چھو کر ٹٹول کر کچھ "پڑھ" لے۔ اُمی نہ رہے۔ پھر لالچ غالب آ گیا۔

میں ایک ایسا بچہ تھا جو من پسند کھلونوں کی دکان میں تنہا کھڑا تھا۔ جن کھلونوں کو وہ زندگی بھر ترسنا تھا۔ جو وہ خرید نہ سکتا تھا۔ انہیں حاصل کرنے کے خواب دیکھتا تھا وہ سب کے سب اس کے آس پاس تھے۔ کوئی روکنے والا نہ تھا۔ جو جی چاہے اٹھا لو۔ اگرچہ جھولی مختصر ہے اور کھلونے بہت۔

مسجد خالی کرنے کا اعلان درحقیقت سے نہیں نرمابٹ کے لہجے میں مسلسل ہو رہا تھا۔ مہربان نگہبان بھی عبادت گزاروں کو مسکراتے ہوئے تکتے تھے اور باہر جانے کے اشارے کرتے تھے۔

چنانچہ میں تنہا ہوا ریاض الجنۃ کے جنت کے ٹکڑے میں۔ کہ صرف یہ حصہ ہوگا کائناتوں کا جو روزِ حشر تباہ نہیں ہوگا جوں کا توں جنت کو اٹھایا جائے گا۔

میں نے ہرستون سے تنہائی میں مخاطب ہو کر نقل ادا کیے۔

منبر رسولؐ کے سامنے کھڑا ہوا تو بابا کو بھی حیرت ہوئی کہ آج بس یہی ہے لمبی سے بھری سرخ آنکھوں والا۔ میری باتیں سننے والا۔ یہ تو وہی ہے جو صفہ کے تھڑے پر بھوکا پیاسا بیٹھا تھا اور میں اسے اپنے حجرے میں لے گیا تھا۔ دودھ کا ایک پیالہ پلانے کے لیے۔ چند کھجوریں کھلانے کے لیے۔

محراب رسولؐ میں بھی ان کو خبر ہوگئی ہوگی کہ میرے قدموں میں سجدے کرنے والا ابھی وہی تنہا مخلص ہے۔

البتہ میں اصحاب صفہ کے تھڑے تک نہ گیا کہ میں وہاں تو بیٹھتا ہی رہتا تھا۔

اس زندگی میں۔ اور اس زندگی میں بھی۔

نگہبانوں کی مہربانی میں کی آنے لگی۔

میرے علاوہ چند ایک اور اوصاف بھی تھے جو اٹھائے نہ لیتے تھے۔

اور جب مجھے غصہ ہوا کہ کئی باب چرل بند نہ ہو جائے۔ اور مجھے بابا کو سلام کیے بغیر واپس

میرے پیچھے بھاگنے سے تو رہا۔ اتنی دیر میں اس نے مجھے دیکھ لیا۔ کہ میں صحن کی وسعت میں باب السلام کے باہر کھڑا تنہا شخص تھا۔

اب تو تو بالکل نہیں جانے دے گا۔

لیکن یہاں کھڑے رہنے میں بھی کچھ بھلائی نہ تھی۔ اگر میں تا دیر یونہی بت بنا کھڑا رہتا ہوں تو پہرے دار کے ذہن میں شکوک ابھریں گے اس لیے میں نے ہمت کی اور اس کی جانب چلنا شروع کر دیا۔ اس بھلے مانس نے مجھے ایک نظر دیکھا اور کچھ نہ کہا۔ اور یقین مانے میں نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو اس سے اجازت لینے سے روکا۔

شاید مجھے۔ اگر میں کر سکا تو۔ پل صراط عبور کرنے پر بھی اتنی خوشی نہ ہوگی۔ جتنی مجھے اس لمحے ہوئی جب میں باب السلام میں سے گزر کر مسجد کے اندر داخل ہو گیا۔

اور اسی لمحے مسجد جو پرانے زمانوں کے کل مدینے پر محیط ہو چکی ہے اس کے دروہام میں۔ اس کی تقریباً خالی ہو چکی وسعت میں اور محرابوں اور قالیوں اور قالیوں میں ایک درخواست گونجنے لگی کہ مسجد بند ہونے کو ہے۔ براہ کرم باہر چلے جائیں۔

لوگ باہر جانے لگے اور میں اندر جانے لگا۔

پوری مسجد خالی پڑی تھی۔ جہاں تک نظر جاتی تھی محرابوں اور قالیوں اور قالیوں کے سوا اور

کچھ نہ تھا۔

اگر کچھ لوگ تھے تو ریاض الجنۃ کے آس پاس۔ منبر رسولؐ اور محراب رسولؐ کی قربت میں۔ بشکل تیس چالیس۔ عبادت میں لگن۔

مسجد کو خالی کر دینے کا اعلان دہرایا جا رہا تھا۔

مجھے اپنی نظروں پہ یقین نہ آیا۔ ریاض الجنۃ کا وہ سفید قالیں جو ہزاروں لوگوں سے یوں ڈھکا ہوتا تھا کہ اس پر ایک جیس رکھنے کی بھی گنجائش نہ ہوتی تھی۔ خالی پڑا تھا۔ جیسے ابھی ابھی میرے لیے

ہی بچھایا گیا ہو۔

چند لوگوں کے سوا منبر رسولؐ کے آس پاس بھی کوئی نہ تھا۔

محراب رسولؐ تو گویا سائے میں آگئی ہوئی ایک تنہا تصویر تھی۔

حجرۂ رسولؐ کی دھج اور میرے درمیان کوئی ایک فرد نہ تھا۔

جتنے بھی بلند مرتبت ستون تھے۔ سب کے سب تھکے ہوئے آرام کرتے تھے کہ آج اتنے

ہزاروں لوگوں نے ان کی قربت میں نقل ادا کیے تھے ان سے لپٹ کر روئے تھے۔

اور جب میں بابا کے دربار میں ان کے سامنے تہا کھڑا تھا۔ رو بہ رو تھا۔
 چہرہ بہ چہرہ تھا تو میں نے کیا کیا؟
 نہ کچھ طلب کیا۔ نہ کوئی دعا مانگی۔ نہ کسی تمنا کا اظہار کیا۔ اور نہ ہی آنکھوں سے کوئی آنسو
 بہا۔ میں اس مختصر ساعت میں اس ایک لمحے میں بس مسکراتا رہا۔
 جمال یار کی روشنی میں یار کو دیکھ دیکھ کر مسکراتا رہا۔
 جیسے ایک اندھے گداگر کے کشکول میں ایک غیر متوقع سنہری سکہ گرے تو وہ اپنی ناپیدائی میں
 بھی مسکراتا جاتا ہے۔

باب السلام سے باہر نہ جانا پڑ جائے۔ اور یہ امکان موجود تھا کیونکہ بیشتر لوگ اسی پھاٹک سے نکل رہے
 تھے۔
 تب میں ایک ہی جیسے ہو گئے ایک دوسرے کے ہم شکل ہو گئے لوگوں کے جھوم میں ہولے
 ہولے سرکتا تھا۔ اور اب میں رات کو اس سے اس خالی راہداری میں تیز چلتا۔ ذرا تیز تیز چلتا جا رہا تھا۔
 روشن جمال یار سے ہے انجمن تمام۔
 میں آج۔ تنہا انجمن تھا۔ اس لیے جمال یار کی جتنی روشنی تھی اس میں کوئی اور میرا حصہ دار نہ
 تھا۔

میں نے دیکھا کہ باب جبریل کا ایک پٹ بند ہو چکا ہے اور دوسرے کوڑ کو ایک مضطرب
 پہریدار تھامے ہوئے ہے۔
 دو چار لوگ تھے جالیوں کے سامنے کھڑے ہوئے۔ لرزش میں آئے ہوئے چند ہونٹ
 تھے۔ نیم آلود کچھ آنکھیں تھیں۔
 کتھے مہر علی کتھے تیری ثناء۔

پہریداران چند لوگوں سے باری باری اب ذرا سختی سے چلے جانے کو کہہ رہے تھے۔
 میں اُس سنہری بوند کے اندر کبھی چھب دکھلاتے کبھی اوجھل ہو جاتے اس پیرا ہن کو تنگے جا رہا
 تھا جو جسم یار کی خوبی سے رنگینیوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ جس کی ڈاچی چھن چھن کرتی میرے بدن کی گلیوں
 میں سے گزرتی جاتی تھی۔ میں اس لمحے سنہری جالی کو ذرا نظر بچا کے چھو بھی سکتا تھا۔ لیکن مجھ میں سکت نہ
 تھی۔

پہریدار اب سرزنش کر رہے تھے۔ وہ مزید مہربان نہ ہو سکتے تھے۔
 جو گئے چنے لوگ ابھی تک جھجک رہے تھے وہ مجبور ہو کر باب جبریل سے نکلنے لگے۔
 اور تب۔

اور تب ایک لمحہ۔ ایک نہایت شاید پلک جھپکنے جتنی ساعت ایسی آئی کہ میں۔
 بابا کے سامنے تہا کھڑا تھا۔

اس پاس کوئی ایک بشر نہ تھا۔
 سوائے پہریداروں کے۔
 ان میں سے ایک نے مجھے سرزنش کی نگاہ سے دیکھا تو میں نے شہادت کی انگلی اٹھا کر
 مسکراتے ہوئے ایک لمحے کی اجازت چاہی۔

یہ ایک خوشگوار اتفاق تھا کہ جن دنوں ہم نے مدینے آنا تھا انہی دنوں سلجوق کا سرکاری دورہ بھی تھا۔

”سلجوق..“ میں نے اسے جگانے کی کوشش کی ”بیٹے اٹھو.. نیچے لوگ تمہارے منتظر ہیں..“ وہ نیند میں ہی بڑبڑایا.. ”ابو.. میں نے ابھی نہیں جانا..“

یہ بچہ تو فارن سروس میں جا کر بھی نہیں بدلتا تھا وہی تھا جسے میں ہر صبح جگانے کی کوشش کرتا تھا کہ بیٹا اٹھو سکول کا وقت ہو گیا ہے اور وہ کروٹ بدل کر منہ بسورتے ہوئے کہتا تھا.. ”ابو.. میں نے سکول نہیں جانا..“

جانے کیوں وہ ایک خاص عمر تک سکول جانے سے بے حد خوفزدہ رہا..

جب وہ نرسری میں تھا تو پورے لکشمی مینشن میں اس کی ”ابو میں نے ٹول نہیں جانا“ کی آہ و زاری کینوں کو آبدیدہ کر دیا کرتی تھی.. نرسری کلاس کی استانیات شاید سخت گیر تھیں کہ ہر صبح جب بابا نذر گلی میں اس کا بستہ اپنے گلے میں ڈالتا اور اسے سائیکل پر اپنے آگے بٹھاتا تو وہ اوپر تین منزل اوپر دیکھ رہا ہوتا اور میں وہاں سے نیچے دیکھ رہا ہوتا اور جونہی اس کی نظر مجھ پر پڑتی تو ایسی دلدوز آواز میں ”ابو میں نے ٹول نہیں جانا“ کا اشک آور لاپ شروع کر دیتا.. اکثر میں اپنے دل پر پتھر رکھ کر پیچھے ہو جاتا تاکہ وہ مجھے دیکھ نہ سکے اور کبھی کبھار بھیگتی آنکھوں سے بابا نذر کو کہتا.. بابا اسے سکول نہ لے جاؤ.. بلکہ لکشمی مینشن کے ہمسائے بھی سفارش کرتے کہ بچہ رو رو کر ہچکیاں بھرتے ہلکان ہو رہا ہے کہ میں نے ٹول نہیں جانا تو آج نہ بھیجیں ٹول..

اور وہی بچہ.. اگرچہ ڈپلومیٹ ہو چکا تھا لیکن اب بھی وہی تھا.. کہ ابو.. میں نے ابھی نہیں جانا.. پھر پہلی منزل پر لگائے ہوئے اس کے کیمپ آفس سے اس کے ماتحت افسرانوں کے انہار لے کر آنے لگے تو وہ مجبوراً اٹھ کھڑا ہوا اور اٹھتے ہی ایک خرگوش کی طرح چوکنٹا اور ہوشیار ہوا لکھوں میں تیار ہو کر نیچے اپنے آفس میں جا براجمان ہوا.. چونکہ اس نے پورا دن وہاں براجمانی کرنی تھی اس لیے مدینے کی سیر میں وہ ہمارا ساتھ دینے سے قاصر تھا..

ہم تیار ہو کر نیچے گئے تو نیچے گڈ اولڈ مولا بخش ہمارا منتظر تھا.. اپنی گھنی مولا بخشی مونچھوں کے ساتھ مسکراتا.. سائیں سائیں کرتا..

”آؤ سائیں مدینے چلیں..“ شاید اس کے ہاں ایک اور بچہ تولد ہوا تھا کہ وہ اتنا ہی خوش نظر آتا تھا جتنا جج کے زمانوں میں تھا.. ”سلجوق صاحب نے کہا ہے کہ مولا بخش میرے ابا جی مدینے میں لو آپ کمالے نہیں آئے.. ان بچوں کی تلاش میں آئے ہیں جہاں ہمارے تمہارے حضور کے نقش قدم

”اماں ماریہ قبضہ کے گھر.. جہاں وہ بال سنواری تھیں

بابا کے ہم شکل حضرت ابراہیم کو کھلاتی تھیں“

میں پھر مدینے میں تھا..

اور پھر ”پاکستان ہاؤس“ میں ہی قیام کرتا تھا..

لیکن ہمارے کمرے کی بالکونی سے مسجد نبوی کا مینار طلوع ہوتا دکھائی نہ دیتا تھا کہ ہم ”پاکستان ہاؤس نمبر 2“ میں مقیم تھے..

میں جب بھی اس ایک لمحے کا خیال کرتا جب میں روضہ رسول کے سامنے تنہا کھڑا تھا تو میں اسی طور مسکرانے لگتا.. جیسے پچھلی شب بابا کے سامنے اکیلا کھڑا مسکراتا تھا..

تھکن تو بہت تھی لیکن اتنی بھی نہ تھی کہ ہم مسجد نبوی میں فجر ادا کرنے سے غفلت برت جاتے.. مدینے کی سویر کی ٹھنڈک اپنے بدنوں میں نہا تارتے..

واپس آئے تو پھر بستر پر ڈھیر ہو گئے..

میں سو تو نہ رکابس اوگھتا رہا.. کھڑکیوں میں سے دھوپ آنے لگی.. میں نے ایک کھڑکی میں سے نیچے جھانکا تو گلی میں متعدد لوگوں کو منتظر حالت میں پایا.. اپنے پاسپورٹ.. فائلیں.. کاغذات سینے سے لگائے منتظر دیکھا.. کچھ ”پاکستان ہاؤس“ کی سیڑھیوں پر براجمان تھے اور بیشتر گلی میں ٹہل رہے تھے.. وہ اپنے نائب قنصل کے منتظر تھے جس نے ان کی شکایات کا مداوا کرنا تھا.. ان کے پاسپورٹ.. اقامے یعنی رہائش کے قانونی کاغذ اور دیگر سرٹیفکیٹ چیک کر کے منظوری یا نا منظوری کی سرکاری مہر لگانی تھی.. ان میں سے کچھ ایسے تھے جن کے عزیز جیلوں میں تھے اور وہ ان کی رہائی کے لیے نائب قنصل کی مدد چاہتے تھے..

اور نائب قنصل صاحب ابھی تک نیند میں بے سدھ پڑے تھے..

ہیں تو سائیں آج اپنے ساتھ ایک فقیر کو لیتے ہیں۔“
”کونسا فقیر؟“

”ہے ایک محمد فقیر۔ تو نصیحت کی جانب سے اسے ہزار دو ہزار ریال ماہانہ صرف اس لیے ملتے ہیں کہ وہ یہاں آنے والے صاحب لوگوں کو مدینے کی زیارات کا چکر لگوائے۔ اتنا فقیر نہیں ہے۔“
مولا بخش کے لہجے سے عیاں تھا کہ وہ اس فقیر کے لیے دل میں اگر کوئی گوشہ رکھتا ہے تو وہ اتنا نرم نہیں ہے۔

”میں نے اسے فون پر بتا دیا تھا کہ نائب تو فصل صاحب کے اماں اور ابا آئے ہیں تو اس نے بولا کہ ابھی آدھے گھنٹے بعد آئیں تیار ہو جاؤں۔“

چنانچہ اس فقیر کو تیاری کی مہلت دینے کے لیے ہم ادھر ادھر بے مقصد گھومتے رہے اور پھر ایک شاہراہ پر گاڑن ہوئے۔ اس شاہراہ کو چھوڑا تو ایک بستی میں آ گئے۔

اور پھر اس غریبانہ سی بستی کہ فقیر ایسی ہی بستیوں میں بھلے لگتے ہیں ہم ایک گلی کے باہر جا کر۔ مکان اندرون لاہور کی مانند قدیم تو نہیں لیکن آپس میں جڑے ہوئے۔ بدتمیز سے مدنی بچے ہماری کار کے گرد منڈلانے لگے اور چند مرغیاں جو بے دھیانی میں کٹ کٹ کرتی پھرتی تھیں ہماری طرف متوجہ ہو گئیں۔

کچھ دیر انتظار کیا۔ بہت سا صبر کیا کہ مدینے میں صرف ایک دن ہو اور بابا کے راستوں کی دھول سانسوں میں اتارنے کی چاہت ہو تو صبر ہوتا نہیں۔

بالآخر بابا فقیر محمد گلی میں سے برآمد ہوئے۔ اور نہایت پاکیزہ اگرچہ رعب والے گیٹ اپ میں برآمد ہوئے۔ خاصے عمر رسیدہ فقیر تھے۔ سر پر ایک سفید براق پگڑی نہایت پیچیدگی سے بندھی ہوئی۔ کرتہ اور سفید کھڑکھڑاتا تہبند۔ پاؤں میں ملتان کی کھتہ اور ہاتھ میں ایک عصا۔ ٹپکتے ہوئے آئے۔

میں نے نہایت احترام سے انہیں اگلی نشست پر بٹھایا اور بصدادب کار کا دروازہ بند کیا۔ پہلی بار بند کیا تو ان کے لہراتے تہبند کا ایک پلو باہر رہ گیا۔ ان کے سینے پر دوبارہ بند کیا اور پچھلی نشست پر میمونہ کے پہلو میں آ بیٹھا۔

میں نے دیکھا کہ مولا بخش نے میرے اس احترام اور ادب کو تحسین سے نہ دیکھا۔

ہم اس غریبانہ بستی سے باہر آ گئے۔

فقیر بابا کے واقعات سنیں۔

اگر تھے تو نہ کہانی دیتے تھے نہ سنائی دیتے تھے۔

انہوں نے قوری طور پر ایک تعارفی لیکچر کا آغاز کر دیا کہ وہ کیسے پچھلے چالیس برسوں سے کن کن وی آئی ہیز کی۔ کیسے کیسے وڈرائے اعظم اور صدور کی میزبانی کر چکے تھے اور انہیں کیسے کیسے تحائف سے نوازا گیا تھا اور اب اگر ان پر یہ بُرا دن آ گیا تھا کہ ایک نہایت جوئیر ڈپلومیٹ کے والدین کو انہیں مدینہ دکھانا پڑ گیا تھا تو یہ ان کے لیے کچھ ذریعہ عزت نہیں تھا۔

ان کی مسلسل باتیں مکمل طور پر ہمارے پلے نہیں پڑ رہی تھیں۔

وہ ایک پو پلے انداز میں۔ ملتان لہجے میں کہ وہ ملتان کے ہاسی تھے بولتے چلے جاتے تھے اور تاریخ اسلام کے عمومی واقعات نہایت رقت سے بیان کرتے چلے جاتے تھے۔ بالآخر میں ان کے احترام کی مناسب حدوں کو پار کر گیا اور پار جا کر میں نے گزارش کی ”بابا فقیر۔ یہ میں سب جانتا ہوں۔ کچھ شدہ بدھ رکھتا ہوں۔ آپ براہ کرم ہمیں ان مقامات تک لے جائیے جہاں حضور کے حوالے روشن ہیں۔“

اس پر بابا فقیر نے بے حد بُرا مانا ”میں آپ کو وہی تو بتا رہا ہوں۔ صبر کیوں نہیں کرتے۔“

صد شکر کہ انہوں نے میمونہ کو نہیں پہچانا تھا۔

”خج کے بعد جب سلجوق مجھے مدینے لے کر آیا تھا تو۔ یہی بابا فقیر تھا۔“ میمونہ نے نہایت دھیمی آواز میں مجھے مطلع کیا اگرچہ اسے اس احتیاط کی چنداں حاجت نہ تھی کہ فقیر بابا سننے والے تو تھے نہیں۔ بولنے والے تھے۔ لیکن تب ان کے دو چار دانت سلامت تھے اور جو کچھ کہتے تھے کچھ نہ کچھ پلے پڑ جاتا تھا۔ اب پتہ نہیں کیا کہ چلے جا رہے ہیں۔“

دیئے فقیر بابا تاریخ جانتے تھے۔ اور جہاں کہیں کوئی فقرہ پلے پڑ جاتا تھا اس میں مدینے کی تاریخ اور صحابہ کرام کے شب و روز سے شناسائی جھلک جاتی تھی۔

ان دنوں جب میں نمبر کے ہمراہ ادھر آیا تھا تو فروری کے موسم تھے اور مدینے کے موسم بھی کیا موسم تھے۔ لیکن اب اکتوبر کے اوائل میں بھی دھوپ کی تیزی گھائل کر دینے والی تھی۔

ایک جدہ شائل۔ فیشن گھروں۔ شاپنگ مالز اور غیر ملکی ریسٹورانوں سے بھری پُری سڑک پر سے گزرے تو مولا بخش نے فقیر بابا کے مسلسل لیکچر میں دخل انداز ہو کر کہا ”صاحب یہ ادھر مدینے کی انارکلی ہے۔ مدینے کے لوگ ادھر سیر کرتے ہیں۔ شاپنگ کرتے ہیں ان کی خواتین یورپ کے لباس خریدتی ہیں۔ کھاتے پیتے ہیں اور بہت مونج کرتے ہیں۔“

ہمارے نادان اور عقیدے سے اندھے ذہنوں میں تو یہی تصویر ابھرتی تھی کہ اہل مدینہ ہمد وقت تسبیح و تلاوت میں مگن درود پڑھتے۔ مسجد نبوی کے پیرے لگاتے۔ مقامات مقدسہ کے طواف کرتے

بندوبست کر دکھا تھا۔ کیوں؟ شاید اس لیے کہ وہ ایک کثیر فیض سیاح نام تھیں۔ انھیں حضور کے نزدیک نہیں کہ وہ تو رنگ و نسل کے امتیاز کو مٹانے والے تھے۔ شاید گھریلو رکائیاں تھیں۔ لیکن انہی مارے پہلیہ کو ایک ایسا شرف حاصل ہوا کہ وہ سب میں ممتاز ہو گئیں کہ حضرت خدیجہ الکبریٰ کے بعد صرف انہوں نے حضور کی گود ایک بیٹے حضرت ابراہیم سے بھری۔

روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے اپنی خادمہ سے کہا کہ ”چل مجھے وہ عورت لودکھا جسے رسول اللہؐ نے پسند کیا ہے۔“ کہتے ہیں اس لیے حضرت ماریہ قہلیہ اپنے گھنے اور سیاہ بالوں میں کنگھی کر رہی تھیں تو حضرت عائشہ صدیقہؓ نے انہیں دیکھ کر کہا: ”ہاں یہ ایسی ہے کہ اسے پسند کیا جاسکے۔“

ہم شاہراہ سے ہٹ کر ایک ویران سے علاقے میں گئے۔ ایک چوڑی اور دھول آلود گلی تھی۔ مولابخش نے فقیر بابا کا اشارہ پا کر کار روک دی۔

یہاں تو کوئی مکان نہ تھا۔ کوئی کھنڈر کوئی نشان نہ تھا۔ ہم ایک دیوار کے سائے میں کھڑے تھے۔ جو ایک چار دیواری کا حصہ معلوم پڑتی تھی۔

”یہی وہ مقام ہے۔“ فقیر بابا نے پوپلاہٹ میں لفظ گھولتے ہوئے بتایا۔

”یہاں تو بس یہ دیوار ہے۔“ دھوپ تیز تھی۔

”تو وہ مقام اس دیوار کے اندر ہے نا۔“ بابا فقیر جھنجھلا گئے۔ ”اب یہاں ایک قبرستان ہے چار دیواری کے اندر۔ مکان تو نہیں ہے نا لیکن مقام یہی ہے۔“

”ہم قبرستان کے اندر جاسکتے ہیں؟“

”اجازت نہیں۔“

”کہیں سے اندر جھانک بھی نہیں سکتے؟“

”نہیں۔“

میں بھی جھنجھلا گیا کہ عجیب فقیر ہے نہ اندر جاسکتے ہیں نہ جھانک سکتے ہیں تو یہاں آنے سے فائدہ۔ پھر جنت البقیع کے بارے میں جو قیاس میں نے کیا تھا اسی نے ہاتھ تھما۔ کہ بے شک نشانہ ہی نہیں ہو سکتی۔ تعین نہیں کیا جاسکتا لیکن کیا یہ احساس کافی نہیں ہے کہ وہ مکان نہیں کہیں ہوا تو کرتا تھا۔

دیکھ تو نہیں سکتے تھے اس مقام کو لیکن اس کی قربت میں چشم تصور کو یہ تو کہہ سکتے تھے کہ اگر اس منظر کو حقیقت کر دے جب یہاں کوئی مجروح ہو کر آتا تھا۔ شاید کئی اٹھوں کا۔ ہو سکتا ہے مدینے کے آتش افشانی مجروحوں کا۔ جس پر مجبور کے تلوں کی چھت تھی اور گن میں حضرت ماریہ قہلیہ اپنے سیاہ بال سنوارتی تھیں

زندگی کرتے ہوں گے تو یہ سن کر قدرے حیرت ہوئی کہ مدنی بھی شاپنگ مالز میں گھومتے ہیں ریسٹورانوں میں ڈائن آؤٹ کرتے ہیں اور ان کی خواتین بھی فرانسسی زیر جامہ شوق سے خریدتی اور پہنتی ہیں۔ حیرت بھی ہوئی اور ایک دھچکا بھی لگا۔

مولابخش ایک ذریعہ شخص تھا۔

بابا فقیر کو موصول کرنے سے پیشتر جب ہم بے مقصد گھومتے تھے اور میں نے سرسری طور پر شکایت کی تھی یہاں ان تمام آثار کو مٹایا جا رہا ہے جو ہماری تاریخ کی گواہی دیتے ہیں اور کسی کو کچھ پروا نہیں تو۔

اس نے ایک نہایت پتے کی بات کی۔ کہنے لگا ”صاحب ان لوگوں کے پیٹ بھرے ہوئے ہیں بھوکے تو ہم ہیں۔ ہم پیاسے ہیں ناں اس لیے ان مقامات کے مٹنے کا ہمیں دکھ ہوتا ہے۔“

مولابخش کی بات میں وزن تھا۔ مجھے خیال یہ آیا کہ اگر میں مدینے کا باسی ہوتا۔ سعودی سلطنت کا ایک شہری ہوتا تو کیا میرا پیٹ بھی بھرا ہوا ہوتا۔ مجھے کچھ پروا نہ ہوتی کہ قدیم نشانیاں مٹائی جا رہی ہیں۔ حوالے نابود ہو رہے ہیں۔ میں بے اثر رہتا۔ اس کا جواب شدید نفی میں تھا۔ نسبت روڈ کے چوک میں ایک بہت قدیم اور گھنا بھر گدھا جس کے تلے گھوڑوں کے پانی پینے کے لیے ایک پتھر ملی ناند تھی۔ مسافر شدید گرمیوں میں اس برگد کے سائے میں آرام کرتے۔ پھر وہ برگد ترقی اور وسعت کی راہ میں رکاوٹ ہوا تو اسے کاٹ دیا گیا۔ بہت برس ہو گئے ہیں اسے معدوم ہوئے لیکن مجھے آج بھی اس کا خیال آتا ہے تو میں مغموم ہو جاتا ہوں۔ اس چوک سے گزرتا ہوں تو ہر بار رنج سے دوچار ہوتا ہوں۔ اگرچہ میں لاہور کا باسی تھا میرا پیٹ بھرا ہوا تھا۔ وہ تو ایک معمولی سا برگد تھا۔ تو اس کی نشانیاں جس کی گھنی چھاؤں عمر بھر سایہ کرتی ہے تو اس برگد کے حوالے معدوم ہوتے جاتے تو میرا دل ضرور کٹنا چاہے میں مدینے کا رہنے والا ہوتا۔

بابا فقیر نے مجھے صبر کی تلقین کی تھی چنانچہ جب بہت صبر ہو چکا تو میں پھر بے صبر ہوا اور ان سے گزارش کی کہ بابا۔ کچھ تو بتاؤ کہ ہم جا کہاں رہے ہیں۔ کون سے مقام کی زیارت پہلے کریں گے تو بابا نے اپنے لیکچر میں وقفہ ڈال کر قدرے ناراضی سے کہا ”بابا ہم پہلے امت المومنین حضرت ماریہ

”سبحان اللہ۔“ میں نے بے اختیار کہا کہ یہ ماں میری بہت ہی پسندیدہ تھیں۔

امہات المومنین میں سے صرف حضرت ماریہ قہلیہ تھیں جو مسجد نبویؐ سے ملحقہ حجروں میں حضورؐ کی دوسری بیویوں کے ہمراہ نہ رہتی تھیں۔ حضورؐ نے ان کے لیے مدینہ میں ایک الگ مکان کا

اور یہیں کہیں حضرت عائشہ صدیقہؓ انہیں رشک سے دیکھتی تھیں۔ اور یہیں حضورؐ تشریف لایا کرتے تھے۔ اس نظر نہ آنے والے قبرستان کے اندر۔ اس کے کسی حصے میں جو اب قبروں سے ڈھکا ہوا ہے۔ وہ دیار تھا جہاں حضورؐ نے اپنے آخری بیٹے حضرت ابراہیمؑ کی ولادت پر انہیں گود میں لے کر چوما ہوگا کہ وہ آخری عمر کی اولاد تھے اور حضورؐ کو اولاد زینہ کی بے حد چاہت تھی۔

روایت ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اپنے باپ کی شکل کے تھے اور اگر وہ زندہ رہتے تو حضورؐ کی عمر کو پہنچ کر حضورؐ جیسے ہی ہو جاتے۔ ایسے کہ جن صحابہ کرامؓ نے طویل عمریں پائیں وہ انہیں دیکھتے تو دھوکا کھا جاتے۔ ان کی شکل اتنی مشابہ تھی۔

میں پہلے بھی ابن ہشام کا حوالہ دے چکا ہوں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا:

”مدرہ کے کالے کلوٹے گھونگھریا لے پال والے ذمیوں (حبشیوں) کے بارے میں اللہ سے ڈرو کیونکہ ان سے میرا نسب کا رشتہ بھی ہے اور سہ حیان بھی۔“

یعنی نسب اس طرح کہ حضرت ہاجرہ انہی حبشیوں کے خاندان سے تھیں اور بقول ہشام ابراہیمؑ کی والدہ ماریہ رسول اللہؐ کی کنیز تھیں جنہیں مقوقس نے آپ کے لیے ضلع انصبا کے مقام حفن سے بہ طور ہدیہ بھیجا تھا۔

اسی طور ابن اسحاق نے محمد بن مسلم کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہؐ نے فرمایا۔۔

”جب تم مصر فتح کرو تو اس کے رہنے والوں سے نیکی کا برتاؤ کرنے

کی وصیت یاد رکھنا کیونکہ ان کے متعلق ایک قسم کی ذمہ داری ہے اور ان سے

قربت ہے۔“

کوئی قربت؟۔ اماں ہاجرہ کی اور حضرت ماریہ قبطیہ کی بھی۔ ایک پورے ملک سے نیکی کا برتاؤ کرنے کی وصیت ہمارے حضورؐ کرتے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ کی والدہ کے ناتے سے۔ تو کیا وہ سب

ہم یونہی بے مقصد۔ میں اور میمونہ قبرستان کی دیوار کو تکتے تھے۔

اس کا پس کوئی آبادی نہ تھی نور نہ ہی کسی نفس کا وہاں سے گزر ہوا۔ اگر کچھ دکھائی دے جائے۔ کوئی نشانی نظر آجائے تو انسان وہاں کھڑا ہو کر کچھ دیر اسے نظر میں اتارتا ہے اور چلا جاتا ہے۔ اور

جہاں کچھ بھی نہ ہو۔ صرف ایک دیوار ہو اور دھوپ وہاں پہنچنے کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ابھی ظہر میں یا چلے جائیں۔

جہاں ہماری کارساخت تھی اور مولائش دھوپ میں جلتا تھا اس کے برابر میں ایک نیلہ تھا۔ قدرتی نہ تھا کسی عمارت کے بلے سے وجود میں آیا تھا اور اس کے اوپر میں نے چند ایرانی ڈائریں کو دھوپ میں نمایاں ہوتے دیکھا۔ سیاہ پوش عورتیں۔ بڑھی ہوئی داڑھیوں والے درمیانی قامتوں کے ذرا لمبے کچھ مرد۔ جنہیں اس بلند سطح سے چار دیواری کے اندر جو قبرستان تھا وہ دکھائی دیتا تھا اور وہ اس کی جانب ہاتھ بلند کرتے کچھ پڑھتے تھے اور آہ وزاری کرتے تھے۔

جج کے تجربے نے مجھے نبھایا تھا کہ اگر کہیں۔ کسی مقام پر۔ کسی غیر معروف جگہ پر ایرانی ڈائریں جمع ہیں تو وہ وہاں بے وجہ نہیں ہیں۔ وہاں کچھ نہ کچھ ہوتا ہے۔ کبھی تاریخ ہوتی ہے اور کبھی صرف عقیدت۔

میں اور میمونہ ذرا احتیاط کرتے سمجھتے اس نیلے پر چڑھ گئے۔

ایک ایرانی نیلے پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا اور نہ اسے دھوپ کی شدت ستاتی تھی اور نہ تن بدن سے نچرنا پسینہ اور وہ قبرستان کی جانب ہاتھ اٹھا کر کبھی کچھ پڑھتا تھا اور کبھی تقریری کرنے لگتا تھا۔ یہاں سے۔ ہم چار دیواری سے بلند ہو کر قبرستان کو اپنی نظروں کے سامنے پاتے تھے۔ وہی ادھر ادھر بکھرے چند پتھر۔ کچھ مسافر شدہ قبروں کے آثار اور دھوپ۔

جیسے کبھی شمال میں کسی کوہ نوردی کے دوران کوئی ہموار علاقہ سامنے آ جاتا ہے۔ کہیں ہمارا پاں خود زواور کہیں کہیں پتھر ابھرے ہوئے۔

مرد آ نسو پونچھتے تھے اور خواتین روئے چلی جا رہی تھیں۔

دھوپ میں۔ ایک نیلے پر۔ مدینے میں۔ ایک گننام شہر ٹموشاں کے سامنے ایک نیلے پر سیاہ پال ٹموشاں ماتم میں مصروف تھیں۔ وہ سر جھکائے بیٹھی تھیں اور اس شخص کی تقریر سننے لگی جو قبرستان کی جانب اشارہ کرتے کچھ بیان کرتا تھا۔ بالآخر اس شخص نے۔ بڑھی ہوئی داڑھی والے درمیانی عمر کے ایرانی نے چند دعائیں کر کے اختتام کیا تو میں نے۔ اگرچہ وہ ہم دونوں کی موجودگی سے آگاہ ہو چکا تھا اور تقریر کے دوران کن اکیوں سے ہمیں دیکھتا تھا کہ یہ کون ہیں جو یہاں تک آ گئے ہیں۔ تو میں نے اردو اور فارسی کے چند لفظ جوڑ کر اس سے پوچھا کہ برادر اس مقام کی کیا اہمیت ہے جو آپ یہاں ماتم کرتے ہیں۔

غوش قسمتی سے وہ میرا پہلے جو لفظ کہہ گیا اور کہنے لگا ”مادر امام رضا۔“

میں نے اسے حکایت لکھنے کو اس لیے مناسب جانا ہے کہ میرے سرسری تاریخی مطالعے کے مطابق حضرت امام حسینؑ اور حضرت ابراہیمؑ ہم عمر نہ تھے۔ بہت فرق تھا۔ لیکن عقیدت اکثر تاریخ اور حقیقت سے ماورا ہوتی ہے۔ البتہ یہ بہر حال ایک حقیقت تھی کہ وہ دونوں زیادہ دیر نہ رہے۔ ایک نے ایک برس اور چند ماہ کی عمر پائی اور حضورؐ نے اپنے ہاتھوں سے اسے دفن کیا۔ اور دوسرے کی لاش بے گور و کفن رہی۔

”کہاں۔“

”اُس نے قبرستان کی جانب اشارہ کیا کہ ”وہاں“ اور آنسو پونچھنے لگا۔

مشہد کے امام رضا کے مرقد پر بہت برس پہلے میں نے بھی حاضری دی تھی۔ جنہیں ایک روایت کے مطابق طوس کے دہقانوں نے شہید کیا تھا اور ایک اور روایت یوں ہے کہ انہیں اپنا ولی عہد مقرر کرنے کے باوجود مامون الرشید نے انگوروں میں زہر بھر کر ہلاک کرایا تھا۔ کہاں جا رہے ہو؟ مامون نے پوچھا تھا۔ جب امام زہر آلود انگور کے خوشے کھا کر جانے لگے۔

جہاں تم مجھے بھیجنا چاہتے ہو۔ وہاں۔ امام نے جواب دیا۔

ان روایتوں کی تصدیق یا تردید میرے بس میں نہیں کہ یہ عقیدے کا معاملہ ہے۔ میرے لیے یہ ایک خبر تھی کہ امام رضا کی والدہ یہاں مدینے میں اس قبرستان میں دفن ہیں۔ میں نے اُس ایرانی کو اشاروں کنایوں اور بھولی بھری۔ ماسٹر دین محمد کی پڑھائی ہوئی فارسی میں بتایا کہ میری معلومات... بلکہ بابا فقیر کی معلومات کے مطابق جہاں یہ قبرستان ہے وہاں حضرت ماریہ قبطیہ کا مکان ہوا کرتا تھا اور حضرت ابراہیمؑ نہیں پیدا ہوئے تھے۔ یہ ان سب ایرانیوں کے لیے ایک خبر تھی۔

اور جب اُس ایرانی نے جس سے میں مخاطب تھا اُس نے مجھ سے منہ موڑ کر اپنے گروہ کے ساتھیوں کو یہ خبر سنائی تو وہ سب جواب اطمینان سے بیٹھے تھے اور منرل واٹر کی بوتلوں سے گھونٹ گھونٹ پانی پیتے تھے پھر سے آہ وزاری کرنے لگے۔

ان کی عقیدت اور افسوس کی کوئی حد نہ تھی۔

مجھے قلق ہوا کہ میں نے خواہ مخواہ ان تک یہ اطلاع پہنچا کر انہیں مزید نڈھال کیا اور پھر ایک طمانیت بھی ہوئی کہ وہ یہ خبر عام بھی کریں گے اور لوگ آنے لگیں گے اور حضرت ماریہ اور حضرت ابراہیمؑ کے مقام پیدائش کی جگہ یوں گمنام نہ رہے گی۔

پھر اس ایرانی نے آبدیدہ ہو کر اپنے ساتھیوں کو ظاہر ہے فارسی میں ایک حکایت بیان کی کہ کیسے حضورؐ کے ایک زانو پر امام حسینؑ... بقول اُس کے کو چمک امام حسینؑ اور دوسرے زانو پر کو چمک حضرت ابراہیمؑ بیٹھے ہوئے تھے۔ جب جبریل امین آئے اور انہوں نے کہا۔ افسوس یہ دونوں زیادہ دیر

یہ حکایت بھی غمناک اور پراثر تھی۔ اور پھر سے آنسو بہہ نکلے۔

”تو میں دیکھ کر آتا ہوں۔“

”ظہر و صاحب۔“ مولا بکشل نے کارسارٹ کی اور اسے شاہراہ سے اتار کر کھنڈر کے قریب لے گیا تاکہ مجھے دھوپ میں زیادہ چلنا نہ پڑے۔

کھنڈر قدرے بلند سطح پر تھا۔ اس کے پس منظر میں ایک مختصر بیابانی کے پار مدینے کی بستیاں اور گھوروں کے باغ دکھائی دے رہے تھے۔ بائیں ہاتھ پر نشیب میں چند گھرا ایک چھوٹے سے مغلے کی صورت میں نظر آ رہے تھے اور ان کے برابر میں گھوروں کا ایک جھنڈ تھا۔

کھنڈر کے بائیں جانب اور وہ بھی نشیب میں گھوروں کا ایک وسیع باغ تھا جس کے درخت ایک خاص ترتیب سے لگائے گئے تھے اور ان کے تلے جوزمین تھی وہ ہری بھری گھاس سے ڈھکی ہوئی تھی جس میں سے آب پاشی کی نالیاں ظاہر ہوتی تھیں۔ کہیں دھوپ کا لشکارا نالیوں میں بہتے پانی کو آئینہ کر دیتا۔

کھنڈر کے آغاز میں ایک زنگ آلود بورڈ آؤٹ ہوا تھا جو ترکوں کے محکمہ آثار قدیمہ کی یادگار تھا۔ یہ بورڈ بھی اپنے خستہ وجود کو زیادہ مدت تک نہ سہار سکے گا۔ اس پر شیکوئی ایکٹ 1372 کا کوئی حوالہ درج تھا۔

کھنڈر کے اندر جانے لگا تو مولا بخش جو میرے پیچھے چلا آیا تھا کہنے لگا ”سائیں ادھر باہر سے ہی دیکھ لو۔ اندر جانے کی اجازت نہیں۔ کوئی شرط آگیا تو اعتراض کرے گا۔“

”مولا بخش اس ویرانے میں اور اتنی دھوپ میں کوئی شرط ادھر کیسے آئے گا صرف یہ چیک کرنے کہ کوئی کیا دیکھ رہا ہے۔“

”ادھر کیا دیکھو گے؟“

”ادھر کسی دیوار میں ایک پتھر ہے جس کے ساتھ ٹیک لگا کر بابا بیٹھے تھے۔ وہ دیکھ کر آتا

ہوں۔“

کعب بن اشرف یا بنو نضیر کے قلعے کے کھنڈر سوات کی بدھ خانقاہوں کے کھنڈروں کی طرح تھے۔ یہ زیادہ سے زیادہ تین چار کنال رقبے پر محیط تھا۔ ہوسکتا ہے ابتدائی حالت میں یہ اس سے کہیں وسیع رقبے پر آباد ہو۔ جیسے گندھارا مہد کی عمارتیں بڑے بڑے سلیٹی پتھروں سے تعمیر کی جاتی تھیں اس کی تعمیر کا انداز بھی وہی تھا۔ بیشتر پتھر ان گڑھے تھے اور اسی سیاہ اور بلی ہوئی مٹی کے تھے جو مدینے میں داخلے سے قبل دائیں ہاتھ پر بکھرے نظر آتے ہیں۔ آتش لگائی پتھر تھے۔ ایک جانب تین کمرے۔ یا محکمات ہال کہہ لیجئے جن کی چھتیں اچھے چکی تھیں اور مسماں شدہ دیواریں بھرے قد سے اونچی نہ ہوتی تھیں۔

”کعب بن اشرف کا قلعہ۔ بنو نضیر کی بستی۔“

جہاں حضورؐ نے ایک پتھر سے ٹیک لگائی۔“

مسکن ماریہ کے مقام سے نکلے تو پھر ہم بہت دور تک گئے۔

مدینے کی حدود سے نکل گئے اور ایک طویل شاہراہ کے آخر میں سیاہ پہاڑیاں جو پہلے دھوپ کی گرمی کی شدت سے اٹھنے والی دھندلی لرزش میں آئی ہوئی ہواؤں میں ایک سراب کی مانند دکھائی دیتی تھیں واضح ہوتی گئیں اور ہم ان کے قریب ہوتے گئے۔

ان میں ایک کوہ بنو قریظہ تھی۔

اور اس کی قربت میں ایک سیاہی مائل پہاڑ ”جبل النار“ نام کا تھا۔

شاید ان زمانوں کی یادگار جب مدینے میں شدید زلزلہ آیا تھا اور آتش فشاں اُبل پڑے تھے۔ عین ممکن ہے کہ اسی ”جبل النار“ نے لاوا اُگلا تھا اور اب یہ ایک سرد ہو چکا آتش فشاں پہاڑ تھا۔

یہ علاقہ سعید شہان کا تھا۔ کم از کم بابا فقیر کے بے دانت لہجے میں اس کا نام یہی سنائی دیا تھا۔ آبادی کی نشانیاں بہت کم تھیں اور ویرانی کا آغاز تھا۔

بابا فقیر نے اپنا عصا اٹھا کر مولا بخش کوڑکنے کا حکم دیا۔

وہ رُک گیا۔

دائیں ہاتھ پر شاہراہ سے کچھ فاصلے پر ایک کھنڈر تھا۔

یہ یہودی قبیلہ بنو نضیر کا علاقہ تھا۔

کعب بن اشرف کا قلعہ تھا۔

”دیکھو؟“ میں نے میوند سے دریافت کیا۔

”میں نہیں دیکھتی یہودیوں کے قلعے۔“ وہ دراصل دھوپ میں جانے سے گریز اس تھی۔

درمیان میں ایک دالان اور ان کمروں کے سامنے اتنے ہی سائز کے تین اور کمروں کے کھنڈر۔ ان میں ایک متروک شدہ کنویں کے بھی آثار تھے۔

اس کے اندر قدم رکھتے ہی یہ خیال دامن گیر ہوتا ہے کہ ایک بار حضور یہاں آئے تھے اور اس کی ایک دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھے تھے اور جان گئے تھے کہ بنو نضیر اوپر سے پتھر گرا کر انہیں ہلاک کرنے کا منصوبہ بنا رہے ہیں تو وہ یک لخت وہاں سے اٹھ گئے تھے۔

یہ ایک ایسا کھنڈر تھا جہاں رونما ہونے والے واقعات کا تذکرہ قرآن پاک میں بھی آیا ہے۔ اس تاریخی قلعے کے کھنڈروں کی۔ میری معلومات کے مطابق کبھی باقاعدہ کھدائی نہیں کی گئی۔ کہ اپنی تاریخ کے آثار میں سے کھوج لگانے کے لیے جوشوق جستجو اور تدبیر درکار ہوتی ہے وہ سونے کے محلوں میں رہنے والے حکمرانوں کے خالی ذہنوں میں مقیم نہیں ہو سکتی۔ اگر اس قلعے کے کھنڈر اور اس کے نواح کو کوئی جان مارشل۔ مارٹی مور و ہیلر یا دانی مل جائے تو مجھے یقین ہے کہ ان کی تہوں میں مٹی میں مدفون اب بھی وہ تیر اور تلواریں بے شک رنگ آلود بھر بھری حالت میں اب بھی موجود ہوں گی جو بنو نضیر اور صحابہ کرامؓ کے ہاتھوں میں رہی ہوں گی۔

وہ تیر بھی جو اس قلعے کے محاصرے کے دوران حضورؐ کے خیمے تک پہنچتے اور اس میں چھید کرتے تھے۔

میں کعب بن اشرف کے قلعے کے کھنڈروں میں اُس کے سیاہ پتھروں میں سے اٹھتی ہوئی تاریخ کی حدت محسوس کرتا تھا۔

یہاں میں اپنے ایک شدید خدشے کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔

بے شک چھوٹا منہ ہے لیکن بات اتنی بڑی ہے کہ اس پر دھیان کرنا چاہیے۔

مجھے خدشہ ہے کہ آئندہ سو دو سو برسوں میں دیگر مذاہب کی مانند اسلام بھی ایک دیومالا کی کہانی بن سکتا ہے۔ جوں جوں اس کے آثار مٹنے چلے جائیں گے ہم حقیقت سے دور ہو کر داستانوں میں چلے جائیں گے۔

تاریخ پر تاریخ کے آثار پر بل چلا کر پھر وہاں سہاگا پھیر کر زمین کو ہموار ایسے کر دینے سے کہ وہاں سے گزرنے والے کو شبابہ بھی نہ ہو کہ یہاں ایسے مقام ایسے کھنڈر ایسے نشان موجود تھے جو اُس کے عقیدے اور کتاب کی شہادت دے کر اُسے چننے کرتے تھے۔ ایسا کرنے سے۔ ایسے بے رحم عمل سے اپنے تئیں شرک کو مسار کرنے والے یہ نہیں جانتے۔ کہ آثار اور تاریخ کو منہدم کر دینے سے مذہب کے ایک دیومالا کی داستان بن جائے گا۔

ایک دیومالا کی داستان بن جائے گا۔

مثلاً۔ اگر بنو نضیر کے قلعے کے پتھر بھی مٹا دیے جاتے ہیں جیسا کہ دستور ہو چکا ہے تو آئندہ اسیلیں جب تاریخ کا مطالعہ کرتے ہوئے اسے اپنے تصور میں لائیں گی تو ان کے سامنے کوئی تصویر نہ ہوگی۔ شواہد نہ ہوں گے محض تصور ہوگا۔ اور یہ تصور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ۔ جذباتی وابستگی اور عقیدے کی عظمت کو وسعت دیتے ہوئے ایک قسوس حقیقت کی بجائے ایک دیومالا کی صورت اختیار کر جائے گا۔

بنو نضیر کا یہ قلعہ اگرچہ تین چار کنال کے رقبے پر محیط ہے۔ ایک بڑی حویلی جتنا بھی نہ ہوگا لیکن ہر شخص جب ایک قلعہ تصور کرے گا تو اپنے اپنے وطن میں جیسے قلعے ہوتے ہیں وہ انہی کا خیال کرے گا۔ برصغیر کے ہاں جب ”قلعہ“ کا تذکرہ پڑیں گے تو ان کے ذہنوں میں روہتاس۔ رانی کوٹ۔ الال قلعہ یا لاہور کا شاہی قلعہ ہی ابھرے گا۔ دیگر اقوام بھی اپنی تاریخ اور طرز تعمیر کے نمائندہ قلعے ہی تصور میں لائیں گی۔

وہ تاریخ پڑھتے ہوئے اس تین چار کنال پر محیط قلعے کو بھی اپنے قلعوں کے معیار اور وسعت کے قریب لے جائیں گی۔ جب اس کے کوئی آثار نہ ہوں گے۔ کوئی حوالہ نہ ہوگا تو وقت گزرنے سے اس کا رقبہ بڑھتا چلا جائے گا۔ اس کی فصیلیں بلند ہو کر آسمانوں کو چھونے لگیں گی۔ اس کے برج اور پینار بے شمار ہو جائیں گے اور اس کے اندر یہودیوں کی چند سوئفری بے حساب سپاہ میں بدل جائے گی جو مسلمانوں کی یلغار کے آگے ہتھیار ڈال دے گی۔

غرض کہ تاریخ اور حقیقت پیچھے رہ جائیں گے اور ان کی جگہ ایک تصور آتی دیومالا جنم لے لے گی۔

خیبر کے قلعے کے بارے میں ابھی سے ایک دیومالا جنم لے چکی ہے۔ جب کہ اُس کا رقبہ بھی بنو نضیر کے اُس قلعے سے بڑھ کر نہیں اور اُس کا دروازہ ابھی سے آسمان کو چھو رہا ہے۔

ہمارا مذہب دیگر مذاہب سے یوں بھی ممتاز ہے کہ اس کی بنیاد حقیقت اور تاریخ ہے۔ رسول اللہؐ کی حیات کا ہر لمحہ درج ہے۔ ہر دن محفوظ ہے۔ ہر مقام کی نشاندہی ہے۔ جہاں وہ پیدا ہوئے تھے۔ جس راستے پر انہیں گود میں اٹھائے ہوئے عبدالمطلب خانہ کعبہ کی جانب گئے تھے۔ علیمہ سعدیہ انہیں ۱۱ھ پلانے کے لیے کس قریب میں لے کر گئی تھیں۔ جبل حرا کی بلندی پر جو غار تھا وہاں پہنچنے کے لیے حضورؐ کو نارا راستہ اختیار کرتے تھے اور کہاں کہاں امان علیہ السلام کا گھر تھا جس میں وہ کھپاتے ہوئے آئے تھے اور انہیں سیاہ کھل اور حایا گیا تھا۔ منہ کی کس پہاڑی پر کھڑے ہو کر انہوں نے اپنے رسولؐ ہونے کا اعلان کیا تھا۔ میں نے کون سے کنویں سے پانی پیا تھا۔ قصویٰ کہاں ٹپکی تھی۔ غرض کہ ہر لمحہ اور ہر مقام درج

ہے۔ اور یہ بھی کہ قرآن کی کون سی آیت کس حوالے سے کس مقام پر اتری تھی۔

اور اسی کھنڈر.. بنو نضیر کے قلعے کے مختصر کھنڈر کے حوالے سے بھی تو اللہ کے فرمان اترے تھے۔

اس کھنڈر کے بھی مٹ جانے سے حوالہ کہاں سے آئے گا۔

دیگر مذاہب کی بیشتر تاریخ اور ان کے انبیاء کی حیات ایک دیومالائی قصے کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ بے شک یہ بدھ ہوں.. ہندو.. یہودی یا عیسائی ان کی تاریخ اور ان کے پیغمبر قصے کہانیوں کے کردار نظر آتے ہیں۔ ان کے ہاں حقیقت اور آثار کے ثبوت نہ ہونے کے برابر ہیں۔

ایک مدت تک ہیلن کی نسبت سے مشہور نرائے کا شہر دیومالا کے اندھیروں میں گم رہا اور بالآخر جب موجودہ ترکی میں اُس کے آثار دریافت ہوئے تو یہ کھلا کہ اُس کی فصیلیں اتنی بلند نہ تھیں جتنی بیان کی جاتی تھیں۔ اُس کے دروازے یا حفاظتی پھانک معمولی نوعیت کے تھے اور نہ ہی وہ اتنا وسیع اور پُر شکوہ شہر ہوا کرتا تھا جس کا تذکرہ ہومر کی داستانوں میں ملتا ہے۔

کچھ اسی طور پر عظیم مہابھارت کی جنگ جو کوروؤں اور پانڈوؤں کے درمیان لڑی گئی اور جس کے نتیجے میں دنیا کی ایک بڑی رزمیہ داستان وجود میں آئی۔ ویسی ہرگز نہ تھی جیسی کہ اُس کی دیومالا میں بیان کی جاتی ہے۔ ولیم ڈل رپل اپنی تصنیف ”سٹی آف جنر“ میں لکھتا ہے کہ اس جنگ میں ایٹنی اسلحہ ایسے تباہ کن ہتھیار اور پرواز کرتے ہوئے برباد کر دینے والے تھے کہ پہیوں کی بجائے صرف لاشیاں استعمال ہوئیں۔ آٹھ سائے ہو کر گھونسوں کا تبادلہ ہوا۔ لیکن نہ شواہد تھے اور نہ آثار تو لاشیاں تباہ کن ہتھیاروں میں بدل گئیں اور گھونسے مہلک پتے بن گئے۔

مجھے بھی اسی قسم کا خدشہ ہے جس کا میں نے اظہار کر دیا۔

مولانا بخش مجھ پر کڑی نظر رکھتا تھا کہ یہ سائیں جوان کھنڈروں میں بھٹکتا ہے کہیں ادھر ادھر نہ ہو جائے۔ اور یہ ہر پتھر کو ہاتھ لگا کر کیا دیکھتا ہے۔

بنو نضیر مدینہ کے یہودیوں میں سب سے اعلیٰ ذات کے سمجھے جاتے تھے۔ ذاکر حمید اللہ کے مطابق ”نضیر“ تروتازہ درخت یا پودے کو کہتے ہیں۔ وہ کامیاب کا شکار اور باغبان تھے اور ان کی بستی حرہ و اقم کے زرخیز علاقے وادی بطحان سے ملحق تھی۔ یہ بستی مدینہ کے مرکز سے جنوب کی جانب تین میل کے فاصلے پر تھی اور اس کے گرد اعلیٰ ترین کھجور کے بڑے کھنے باغات تھے۔

کعب بن اشرف اسی قبیلے بنو نضیر کا سردار تھا۔ جنگ بدر کے بعد اُس نے اپنی شہلیاں

شامری سے قریش کو پیش دایا کہ وہ ہر حال میں مسلمانوں سے بدلہ لیں۔ کعب نے بدر کے کنوئیں میں چھپنے والے قریش کے سرداروں کا مرثیہ لکھا۔ خود رونا اور قریش کو زلا کر ان کی آتش انگام تیز کرتا۔

”بدر کے کولہو سے اس کے اپنے اقارب کا خون باہر آ رہا ہے۔ آؤ

بدر کے واقعات پر روئیں اور آہ بکا کریں وہاں بہترین لوگ اپنے ہی عوض کے گرد قتل کر دیئے گئے۔ ایسا بھی ہو ہی جایا کرتا ہے بادشاہ بھی کبھی پھڑکی جایا کرتے ہیں۔“

مدینہ واپس آ کر وہ مسلمان خواتین کے بارے میں نام لے لے کر فحش شعر کہتا اور دشنام کرتا۔ چنانچہ رسول اللہ نے فرمایا ”کون ہے جو کعب بن اشرف کی خبر لینے کی ہامی بھرتا ہے۔“ حضرت محمد بن مسلمہ نے کہا ”آپ کی خاطر میں یہ کام کرنے کو تیار ہوں۔ میں اسے قتل کر دوں گا۔“

”اگر تم ایسا کر سکو تو کر گزرو۔“ رسول اللہ نے فرمایا۔

”ہمیں اجازت دیں کہ ہم اُس سے کچھ حیلے بھانے کی باتیں کریں۔“

فرمایا۔ ”جو مناسب سمجھو کرو۔“

مسلمہ کے ہمراہ ابونا نکلہ بھی تھے جو کعب کے دودھ شریک بھائی تھے اس لیے وہ ان پر مکمل اعتماد کرتا تھا۔

آسمان پر چودھویں کا چاند روشن تھا۔ کعب بن اشرف کے قلعہ کے نیچے پہنچ کر ابونا نکلہ نے اسے آواز دی تو کعب کی نو بیاہتا بیوی نے اسے روکا۔ ”اس وقت کہاں جا رہے ہو۔ جنگجو آدمی کے بہت دشمن ہوتے ہیں اسے رات کے وقت باہر نہیں جانا چاہیے۔“

کعب نے اپنی بیوی سے کہا ”ابونا نکلہ میرا بھائی ہے اُس نے مجھ سے آنے کا وعدہ کیا ہوا ہے۔“ اور قلعہ سے باہر آ گیا۔

ابونا نکلہ نے کعب کے سر کو ہاتھ لگا کر پیار سے کہا ”کعب تو نے یہ کیسی خوشبود لگا رکھی ہے کہ رات بھی مقفل ہو رہی ہے۔“ کعب خوش ہو گیا کہ بھائی تعریف کر رہا ہے۔ ابونا نکلہ نے اسے بالوں سے لگا کر قابو کیا اور مسلمہ نے اس کے ہاتھ میں چھری گھوپ دی اور اس کا سر کاٹ کر ساتھ لے لیا۔

اگلی صبح یہودیوں نے رسول اللہ سے شکایت کی ”ہمارا سردار کعب رات اپنے گھر سے نکلا تو اسے لہجے جرم کے دھوکے سے قتل کر دیا گیا۔“

فرمایا: "اگر وہ بھی دیگر یہودیوں کی مانند عہد پر قائم رہتا تو نہ مارا جاتا۔ اُس نے ہمیں اذیت پہنچائی اور ہمارے خلاف اشعار لکھے تھے۔"

ایک بار رسول اللہ ﷺ کی دیت کے بارے میں مشورہ کرنے کے لیے بنو نضیر کے قلعے میں تشریف لائے جب کہ اُن کے ہمراہ دس صحابہ کرام تھے جن میں حضرت ابو بکر صدیقؓ، حضرت عمرؓ بن خطاب، حضرت علیؓ بن ابی طالب، حضرت زبیرؓ، حضرت طلحہؓ شامل تھے۔ حضور ایک دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ یہودیوں کو اپنے سردار کعب کا قتل یاد آ گیا۔

نحی بن اخطب نے کہا "ایسا موقع پھر نہیں ملے گا مکان کے اوپر سے پتھر گرا کر محمدؐ کو ختم کر دو۔"

عمر بن خطاب نے کہا "یہ کام میں کرتا ہوں۔ مکان کے اوپر سے میں محمدؐ کے اوپر پتھر گرا دیتا ہوں۔"

اس سے پیشتر کہ وہ ایسا کرتے رسول اللہ ﷺ ان کے منصوبے سے آگاہ ہو گئے اور اپنے صحابہؓ سے کچھ کہہ بغیر اٹھ کر چلے گئے۔

رسول اللہ ﷺ نے بنو نضیر کو پیغام بھیجا کہ تم نے اُس عہد کو توڑ دیا ہے جو تم نے کر رکھا تھا۔ تم اس شہر اور علاقے سے دس روز کے اندر نکل جاؤ۔

جواب آیا "ہم اپنے اموال کبھی نہ چھوڑیں گے آپ سے جو ہو سکتا ہے کر لیں۔ ہمارے پاس ایک سال کی خوراک اور بستی میں پانی کے کنویں موجود ہیں۔"

بنو نضیر کے قلعے کا محاصرہ شروع ہو گیا۔ کمان حضرت ابو بکر صدیقؓ کو سونپی گئی۔ فجر کی نماز کے لیے اذان حضرت بلالؓ نے دی اور انہوں نے حضورؐ کا خیمہ نصب کیا۔ یہودیوں کے تیر خیمے تک آتے اُس میں چھید کرتے تھے چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اُسے پیچھے نصب کرنے کا حکم دیا۔ جب آپؐ نے دیکھا کہ یہودی ہتھیار ڈالنے والے نہیں اور قلعے سے باہر آ کر مقابلہ نہیں کریں گے تو آپؐ نے اُن کے کھجوروں کے باغ کاٹ دینے کا حکم دیا۔

بنو نضیر نے احتجاج کیا "آپؐ ہمارے پھل دار درخت کیوں کٹوا رہے ہیں؟ آپؐ تو زمین پر فساد پھیلانے سے منع کرتے تھے۔"

اور وہ درست بھی کہتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ ہمیشہ جنگ کے دوران عورتوں اور بچوں کے قتل اور درختوں کو کاٹنے سے منع فرماتے تھے۔

فرمایا "اگر تمہاری آنکھیں کل سکیں اور تم جنگ کے شعلے بھڑکا کر اُس میں اپنی قوم کو راکھ کر

اسیٹے سے ہار آ جاؤ۔"

پنکھل کے مطابق یہودیوں نے کہا "اے محمدؐ آپؐ تو دوسروں کو فساد کرنے سے منع کرتے تھے پھر خود ہی ہمارے ہرے بھرے پودے کاٹ کر جلا تا کہاں کا انصاف ہے۔"

اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔

"کھجوروں کے درخت جو تم نے کاٹ ڈالے یا اُن کو ہاتھ نہ لگایا اور

بدستور اُن کو جڑ سمیت کھڑا رہنے دیا تو خدا ہی کے حکم سے تھا اور خدا کو منظور تھا

کہ نافرمانوں کو سزا کرے۔"

یہودیوں نے ہتھیار ڈال دیئے اور رسول اللہ ﷺ نے نہ صرف اُن کی جاں بخشی کر دی بلکہ ایک اونٹ پر ہر خاندان جتنا سامان لے جاسکتا تھا لے جانے کی اجازت دے دی۔

بنو نضیر کے شکست خوردہ مدینہ سے نکلے تو کچھ خیبر کے نزدیک آباد ہو گئے اور کچھ ملک شام کی جانب چلے گئے۔

بنو نضیر کے اسی قلعے اور بستی کے حوالے سے مزید آیات بھی نازل ہوئیں جن میں سورہ حشر کی کچھ آیات بھی شامل ہیں۔

چودہ سو برس بعد آج ایک حدت بھری دوپہر میں۔ جب کہ شاہراہ کے قریب ایک کار کھڑی تھی جس میں میری بیوی اور فقیر محمد میرے منتظر تھے اور مولانا بخش مجھ پر نظر رکھتا تھا۔ میں بنو نضیر کے اُسی قلعے کے کھنڈروں میں موجود تھا جس کے حوالے قرآن پاک میں آئے تھے اور اس کے نواح میں اور باہروں کے ڈھیروں تلے جو زمین تھی اُس کے اندر وہ تیر پوشیدہ تھے جو حضورؐ کے خیمے میں چھید کرتے تھے اور وہ تلواریں اور بھالے موجود تھے جو بنو نضیر کے کسی کام نہ آتے تھے۔

اور یہاں ایک کنواں بھی تھا جس کے بارے میں بنو نضیر نے حضورؐ کو پیغام بھیجا تھا کہ سال بھر کی خوراک کے علاوہ ہمارے پاس پانی بھی ہے۔

اور دائیں جانب نشیب میں ایک ہرا بھرا کھجوروں کا ایک وسیع خوش نظر باغ بھی تھا اور غالب امکان تھا کہ وہی تھا جس کے چند درخت مسلمانوں نے کاٹ کر جلا دیئے تھے اور چند جڑوں سمیت رہنے دیتے تھے کہ اس قلعے کی بلندی سے یہ باغ پھیلا نظر آتا تھا۔ اس کے سوا دوسری جانب چند مکانوں کی قربت میں کھجور کے کچھ درخت سایہ کر رہے تھے۔ تو باغ یہی ہو سکتا تھا۔

میں کھنڈر سے نکل کر اس باغ میں اترنا چاہتا تھا لیکن مولانا بخش نے سختی سے منع کر دیا "سائیں

غضور بیٹھے تھے..

تو کیوں نہ ہر پتھر کو ہاتھوں سے چھو لیا جائے..

کچھ حرج نہیں..

کوئی تنبیہ کرنے والا بھی تو آس پاس موجود نہیں تو کیوں نہ کچھ شرک کر لیا جائے..

اور میں نے بہت شکر کیا..

اس کا مالک بہت غصے والا ہے... نیچے نہ جاؤ۔“

یہودیوں نے جو کچھ بھی چھوڑا تھا اس کے لیے سوائے ایک شب خون کے مسلمانوں نے نہ قتال کیا تھا نہ گھوڑے دوڑائے تھے نہ تلواریں اور نیزے چلائے تھے اس لیے یہ مال غنیمت نہ تھا۔ اللہ اور اُس کے رسول کی ملکیت تھا۔ رسولؐ نے انصار کے مشورے سے وہ باغات اور زمینیں مہاجرین میں تقسیم کر دیئے۔

انہی مہاجرین کی آل اولاد میں سے یہ غصیلہ شیخ بھی ہو سکتا تھا۔

اگرچہ میں اس باغ پر حق شفیعہ کرنے کی قانونی پوزیشن میں تھا کہ میرے رسولؐ نے کھجوروں کا یہ باغ تمہارے اجداد کو عطا کیا تھا تو مجھے اتنا تو حق ہے کہ چند لمعے اس میں گزار سکوں۔ اُن درختوں کے قریب ہو سکوں جن کا قرآن میں ذکر آیا ہے۔ لیکن میں ایک غصیلے شیخ سے.. جو کہیں نظر تو نہ آتا تھا صرف اُس کی دہشت مولا بخش کو محسوس ہوتی تھی.. اُس شیخ سے کیا بحث کرتا کہ اُس کے اجداد مہاجرین میں سے تھے اور مکہ کے تھے اور وہ ابھی تک کنصور دل تھے..

”میں نیچے نہیں جاتا مولابخش.. آپ کچھ غم نہ کرو..“

”آپ کا تو کچھ غم نہیں سائیں.. پر جو باا فقیر ہے وہ کہتا ہے کہ مجھے بہت پیاس لگی ہے..“

”تو اس قلعے کے نیچے جو بستی نظر آتی ہے وہاں سے اُسے پانی لا دو کہ بنو نصیر کے قلعے کا یہ کنواں تو پتھروں سے بھرا ہوا ہے..“

”سائیں وہ پانی نہیں پیتا.. بابا فقیر صرف سیون اپ پیتا ہے اور وہ بھی امریکی ٹین والا.. تو میں اُس کا کچھ بندوبست کرتا ہوں پر نیچے کھجوروں کے باغ میں نہ اُتر جانا.. وہ شیخ بہت غصے والا ہے..“

اسلام کے اولین ایام کی تاریخ.. ہمارا شدہ دیواریں.. سیاہ پتھر.. ایسٹ روڈس.. اور ایک گرم دوپہر..

بنو نضیر کے اس قلعے کے کھنڈروں نے مجھ میں چودہ سو برس پیشتر کی حیرت جگائی.. کہ کیا یہ اب

کیا یہ وہی باغ ہے جس کے تذکرے ہماری کتاب میں ہیں..

بچیاں ہماری کار کھڑی ہے۔ یہ مقام وہ مقام بھی ہو سکتا ہے جہاں تیروں سے چھلنی حضور مکا

خیمای ستاد و قشای

اور انہیں وہ دوا رکھی جائے تاکہ میں اس کے نواح میں جس کے ساتھ ہے۔

یہاں مجھے تقریباً پینتالیس برس کا ایک حوالہ... بنو قریظہ کا نام سن کر یاد آیا..
انگلستان میں میرا ایک یہودی ہم جماعت ہوا کرتا تھا.. وہ اتنا زیرک اور وسیع علم رکھنے والا
فخص تھا کہ ہم سب مسلمان اُس سے عاجز آ جاتے تھے.. بحث نہیں کر سکتے تھے.. اور مجھے یاد ہے کہ وہ
مدینہ کے یہودی قبائل کا ذکر کرتے ہوئے بنو قریظہ کے دردناک انجام کا حوالہ دیا کرتا تھا.. اور کہا کرتا
تھا کہ:

یاد رکھو! مدینہ دراصل ہم یہودیوں کا شرب تھا جہاں سے تم نے ہمیں نکال دیا.. اور یاد
رکھو! ایک روز ہم وہاں واپس جائیں گے.. اور ہم سب پاکستانی، سوڈانی اور عرب اشتعال میں آ جاتے
تھے کہ یہ کیا بکواس کر رہا ہے..

لیکن اب اتنے برس بعد میں سوچتا ہوں کہ ہماری جو حالت ہے اگر اسرائیل تہیہ کر لے تو اُس
کی راہ میں کوئی رکاوٹ ہے؟ ہم زیادہ سے زیادہ یہ کریں گے کہ اپنے غم و غصے کا اظہار کریں
گے.. احتجاج کریں گے.. جلوس نکالیں گے.. کچھ غیر ملکی اداروں اور ریستورانوں کی عمارتیں جلا دیں
گے.. صدے میں آ کر چند سوا فرادہ خودکشی کریں گے.. اس کے سوا اور کیا کریں گے؟
وہی کچھ کریں گے جو بیت المقدس کے چھن جانے پر کر رہے ہیں.. اور کیا کریں گے؟..

بنو قریظہ کا مسئلہ تو حل ہو گیا تھا.. بنو قریظہ کا معاملہ ابھی باقی تھا..
اللہ کے رسولؐ نے مدینہ میں اپنا نائب نابینا حضرت ابن ام مکتوم کو مقرر فرمایا.. جسٹھ حضرت
علیؑ کو دیا اور انہیں ایک دستہ کے ساتھ بنو قریظہ کی ہستی کی طرف روانہ کر دیا..
رسولؐ اللہ خود بنو قریظہ کے قلعے کی دیواروں کے نیچے گئے اور انہیں پکارا..
”اے ابوالقاسم کیا چاہتے ہو؟“ بنو قریظہ کے سردار نے فحیل پر سے پوچھا اور حضورؐ کی
مصالحت آمیز گفتگو کے باوجود کہا ”ابوالقاسم آپ ادھر ادھر کی فضول باتیں نہ کریں.. ہم آپ کے سامنے
بھٹکنے والے نہیں..“

جب محاصرہ طویل ہو گیا اور بنو قریظہ کی مدد کو کوئی قبیلہ نہ پہنچا تو انہوں نے بنو قریظہ والی
شرائط پر مدینہ چھوڑ دینے کی اجازت چاہی.. یہ درخواست مسترد کر دی گئی اور حضورؐ نے فرمایا.. تمہیں
غیر مشروط طور پر ہتھیار اٹا ہوں گے..
اسی موقع پر ابولہب نے اپنے ہاتھ سے اپنے طاق کی طرف اشارہ کر کے اور اُس پر انگلیاں

”بنو قریظہ کے آثار.. حضرت لبابہ کی پشیمانی“

”سائیں یہ بنو قریظہ کا علاقہ ہے..“

”بنو قریظہ؟“

”یہودی تھے سائیں.. بہت طاقتور تھے..“

وہاں جدھر مولائش بریک پر پاؤں رکھے بغیر گزرتا جاتا تھا وہاں کوئی آثار تو نہ تھے.. ایک
دیوار کے عقب میں کھجوروں کے چند بوٹے تھے جو بنو قریظہ کے اگرچہ کٹر لیکن طاقتور قبیلے کی اجڑتی
نشانیوں تھیں.. یہاں بھی ترکوں نے ایک مسجد بنائی تھی جو اہل نظر نے ڈھائی تھی بھلا یہودیوں کی نشانیاں
کیا رکھنی..

”جہاں حضرت لبابہ آئے تھے؟“

”اللہ بھلا کرے“ فقیر بابا خوش ہو گئے.. ”جی ہاں.. جہاں لبابہ یہودیوں کو سمجھانے آئے تھے
اور انہیں اشارے سے بتا دیا کہ تم چاہے ہتھیار ڈال دو تمہیں قتل کر دیا جائے گا.. اس راز کو افشا کر دینے پر
اتنے شرمندہ ہوئے کہ اپنے آپ کو مسجد نبویؐ کے ایک ستون سے باندھ دیا کہ جب تک معافی نہیں ملے
گی.. یونہی بندھا رہوں گا.. انہیں صرف نماز کے اوقات میں کھولا جاتا تھا.. پھر حضورؐ نے اُن کی معافی کی
خوشخبری دی اور اُن کی رسیاں اپنے ہاتھوں سے کھولیں..“

مسجد نبویؐ میں میں نے اُس ستون کی شناخت کی تھی اور اُس کی قربت میں نفل ادا کیے تھے اور
حضرت لبابہ کی پشیمانی محسوس کی تھی..

”بنو قریظہ کی ہستی مدینہ کے جنوب میں مہرود کے قریب تھی.. عربی میں قریظہ اُس درخت کو
کہتے ہیں جو کہ خاص طور پر چڑھ رکنے کے کام آتا ہے.. بنو قریظہ کا پیشہ باغبانی کے علاوہ جو تے بنانا اور
پکنا تھا.. یعنی یہودی تھے اور اسی لیے دیگر یہودی انہیں پکنا کہتے تھے..“

عرصے سے انسانی چلا آتا ہے۔

ابن کثیر کے مطابق بنو قریظہ نے زبردست لڑائی کے بعد ہتھیار ڈالے تھے اور نہایت شہادت کا مظاہرہ کیا تھا۔ حضرت علیؓ اور حضرت عمرؓ کی قیادت میں جب حملہ کیا گیا تو بنو قریظہ نے بڑی جی داری سے مزاحمت کی تھی اور ان کے سردار بہت بے خوفی اور بہادری سے لڑے تھے۔ اور صرف ہتھیار نہ ڈالنے والوں کو قتل کیا گیا تھا۔ برکات احمد نے بھی بنو قریظہ کے مردوں کے قتل کی تردید کی ہے اور کہا ہے کہ بدینہ ان زمانوں میں چھوٹا سا شہر تھا اور اس کے ایک بازار میں اتنے آدمیوں کو قتل کر کے دبانے کے لیے گڑھے کھودنے کی گنجائش ہی نہ تھی۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ رسول اللہؐ جیسے نفیس طبیعت کے انسان آبادی کے اندر اتنے آدمیوں کو قتل کر کے دبانے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔

میں بھی اپنی طبیعت کو ابن کثیر اور برکات احمد کی تحقیق کے قریب پاتا ہوں۔ ہم بنو قریظہ کی بستی کے آثار، کھجور کے چند درخت، وہاں ٹھہرے نہیں گزر گئے۔ البتہ تاریخی اختلافات وہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔

پھیر کر یہودیوں کو بتایا تھا کہ انہیں ہر حال میں قتل کر دیا جائے گا۔

بنو قریظہ نے ہتھیار ڈال دیئے تو جنگ کے قوانین کے مطابق ان کے اجتماعی قتل کا فیصلہ صادر کر دیا گیا۔ رسول اللہؐ کے حکم پر مدینہ کے بازار میں لمبے اور گہرے گڑھے کھدوائے گئے یہودی مردوں کو ٹولیوں کی صورت میں لایا جاتا تھا اور ان گڑھوں کے کنارے بٹھا کر ان کی گردنیں اڑادی جاتی تھیں۔

ان کے بچوں اور عورتوں کو غلام بنا کر فروخت کر دیا گیا۔

بنو قریظہ کے کتنے افراد کو قتل کر دیا گیا؟ اس بارے میں اختلاف ہے۔ یہ تعداد ساڑھے چار سو سے نو سو تک بتائی گئی ہے۔ زمانہ جدید کی تحقیق کے مطابق بنو قریظہ کے سب مردوں کو بلا امتیاز قتل نہیں کیا گیا تھا اور نہ ہی ان کی عورتوں اور بچوں کو غلام بنا کر فروخت کیا گیا تھا۔ جب کہ بعض اس بنا پر اس تحقیق کو قبول کرنے سے انکاری ہیں کہ قدیم ماخذ اور صحیح اسناد کے ساتھ بیان کی گئی روایات یہودیوں کے قتل کی تصدیق کرتی ہیں۔

البتہ یہ مستند ہے کہ بنو قریظہ نے نہایت دلاوری سے موت کا سامنا کیا۔

ایک یہودی بوڑھے زبیر کا ثابت بن قیس پر ایک احسان تھا جس کے بدلے میں ثابت نے رسول اللہؐ سے اُس کی جاں بخشی کی سفارش کی جو قبول کر لی گئی۔ زبیر نے اپنے بڑھاپے کا حوالہ دیا کہ میں اس عمر میں اپنے بیوی بچوں کے بغیر کیسے جیوں گا۔ انہیں بھی آزاد کر دیا گیا اور اُس کی جائیداد بھی واپس کر دی گئی۔ اس آزادی کے بعد جب زبیر کے دریافت کرنے پر اُسے یہ معلوم ہوا کہ اُس کے قبیلے کے تمام دوست اور سردار قتل ہو چکے ہیں تو اُس نے ثابت سے کہا ”تو میرے احسان کے بدلے مجھے میری قوم سے ملاوے والہاں کے بغیر جینے کا کچھ لطف نہیں۔ میں اپنے ساتھیوں سے مل جانے کا آرزو مند ہوں اور اتنی تاخیر بھی برداشت نہیں کر سکتا کہ جتنے وقت میں پانی سے لبریز ذول سے پیالہ بھرا جاتا ہے“ ثابت کو یہ درخواست قبول کرنی پڑی اور اسے قتل کر دیا۔

اسی طرح بنو قریظہ کی ایک خاتون حضرت عائشہ صدیقہؓ کے پاس بیٹھی باتیں کر رہی تھی اور خوب ہنس رہی تھی اور جب اُس کے قتل کی باری آئی کہ اُس نے چھت سے چکی کا ایک پاٹ گرا کر حضرت خلد بن سید کو ٹھیکہ کیا تھا اور اُسے پکارا گیا تو وہ ہنس کر بولی ”خدا کی قسم میں موجود ہوں۔“

بقول بیگلر اُس نے نہایت دلاوری سے جان دی اور حضرت عائشہؓ نے فرمایا ”واللہ میں اُس عورت کو نہیں بھلا سکتی جو قتل میں خوش و خرم آئی اور ہنستے ہوئے اپنی گردن جلاوے کے آگے رکھ دی۔“

بنو قریظہ کے تمام مردوں کا اجتماعی قتل اور عورتوں اور بچوں کو فروخت کر دینے والا معاملہ ایک

”کھجوروں کے جھنڈ میں پوشیدہ مسجد رانونا کے کھنڈر.. جہاں تیرا نقش قدم دیکھتے ہیں“

ہم ایک سپاٹ سی.. ویران.. بے روح اور ٹریفک سے عاری.. دھوپ بھری.. معاف کیجیے گا مدینے کی کوئی بھی سڑک بے روح کیسے ہو سکتی ہے.. لیکن دھوپ بھری سپاٹ اور ٹریفک سے عاری تو ہو سکتی ہے تو ہم اُس پر چارہ تھے.. بنو نقیر اور بنو قریضہ کی برباد بستیوں کے بعد ہم اُس پر سفر کر رہے تھے جب بابا فقیر نے اپورنڈ سیون اپ سے مخمور ہو کر ایک بے سُرا اور لمبا ڈکار لیا اور بڑبڑایا ”مولا بخش.. رُکو.. دائیں ہاتھ موڑلو..“

دائیں ہاتھ پر شاہراہ کے ساتھ ایک دھوپ میں جلتا چٹیل میدان تھا.. اور اُس میں کوئی راستہ

نہ تھا..

”کیوں موڑلوں؟“ مولا بخش نے بیزاری سے کہا..

بابا فقیر نے بھی برابری بیزاری سے جواب دیا ”میں جو کہتا ہوں کہ موڑلو..“

”وہاں ہے کیا؟“ مولا بخش نے کار آہستہ کر دی..

”اُدھر میدان کے آگے کھجوروں کا جو باغ نظر آ رہا ہے وہاں کچھ دکھانا ہے صاحب کو..“

”اُدھر ہے کیا فقیر بابا..“ میں نے پُراشتیاق ہو کر پوچھا.. مجھ میں وہی بے قراری بھر گئی جو نہ

قرطبہ میں چین لینے دیتی تھی.. اور نہ غرناطہ اور دمشق میں میرا دامن چھوڑتی تھی کہ.. اُدھر ہے کیا.. کونسا

کھنڈر ہے.. یہ شکستہ محراب کن زمانوں کی ہے.. یہ جو در کھلا ہے اس کے پار کیا ہے.. راکھ کریدتے جاؤ

جستجو کرتے جاؤ شاید کوئی شکاری مل جائے.. کوئی سکہ برآمد ہو جائے.. تو جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا کہ یہ

پھر سب کے سب تو مدینے کے بھڑکی کوئلیں ہیں تو یہاں کوئی بھی کھدے کہ وہاں کچھ ہے تو بے قرار کیا

کے.. کیا ہمارے کیا ہمارے کیا ہمارے

UrduPhoto.com

”مسجد.. رانونا.. نو.. نو..“ فقیر پوچھے منہ سے نو.. نو.. نو.. دہراتا گیا..

”بابا ذرا منہ دبا کر پھر سے بولو کون سی مسجد؟“

اُس نے پھر وہی کچھ نو.. نو.. نو.. کہا..

بہت بعد میں وطن واپس جب آیا تو حضورؐ کی حیات کے اوراق میں ایک لفظ ”رانونا“ یکدم میرے سامنے نمایاں ہوا.. اُس سمندر کی سطح پر ایک بادبانی کشتی تیرتی تھی اور اُس کے بادبان پر ”رانونا“ لکھا ہوا تھا.. میں بتا نہیں سکتا کہ یکدم رانونا کا حوالہ دریافت کر کے میری کیا حالت ہوئی.. میں اپنی سٹڈی سے اٹھ کر کچن میں گیا جہاں میمونہ وال چاول بنانے میں مصروف تھی اور میں نے کہا ”میمونہ.. تمہیں یاد ہے بابا فقیر ہمیں ایک مسجد کے کھنڈر تک لے گیا تھا جس کا نام وہ نو.. نو.. نو.. بتاتا تھا.. وہ رانونا ہے.. جہاں حضورؐ نے مدینے میں آمد پر پہلی نماز جمعہ ادا کی تھی.. مارشل لنگو نے اس کا حوالہ دیا ہے..“

لیکن اُس لمحے میں اس کی اہمیت سے آگاہ نہ تھا جب بابا فقیر نو.. نو.. نو.. بڑبڑا رہا تھا..

”تو وہاں کیا ہوا تھا؟“

”ہونا کیا ہے؟“ بابا فقیر جھلا گیا.. کیونکہ وہ مولا بخش کے ساتھ بحث مباحثے سے عاجز آ گیا

تھا اور شاید اُسے پھر سے ایک سیون اپ کی طلب ہو رہی تھی..

”یہاں نو.. نو.. نو.. میں حضورؐ نے دعا مانگی تھی اور کہا تھا کہ جو شخص اس مسجد میں دعا مانگے گا اُس

کی دعا قبول ہوگی..“

مولا بخش نے کار آہستہ تو کر دی تھی لیکن اُسے روک دینے یا موڑ دینے کا اُس کا چنداں ارادہ

نہ تھا.. ”سائیں ہم بھی تو برسوں سے مدینے میں ہیں.. درجنوں نہیں سینکڑوں بار اُدھر سے گزرے ہیں تو

میں بتاتا ہوں کہ اُدھر صرف کھجوروں کا باغ ہے کوئی مسجد وغیرہ نہیں.. ہوتی تو مجھے معلوم نہ ہوتا..“

”کیوں بابا فقیر؟“

وہ کچھ پر مردہ سا ہو کر بولا: ”ہاں.. نہیں ہے.. بہت برس پہلے جب اُدھر آیا تھا تو باغ میں مسجد

کے کھنڈر تھے.. شاید نہیں ہیں.. بھولتا ہوں.. ٹھیک ہے آگے چلو..“

میں تو جستجو کی کنڈی میں پھنس چکا تھا.. میں مولا بخش کو آگے جانے دیتا تھا.. ”ذرا چیک کر لینے

میں کیا حرج ہے مولا..“

”صاحب اندر کچھ بھی نہیں ہے.. میں اُدھر آتا رہتا ہوں..“

”ہے..“ بابا فقیر پھر اشتعال میں آ گیا

”مولا بخش! آپ ادھر اس پھیل میدان میں گاڑی اتار کر کھجوروں کے باغ کے قریب لے جاؤ۔ دیکھ لیتے ہیں کہ کچھ ہے کہ نہیں۔ نہ ہوگا تو نہ سہی۔“

مولا بخش نے ہادل خواستہ کار شاہراہ سے اتاری۔ پھیل میدان میں وہ دھچکے کھاتی چلی اور کھجوروں کے اُس باغ کے قریب جارہی۔ جو چاروں اُور سے آہنی کھجوروں میں تہی ہوئی جالیوں کے اندر محفوظ تھا اور اُس کا واحد پھانک مقل تھا۔

میں نے آہنی جالیوں کو تمام کر۔ اور اُن میں دوپہر کی حدت بہت تھی۔ باغ کے اندر بھانکا۔ شاید مولا بخش درست کہتا تھا۔ اندر مختلف قامتوں کے درختوں کا ایک گھنا باغ تو تھا۔ کچھ رہائشی کوٹھڑیاں تھیں اور چند مزدوران درختوں تلے کام کر رہے تھے۔ اور کچھ نہ تھا۔

مولا بخش حسب عادت مجھ پر نظر رکھنے کی خاطر میرے پیچھے پیچھے چلا آیا تھا۔

میمونہ اور بابا فقیر دھوپ سے بچاؤ کے لیے کار میں آرام سے تھے۔

مولا بخش آگے ہوا اور آہنی جالی سے ناک لگا کر باغ کے اندرون پر ایک نظر کی۔ اور پھر کھجوروں کے درختوں تلے کام میں مصروف مزدوروں کو مخاطب کر کے سندھی زبان میں ایک ہانک لگائی۔

دو تین نو جوان مزدور اُس کی ہانک سن کر کمر بستہ ہوئے اور آہنی جالی کے جانب جس کے ساتھ ناکیں چپکائے ہم دونوں اندر جھانکتے تھے۔ چلتے آ گئے۔

مولا بخش نے نہایت بے تکلفی سے جو کہ اُس کی خاصیت تھی سندھی میں اُن سے کچھ راز و نیاز کیے۔ کچھ سوال جواب کیے اور وہ مزدور ایک سندھی بھائی کی آمد سے اپنے اُس سوہنے سندھ کی پاس محسوس کرنے لگے۔ جسے وہ پانی پیٹ کی خاطر چھوڑ کر اس بستی میں آ گئے تھے۔ بے شک وہ بستی مدینہ تھی پر سندھ نہ تھی۔ جب اُن کی باہمی گفتگو اختتام کو پہنچی تو مولا بخش میری جانب دیکھ کر مسکرایا ”بڑا کائیاں فقیر ہے سائیں جو کہتا تھا کچھ کہتا تھا۔ یہ سندھی بھائی بتاتے ہیں کہ باغ کے اندر چھپی ہوئی ایک مسجد ہے۔ اُس کے کھنڈر ہیں۔ آپ لوگ زیارت کرنا چاہتے ہو تو ہم پھانک کھول دیتے ہیں۔ ہمارا شیخ کسی کام کے سلسلے میں مدینے گیا ہوا ہے۔ اگر وہ واپس آ گیا تو بہت ناراض ہوگا۔ آپ لوگ جلدی سے زیارت کر لو۔ بلکہ

UrduPhoto.com

مزدوروں نے قفل کھول کر پھانک وا کر دیا۔

UrduPhoto.com

UrduPhoto.com

مولا بخش سندھی بھائیوں کے ہال بچوں اور والدین کی خیریت دریافت کرنے میں مگن ہو گیا

اور میں میمونہ کے ہمراہ مزدوروں کی کوٹھڑیوں سے پرے۔ دھوپ میں سوکھتی کھجوروں سے پرے باغ کے اندرون میں چلا گیا۔

وہاں کھجوروں کے تناور بھی۔ بلند قامت اور ٹھگنے بھی۔ گھنے اور چھدرے بھی درختوں کے درمیان۔ پوشیدہ۔ روپوش۔ ایک سکوت بھری خاموشی میں ہوا کا چلن موقوف تھا۔ صرف دھوپ درختوں میں سے اترتی تھی۔ وہاں ایک مختصر کھنڈر کے آثار تھے۔

بکھرے ہوئے پتھر گواہی دیتے تھے کہ عمارت قدیم تھی۔

ایک بڑے کمرے جتنا کھنڈر ہو چکا رقبہ تھا۔ اور دو تین دیواریں ابھی جوں کی توں کھڑی تھیں۔ لیکن ہمارے قدم سے اونچی نہ تھیں۔ اُن کے درمیان چٹائیوں پر بچھائی ہوئی کھجوریں دھوپ میں سوکھتی تھیں۔ اور اس کھنڈر کے مسجد ہونے کی گواہی ایک مسمار ہو چکی لیکن اب بھی اپنی محرابی ساخت نمایاں کرتی محراب موجود تھی۔

میں نے اور میمونہ نے آپس میں کچھ گفتگو نہ کی کہ اُس غیر معروف کھنڈر نے ہماری گویائی چھین لی تھی۔ بابا فقیر کے اس بیان نے گویائی چھین لی تھی کہ حضورؐ نے یہاں کبھی دعا مانگی تھی اور کہا تھا کہ یہاں پر دعا قبول ہوتی ہے۔

جہاں تیرا نقش قدم دیکھتے ہیں۔

حضورؐ نے یقیناً اسی محراب کے مقام پر نماز پڑھائی ہوگی۔ دعا کے لیے ہاتھ بلند کیے ہوں گے۔

ہم دونوں نے اپنی نظروں سے جائزہ لیا کہ ہم کہاں دو نفل پڑھنے کے لیے کھڑے ہو سکتے ہیں۔ لیکن وہاں پتھر بکھرے ہوئے تھے اور سوکھتی کھجوریں محراب تک جاتی تھیں۔ شیخ کے وارد ہو جانے کا اسی خوف تھا۔ چنانچہ ہم نے اس کی ایک دیوار کے پتھروں پر ہاتھ رکھ کر وہیں کھڑے کھڑے پھر سے وہی کچھ مانگا جو ہم مانگتے چلے آئے تھے۔ ہم دونوں تنہا تھے۔

”قباء شہر مدینہ سے باہر چھ میل پر ایک علیحدہ بستی ہے۔ رسول اللہ

اپنے رفیق سفر ابو بکر کی معیت میں قباء تشریف لائے اور یہاں چار روز قیام کیا

اور اس وقت قیام میں یہاں ایک مسجد تعمیر فرمائی۔“

”مجھ کا وہ تھا۔ رسول اللہؐ نے اُس مسجد میں جو ادنیٰ رانو نامیں تھیں

ظہر جاتے ہیں۔ جہاں مسافر شدہ مخراب کے آثار تھے وہیں قصویٰ کا سوار کھڑا ہوا ہوگا۔ کیا ان زمانوں میں بھی اس مسجد کے آس پاس کھجوروں کا باغ ہوگا۔ یہ عین ممکن ہے کیونکہ کھجوروں کے پودے نئی زمین میں دیر سے جڑ پکڑتے ہیں اور پھر یہ ضروری نہیں کہ وہ اُس زمین کو پسند کریں اور خوب پھیلیں اور بہترین نسل کا پھل پیدا کریں۔ تو جس مقام پر کھجوروں کے درخت کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اُن کے پودے زمین سے خوش ہو کر خوب پھلتے پھولتے ہیں تو پھر وہ باغ نسل در نسل چلتے رہتے ہیں۔ بستیوں کے مقام ضرورت کے تحت بدل جاتے ہیں لیکن کھجور کے کامیاب باغوں کو کبھی نہیں کاٹا جاتا۔ جیسے سلمان فارسی کے باغ کے شجر تک ویسے ہی پھلتے پھولتے چلے آئے۔ اُسی زمین میں جسے سلمان سینچا کرتے تھے اب تک کہ شرک کے خوف نے اُنہیں جڑ سے نہ اکھاڑ پھینکا گیا۔ مدینے میں بھی جتنے کھجوروں کے باغ ہیں اُن میں سے بیشتر عہد نبویؐ میں بھی موجود تھے۔

چنانچہ رانونا مسجد کے کھنڈر بھی کھجوروں کے جس وسیع باغ کے اندر موجود تھے اُنہی زمانوں کا تھا جب قصویٰ کا سوار اپنے یار غار ابو بکر کے ہمراہ اُن کے سائے میں رکھا تھا۔ اور مدینے کے نواح میں پہلی نماز جمعہ ادا کی تھی۔

”یہاں لوگ آتے ہیں؟“ فیاض نام کا ایک سندھی نوجوان تھا جو چٹائیوں پر کھجوریں پھیلا رہا تھا میں نے اُس سے دریافت کیا۔

”نہیں سائیں۔“ وہ مسکرانے لگا۔ ”ادھر کون آتا ہے۔ آپ تو مولا بخش کے ساتھ ادھر آ گیا ورنہ ہم پھاٹک نہیں کھولتے۔ ہمارا شیخ ذرا غصے کا برا ہے۔ آپ بھی ذرا جلدی سے دیکھو اور چلے جاؤ۔ آپ مہمان ہیں پر سائیں ہم مجبور لوگ ہیں۔ پیٹ پالنے کے لیے شیخ کا غصہ سہتے ہیں۔“

”یہ مسجد نو نہ نوں ہے کیا ہے؟“

”نہیں معلوم سائیں۔ اس جگہ پر کچھ ہے تو سہی۔ ہم اس کھنڈر کے پتھر نہیں ہٹاتے۔“

”لوگ زیارت کے لیے نہیں آتے؟“

”نہیں سائیں۔“

نہ صرف مسجد کے کھنڈر میں بلکہ کھجور کے درختوں کی گھناٹ کے نیچے بھی ڈھیروں کھجوریں سوکھ رہی تھیں۔

دشتر درخت تو قد آور تھے جسے کھجور کے درخت کہتے ہیں۔ اونچے اور پتلی سے باہر لیکن

نماز جمعہ پڑھائی۔“ (یکمل)

”رسول اللہؐ بہ مقام قباً۔ عمرو بن عوف کے محلے میں دو۔ چہار اور پنج شعبہ تشریف فرما رہے اور اُن کی مسجد کی بنیاد ڈالی۔ جمعہ کی نماز آپؐ نے اس مسجد میں ادا فرمائی جو وادی رانونا کے درمیان ہے۔ جمعہ کی یہ پہلی نماز تھی جو مدینہ میں آپؐ نے ادا فرمائی۔ وادی رانونا مدینہ منورہ کی ایک وادی ہے جو وادی بطنان میں آلتی ہے۔“ (ابن ہشام)۔

”جمعہ کی صبح کو وہ قباء سے باہر نکلے۔ اور دوپہر کے وقت وہ اپنے ساتھیوں سمیت وادی رانونا میں نماز کے لیے ٹھہرے۔ وہاں قبیلہ خزرج اور بنی سالم کے لوگ اُن کے منتظر تھے۔ یہ پہلی نماز جمعہ تھی جو انہوں نے اُس وطن میں پڑھی جو اب اُن کا گھر تھا۔ اُن کے کچھ عزیز بنی نجار قبیلے سے تھے اور بنو امر اُن کے ہمراہ قباء سے چلے تھے۔ یوں اُن کی کل تعداد سو کے لگ بھگ تھی۔ نماز کے بعد رسول اللہؐ قصویٰ پر سوار ہوئے اور ابو بکر کے ہمراہ مدینہ کی جانب روانہ ہو گئے۔“ (مارٹن لنگز)

رانونا کے مندرجہ بالا جتنے حوالے ہیں یہ سب کے سب وطن واپسی پر میں نے دریافت کیے لیکن اُس لمحے جب میں کھجوروں کے جھنڈ کے درمیان میں بکھرے ہوئے پتھروں کو چھوتا تھا تو قطعی طور پر اُن کی تاریخی اہمیت سے آگاہ نہ تھا۔ بابا فقیر نے بس اتنی خبر کی تھی کہ حضورؐ نے کبھی یہاں دعا کی تھی اور یہاں جو بھی دعائیں گئے وہ قبول ہو جاتی ہے۔ جب نہیں واپس آ کر میں بابا فقیر کا شکر گزار ہوا کہ وہ مجھے ایسے مقام تک لے گیا جہاں کم ہی لوگ گئے ہوں گے اور جس کا کوئی تذکرہ میں نے موجودہ دور کی کسی کتاب میں نہیں پڑھا تھا۔

یعنی سو کے لگ بھگ لوگ قباء سے چلے آتے ہیں بنو امر اور بنو نجار کے۔ اور اُن کے آگے قصویٰ ہے جو پھنس پھنس کر پیلی جاتی ہے۔ اور اُس پر سوار بن اُس شہر کو بڑھتے ہیں جس نے اُن کے ”رسول اللہؐ“ کو دیکھا تھا اور رانونا میں رانونا کی وادی ہے تو وہ نماز جمعہ کے لیے وہاں

پوٹلی کو اپنے سینے سے ایسے لگا لیا جیسے نگلی ادا کو ایک مدت کے دھوڑے کے بعد گلے لگاتے ہیں۔ اور مدینہ کے قیام کے دوران محال ہے جو اس نے اس پوٹلی کو اپنے سے جدا کیا ہو۔ اپنی گرفت ڈھیلی کی ہو۔

میں نے سبب پوچھا تو کہنے لگی ”جب اس سندھی مزدور نے دو پوٹلیاں تو اطمینان سے ٹرنک میں رکھ دیں لیکن اس پوٹلی کو تھامے ہوئے میرے پاس آیا کہ بیگم صاحبہ اسے اپنی گود میں رکھ لیں تو میں جان گئی تھی کہ یہ عام نہیں۔ کسی اور مرتبے کی کھجوریں ہیں۔ اور مجھے خیال آیا کہ یہ سندھی مزدور کسی نہ کسی بھید سے آگاہ ہے۔ کیا پتہ مسجد رانونا کے گرد جو باغ ہے اس میں کوئی ایک ایسا درخت ہو جو حضورؐ نے اپنے ہاتھوں سے لگایا ہو اور یہ اس کی نسل کے کسی درخت کی کھجوریں ہوں۔“

عجیب ضعیف الاعتقاد بیگم تھی۔
اس نے زندگی بھر مجھے ایسے نہیں سنبھالا تھا جس چاہت سے وہ ان کھجوروں کی پوٹلی سنبھالتی تھی۔

کھجوروں کے اس باغ کو مقامی لوگ ”باغ ترکی“ بھی کہتے ہیں۔ کیوں کہتے ہیں؟ یہ میں نہیں جانتا۔

یہاں کچھ نہایت بھلے لگتے مختصر قد کے درخت بھی تھے۔
کھجور کی کوئی منی ایچر نسل تھی کہ آپ ہاتھ بڑھا کر کھجوروں کے زرد گچھے توڑ سکتے تھے۔ یہ پام کے ٹھٹھنے پودوں کی مانند تھے۔

باغ کے باہر ہم جس تہتی دو پہر کو چھوڑ آئے تھے۔ اس میں دوبارہ چلے جانے اور جھلنے کو جی نہ چاہتا تھا۔

گھنے چیر دیں پتے دو پہر کی تمازت کو اوپر ہی اوپر برداشت کرتے اس کی دھوپ کو ہم تک نہ آنے دیتے تھے۔

البتہ مسجد رانونا کی ڈھچکی دیواریں اور محراب کے آثار دھوپ میں روشن تھے۔
اس بے نام بے چہرہ غصیلے شیخ کے آنے کا وقت ہو رہا تھا کیونکہ سندھی مزدوروں کے چہروں پر پریشانی کی گھڑی ٹک کر تکی جاتی تھی۔

ہمیں آج جو بھی شیخ ملتا تھا غصیلے شیخ ہی ملتا تھا۔
ہم اس کسج رانونا سے نکل آئے۔

نکلے تو فیاض اور اس کے دوست بھی ہمارے ہمراہ نکل آئے۔ وہ مسجد رانونا کے گرد پھیلے ہوئے کھجوروں کے باغ میں سے اتاری گئی کھجوروں سے بھری تین پوٹلیاں بھی لے آئے۔ ہمارے لیے کہ سائیں آپ ہمارے مہمان ہیں۔

فیاض نے ہمیں آگاہ کیا کہ۔
ایک پوٹلی میں ”امبر“ قسم کی کھجوریں ہیں۔

دوسری میں قلمی کھجوریں تھیں جو بھاری اور میٹھی ہوتی ہیں اور انہیں عرف عام میں کلمے والی کھجوریں بھی کہا جاتا ہے۔

اور تیسری پوٹلی میں کون سی کھجوریں تھیں؟ حضورؐ کے دہن مبارک میں گھل جانے والی ان کی من پسند اجوئی کھجوریں تھیں۔

ہم نے کار کا ٹرنک کھول کر فیاض سے کہا کہ وہ ان پوٹلیوں کو اس میں رکھ دے کیونکہ اندر جگہ نہیں تھی۔ تو اس نے ان میں سے ایک پوٹلی الگ کر کے میونہ سے کہا ”بیگم صاحبہ ان کھجوروں کو اپنی گود

میں رکھ لیں۔“
شاید وہ اجوئی کی پوٹلی تھی یا کوئی اور وجہ تھی۔

میں نے ان پوٹلیوں کی گواہی لی کہ کار تک پہنچا اور ہوا اور پھر اس نے اس

”ابا فقیر۔ پانی کیسے رستا تھا۔ مٹی کیسے گیلی ہوتی تھی۔“ میں نے ذرا عاجزی بھی اختیار کر لی
”اس کے پاس ایک خزانہ تھا۔“

”ادھر مدینے میں قدرتی طور پر۔ زیر زمین۔ چٹانوں اور ریت کے اندر جہاں کہیں پانی
کا ذخیرہ ہوتا تھا تو اوپر کی زمین گیلی رہتی تھی اُس میں سے پانی رستا رہتا تھا تو اہل مدینہ صرف وہاں
کنواں کھودتے تھے۔ اس لیے تب مدینے میں کل پندرہ بیس کنویں ہوں گے۔ ان کا پانی کبھی خشک
نہیں ہوتا تھا کہ زیر زمین یہ جہاں کہیں سے بھی آتا تھا اس کی سپلائی جاری رہتی تھی۔ جیسے زمزم کا
کنواں ہے۔ اسی لیے نبی پاکؐ کے زمانے میں جتنے بھی کنویں تھے۔ اُن میں سے جتنے باقی ہیں ان کا
پانی ابھی تک چل رہا ہے۔“

اس موقع پر اگرچہ ڈرتے ڈرتے اپنی ہاری ہوئی عزت نفس کی کچھ بحالی کے لیے مولابخش
نے ہمیں بتایا کہ ادھر ایک کنواں ایسا تھا جہاں حضورؐ پاک آیا کرتے تھے اور لوگ تہرک کے طور پر اُس کا
پانی گھر لے جاتے تھے چنانچہ سعودیوں نے اسے شرک قرار دے کر اُسے پاٹ دیا۔ مٹی اور پتھروں سے
بند کر دیا اور اس کے باوجود اُس کا پانی سطح کو گیلیا کرنے لگا اور پھوٹنے لگا تو پھر وہاں سینٹ اور بجری کی تہہ
بمبار کر بند کیا گیا۔ ورنہ وہ تو بند نہ ہوتا تھا۔ ابا فقیر درست کہتا ہے کہ ادھر ایک بار کنواں کھودو تو وہ ہمیشہ کے
لیے چالو ہو گیا سائیں۔

”لیکن ہم کس کنویں پر جا رہے ہیں؟“
”مہر نہیں کرتے۔“ ابا فقیر نے صرف اتنا کہا۔

یہ ایک اور تقریباً ویران علاقہ تھا۔
بہت آباد گھنی آبادی والا نہ تھا۔ شاہراہ بھی ویران تھی۔ دھوپ کی وجہ سے شاید۔ یا ادھر آنے
والے لوگ کم تھے کیونکہ یہ شہر کی گہما گہمی سے دور تھا۔
”روکو۔“ ابا فقیر نے کہا۔

اور اس بار مولابخش نے کچھ تعرض نہ کیا اور کار فوراً روک دی۔
دائیں جانب شاہراہ سے ذرا ہٹ کر ایک تین چار منزلہ سرکاری سی عمارت تھی اور ہم کار سے
اُتر کر اس عمارت کے قریب ہو گئے۔ اُس پاس کسی کنویں کے کچھ آثار نہ تھے۔ نہ کہیں بیلوں کے گلے
میں بندھی گھنٹیوں کی آواز تھی اور نہ کہیں راہت کے چلنے کا کوئی متواتر ترنم تھا اور نہ ہی پانی کی شرابور کوئی

”جو تو دریائے مے ہے تو میں خمیازہ ہوں

ساحل کا۔ بیس غرض کے کنویں کے

پانیوں پر حضورؐ کے ہونٹ اور میری آنکھیں“

اب جو سفر شروع ہوا ہے تو ابا فقیر ایک جیتا ہوا کھلاڑی تھا جو ایک چشمِ حقارت سے ہارے
ہوئے مولابخش کو دیکھتا تھا کہ۔ میں نہ کہتا تھا اُس باغ کے اندر ایک کھنڈر ہے۔ نو نہ فونہ۔ بلکہ وہ ہم پر بھی
مکمل طور پر حاوی ہو چکا تھا اور ہم اُس کی مرغوبیت کے تابع ہو کر ذرا جان کی امان پا کر پوچھتے تھے۔ ابا
فقیر اب کہاں جائیں گے۔

تو وہ رعونت سے بولا اور عصا کار کے فرش پر کھٹکٹا کر بولا ”کنویں پر جائیں گے“
”کون سے کنویں پر؟“

”آپ مہر نہیں کرتے تارڑ صاحب۔ بات پوری نہیں سنتے اور بول پڑتے ہو۔ ادھر مدینہ
شریف میں حضورؐ کے وقتوں میں بہت سے کنویں تھے۔ مکہ تو نہیں تھا مدینہ تھا۔ اور سنو کہ اُن کنوؤں میں
اب تک میٹھا اور ٹھنڈا پانی ہے۔“

”اچھا۔“ میں پھر نزوس ہو گیا۔ ”حضورؐ کے وقتوں کے کنویں ہیں اور چودہ سو برس گزر جانے
کے بعد بھی اُن میں اب تک۔ پانی کیسے ہو سکتے ہیں۔“

اس بار ابا فقیر نے مجھے بے مہربانی کا طعنہ نہ دیا اور اطمینان سے کیونکہ وہ جیتا ہوا تھا کہنے لگا
”دیکھو۔ ادھر ہمارے پنجاب میں جدھر بھی کنواں کھودو پانی نکل آتا ہے۔ پانچ پائندوں میں سے کسی ایک
کا پانی نکل آتا ہے۔ ادھر مدینے میں بے شک برکت ہے لیکن اُس پاس تو صحرا ہے اور پیاس ہے تو ادھر
ہر جگہ پانی نہیں نکلتا۔ ادھر کے لوگ صرف اُس مقام پر کنواں کھودتے تھے جہاں سے پانی رستا تھا۔ مٹی یا

جسدِ مبارک کو لٹھلایا۔

تو یہ کون سا کنواں تھا؟

اسے میری لاپرواہی خیال کر لیجیے یا اسے ایک جانا بو جھائل سمجھ لیجیے کہ میں نے سیرت النبی کی چند کتابوں کا مطالعہ کرتے ہوئے نوٹس تیار نہ کیے تھے کیونکہ میں اس تحریر کو تحقیق کے حوالوں سے جوہل نہیں کرنا چاہتا تھا اور صرف محسوسات اور جذبات کو بیان کرنا چاہتا تھا۔ ورنہ میں اس کنویں کو فوری طور پر جان جاتا۔ بہر حال اس میں کوئی شبہ نہ تھا کہ حضور کا گزر ادھر سے ہوتا تھا وہ بہر طور یہاں رکے تھے۔ اُن دنوں مدینہ اور قباء کے درمیان ایک نیم صحرائی کیفیت ہوا کرتی تھی اور وہ جو چوڑے شانوں والے تھے اور جن کی ہنسی اور آہل پس میں ملی ہوئی تھیں اور چلتے تھے تو تیز۔ جیسے اُترائی اُترتے ہوئے چلتے تھے اور جن کی پگڑی میں سے اُن کے گیسو سیاہ دکھائی دیتے تھے تو وہ۔ یہاں کچھ دیر قیام کرتے تھے۔ اور اُس سامنے والے چھتر تلے جو پوشیدہ کنواں ہے اُس کے پانیوں سے پیاس بجھاتے تھے۔ جو ایک کھڑکی کھلی تھی اُس کنویں میں جھانکنے کے لیے تو وہ بھی بند کر دی گئی تھی۔ تو اُس کا نظارہ کیسے ہو۔ حالانکہ میں تو کوئی ایسا عقیدت مند نہ تھا۔ حضور کی یاد میں رونے دھونے والا نہ تھا، کبھی کبھار مسکرانے والا تھا۔ اور شرک کرنے والا تو ہرگز نہ بلکہ شک کرنے والا تھا تو اس کے باوجود یہ کھڑکی کیوں بند کر دی گئی تھی۔

میں اس چھتر اور اینٹوں کی نیم گولائی کے قریب ہو کر اُس دھوپ میں کھڑا رہا۔ باقی سب لوگ کار میں منتظر تھے۔ سوچتا رہا کہ کیا کروں۔ ان اینٹوں کو چھو کر اطمینان حاصل کر لوں جن کے اندر جانے کوئی کنواں ہے بھی یا نہیں۔ یہ کیسی دیوار گریہ ہے کہ اس کے اندر جو کچھ ہے میں اُس میں جھانک بھی نہیں سکتا۔

میں اسی ادھیڑ بن میں مبتلا تھا کہ شاہراہ پر سے ایک پرانی کار اتری اور اُس چھتر سے ملحقہ سرکاری عمارت کے قریب آن رکی۔ کار میں سے پاکستانی شاہت کے دو نوجوان اُترے۔ اُنہوں نے مجھ پر ایک سرسری نگاہ کی اور مجھے پہچان کر میرے پاس چلے آئے۔ ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے کہ کب آئے کیسے آئے اور یہ براہ میں ایک پاکستانی سکول کی عمارت ہے جہاں ہم پڑھاتے ہیں تو آئیے جائے گا ایک کپ ہو جائے۔ اور اس دوران اُنہوں نے ایک بار بھی اُس چھتر کی جانب نگاہ نہ کی تو میں نے دھوپ میں کھڑے جس قدر ممکن تھا خوشدلی سے اُن کے سوالوں کے جواب دیئے اور پھر اپنی آمد کا مقصد بیان کیا۔

”اچھا تو یہ کنواں؟“ وہ ذرا ہنسے۔

سرگوشی تھی جو ہمیں خبر کرتی کہ ادھر آ جاؤ۔

تو اُس لمحے مجبوراً کار میں استراحت فرماتا بابا فقیر عصائی کا ہوا اور بڑبڑاتا ہوا آ گیا۔

دھوپ کی تیزی میں کی نہیں آئی تھی۔

اکتوبر کے اوائل تھے اور پھر بھی زبان سوکھتی تھی۔ شدید گرمیوں میں۔ جون جولائی میں تو یہاں زبان پر کانٹے اُگ آتے ہوں گے۔ مدینے کے موسم اتنے بھی خوشگوار نہیں رہتے۔

اُس سرکاری عمارت کے پہلو میں ایک چھتر سا تھا۔ جس پر کانٹے کباڑ جمع تھا اور اُس کے نیچے ایک دیوار تھی جو نیم گولائی کا تاثر دیتی تھی۔

”کنواں ادھر ہے صاحب۔“

”کدھر بابا فقیر؟“

”یہ جو چھتر ہے اس کے نیچے کنواں ہے۔ وہ جو گولی دیوار ہے وہ کنویں کا حصہ ہے۔ پہلے کنواں دکھائی دیتا تھا پھر اس پر یہ ٹین کا چھتر پر ڈال کر بند کر دیا گیا۔ ابھی پچھلے سال میں ادھر آ یا تھا تو دیوار میں ایک روزن تھا جس میں جھانک کر اس کے اندر دیکھا جاسکتا تھا پھر اُسے بند کر دیا گیا کہ لوگ جھانکتے تھے۔“

”کیوں جھانکتے تھے بابا؟“

”روایت ہے کہ جب حضور مدینے سے قباء کی بستی کو جاتے تھے یا وہاں سے لوٹتے تھے تو یہ کنواں درمیان میں پڑتا تھا اور وہ سستانے کی خاطر یہاں رکے تھے۔ مندر پر آرام کرتے تھے۔ اس کا پانی پی کر تازہ دم ہوتے تھے اور پھر سفر اختیار کرتے تھے۔“

بابا فقیر میری نظروں میں مزید معتبر ہو گیا۔

لیکن کنویں تو بہت تھے تو یہ کون سا والا کنواں ہے۔

مجھے اب بھول رہا تھا کہ سیرت النبی کی کون سی کتاب میں نے ایک ایسے کنویں کا ذکر پڑھا تھا جس کی مندر پر پریشہ کر حضور اپنے پاؤں اُس میں لٹکا کر ٹھنڈک محسوس کرتے تھے۔ یعنی کنویں کے پانی اتنے بلند ہوتے تھے کہ اُن کے پاؤں چھوتے تھے۔ ایک اور کنویں کے بارے میں بھی درج ہے کہ اُس کا پانی کروا کر آمد ہوا تو حضور نے پانی میں بھر کر اُسے منہ میں ڈالا اور پھر کلی کر کے اُسے کنویں کو بخش دیا تو اُس کے پانی ہمیشہ کے لیے ٹھنڈے ہو گئے۔

ایک اور روایت کے مطابق حضور نے وحیت کی کہ اُن کے وصال پر انہیں فلاں کنویں کے پانیوں سے غسل دیا جائے اور حضرت علیؓ اسی کنویں سے پانی لے کر آئے اور حضورؐ کے

میں نے اس پتھر کو ہر اسود کے تقدس سے دیکھا۔ مجھے وہ بہت قیمتی لگا۔
میں دیوار کو تمام کر اس پر چڑھا تو جہاں تک میری آنکھیں پہنچیں وہاں واقعی ایک شکاف
تھا۔

میں نے ذرا احتیاط سے اپنا سر اس شکاف کے اندر کیا۔
میرا سر ابدن تو باہر کی دھوپ میں تھا لیکن گردن تک جو میرا چہرہ تھا وہ شکاف کے اندر کی نیم
تاریکی میں چلا گیا۔ جیسے مسجد قرطبہ میں داخل ہونے پر روشنی کا واحد منبع اُس کا پھانک بند ہو گیا تھا اور میں
اُس ہیوم تخیل میں یکدم تابیٹا ہو گیا تھا کہ آنکھیں صحن نارنجستان کی دھوپ کے بعد مسجد کی نیم تاریکی سے
آشنا ہونے سے جھجکتی تھیں۔ ایسے مدینے کی تیز دھوپ کی چکا چوند کے بعد آنکھیں یکدم اس شکاف کے
اندر جو اندھیرا تھا اُس میں کھلیں تو بنا کچھ دیکھے کھلی رہیں اور پھر کچھ ساعتوں کے گزرنے سے
انہیں عادت ہوئی اور کچھ کچھ نظر آنے لگا۔

کنویں کی گولائی کو ڈھانکنے والا چھتر بہت خستہ تھا اور اس میں سے دھوپ کی چند
کرہیں۔ دیوار اور چھتر کے درمیان جو رخنے تھے اُن میں سے داخل ہوتی تھیں لیکن اندر کی تاریکی پر اُن
کا کچھ اثر نہ ہوتا تھا۔

کنویں کا وجود جہاں سے میں اُسے دیکھتا تھا تقریباً پانچ چوٹ نیچے تھا یعنی سطح زمین کے
قریب۔ وہ گولائی جو باہر سے نظر آ رہی تھی کنویں کی نہ تھی بلکہ اس کے گرد جو حفاظتی دیوار تھی اُس کی تھی۔
کنویں کی منڈیریں چوڑی تھیں۔ مستطیل پتھروں سے تعمیر شدہ جو کیلے تو نہ تھے لیکن کہیں
گہرائی میں سے جو نمی سرايت کرتی اوپر آتی تھی وہ اُن پر اثر کرتی تھی۔ منڈیر اتنی چوڑی تھی کہ اس پر
آسانی سے بیٹھا جاسکتا تھا۔ پتھروں کی ٹھنڈک محسوس کرتے ہوئے کنویں میں ٹانگیں لٹکا کر لطف اٹھایا
جاسکتا تھا۔ میں باہر کی دھوپ میں رکھے پتھر پر اپنے آپ کو سنبھالے اُس مختصر شکاف میں جو ایک پتھر یا
پسندہ تھا اُس میں اپنی گردن ڈالے اندر مزید سے مزید جھانکنا چاہتا تھا اور مجھے لگتا ہے کہ اُس لمحے میری
گردن کچھ زیادہ لمبی ہو گئی تھی کہ میں کنویں کے کافی زدہ نیم سیاہ مستطیل پتھروں کی گولائی کی گہرائی میں
اپنی آنکھیں اُتارتا چلا جاتا تھا۔ بے شک میں یہاں رہ جاؤں لیکن میری آنکھیں اس کی تہ تک اُتر
جائیں وہاں تک جہاں اس کے پانی ہیں۔ اگر ہیں تو۔ اور اُن پانیوں میں میری دو آنکھیں سیاہ تھلیوں
کا مانند میریں۔ بے شک یہ عمر رسیدہ اور پڑمرہ ہیں۔ ان کے پروں کے رنگ پیکھے پڑ چکے ہیں لیکن جب
ان کو یہ احساس ہوگا کہ وہ کس پانی پر تیرتی ہیں جس پر شاید ہمارا کب تیرے تھے۔ اُن کے سانسوں کی
گری حیرتی تھی تو یہ نوخیز اور رنگ ریلی ہو جائیں گی۔ اُس منور سے کے رنگ کی جو خانہ کعبہ کے سیاہ علاف

”جی ہاں۔ حضورؐ کے زمانے کا ہے۔“

”جی۔ شاید۔“

”شنید ہے کہ دیوار میں تھوڑی سی جگہ ہوا کرتی تھی جس میں سے جہاں تک اس کنویں کو دیکھا
جاسکتا تھا۔ اور اب وہاں اینٹیں چُن دی گئی ہیں۔“

”ہاں جی۔“ ایک نوجوان بولا۔ ”تارڑ صاحب لوگ اس میں جھانک کر پتہ نہیں کیا کیا پڑھتے
رہتے تھے اور شرک کے مرتکب ہوتے تھے اس لیے۔“

”بھائی میں تو کوئی راسخ العقیدہ قسم کا بندہ نہیں ہوں۔ محض تاریخی تجسس کا مارا ہوا بے شرک
فحش ہوں۔ بس ایک نظر اس کنویں میں جھانک کر کچھ پرانے زمانوں کی ٹھنڈک محسوس کرنا چاہتا تھا۔ بقاء
جاتے ہوئے صاحب یہاں رکتے تھے اس کے پانی پیتے تھے تو۔ محض تاریخی تجسس۔“

”اب تو یہ ممکن نہیں رہا۔“

”جی۔ تو پھر اس کے باہر جو گولائی ہے وہ بھی کسی قدیم دیوار کی لگتی ہے تو اسے ہی قربت سے
دیکھ لیتے ہیں۔“

ان نوجوانوں نے آپس میں کچھ کھسر پھسری۔ اگر وہ مدینے کے ایک پاکستانی سکول میں
پڑھاتے تھے تو یقیناً حکومت کے تمام اقدامات کے آگے سر جھکاتے تھے اور شاید عقیدے میں بھی اُس
کی پیروی کرتے تھے۔

”ادھر آئیے۔“ دوسرے نے سر جھٹک کر اشارہ کیا۔

ویسے اُن دونوں کو پہلے پہل تو مجھ سے ملنے کا چاؤ تھا لیکن اب دھوپ کی تیزی اُن کے چاؤ کو
نڈھال کرتی تھی اور وہ جلد از جلد مجھ سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے تھے۔

کنویں کے یہ آثار ایک دیوار سے منسلک تھے۔ اس کی گولائی کو وہ چھتر ڈھلکتا تھا جس پر کچھ
کاٹھ کھاڑ پڑا تھا۔

قریب ہی ایک چھوٹا سا پتھر تھا جسے ایک نوجوان نے اٹھایا اور کنویں کی دیوار کے ساتھ رکھ دیا
”آپ اس پر چڑھ جائیں۔ دیوار اور چھتر کے درمیان میں تھوڑی سی جگہ ہے آپ ذرا کوشش کر کے اُس

میں سے نیچے جھانک سکتے ہیں۔“

میں جان گیا کہ وہ پتھر یونہی بے مقصد ادھر نہیں پڑا ہوا تھا۔ شاید یہی نوجوان اُس کی مدد سے
اوپر نیچے ہو کر کنویں میں جھانکتے ہوں گے اور انہوں نے آپس میں کھسر پھسرایا ہے کہ اس فحش کو اس
راز میں شامل کیا جائے یا نہیں۔

پانی جی منڈیر پر بیٹھے ذرا جھک کر اپنی دونوں تسلیوں کو دعا کے انداز میں جوڑ کر ان میں پانی بھر لیتے ہوں گے۔ میں نے ایسے کنویں دیکھے ہیں جن کے پانی برسات کے دنوں میں کناروں تک آ جاتے تھے۔ ویسے بے شک اس کنویں کے پانی پاتال میں ہوتے۔ اس کے باوجود اگر وہ چاہتے تو پانی جہ کی تاریکیوں میں سے اُبل کر اتنی بلندی پر آ جاتے کہ دھوپ سے روشن ہو جاتے اور وہ ہاتھ بڑھا کر اپنی پیاس بجھا لیتے۔ اگر وہ انسانوں کے ساتھ ایسا کر سکتے تھے تو پانیوں کی تو کچھ حیثیت نہ تھی۔

میں دیکھ تو نہ سکتا تھا۔ لیکن جانتا تھا کہ آنکھوں کی سیاہ تیلیوں کا تہہ میں موجود پانیوں پر تیرنے والے بھرتا تھا۔ اگر اُن کا اختیار ہوتا تو وہ وہیں رہ جاتیں۔ میں انہیں وہیں رہ جانے دیتا تو عمر بھر دیکھتا کیسے اس لیے میں نے انہیں واپس بلا لیا۔ وہ پھڑ پھڑا کر پھر سے میرے چہرے کا ایک حصہ بن گئیں لیکن اُن کے مہین پاؤں اور پروں پر جو تڑپوندیں تھیں اُس پانی کی جس میں تیر کر وہ آتی تھیں اور جس میں بابا کے ہاتھ تیرے تھے انہوں نے میرے چہرے کو بھی غم کر دیا۔ میرا اُجڑا ہوا روپ رنگ رنگلا ہوا گیا۔

میں نے ایک گہرا سانس اُس نیم تاریک فضا میں سے کشید کیا اور اس کشید کا شمار عمر بھر کے لیے کافی تھا اور اپنے چہرے کو مجبوراً بابا کے زمانوں سے جدا کر کے اُس شکاف میں سے نکال کر لے کر وہاں کی گڑی دھوپ میں لے آیا۔

اس کنویں کا نام "بیر غرس" یا "بیر غرس" بتایا گیا۔

اور اس "بیر غرس" کے پانیوں کی پیاس اب تک ہے۔

پر براجمان تھا۔ وہاں اُس کے پروں تلے خدا کا گھر تھا اور یہاں ان کے پروں تلے اُس کے رسول کے لب تیرے تھے۔ اب اس کا فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ ان ہردو میں سے زیادہ قسمت والا کون ہے۔ وہ چھنور یا میری آنکھوں کی دو تلیاں۔

بے شک میری گردن لمبی ہو چکی تھی لیکن اس کے باوجود میں کنویں کے پاتال تک نہیں دیکھ سکتا تھا۔

میری نظروں کے سامنے کنویں کی پتھریلی گولائی کا جو حصہ تھا وہ چند میٹر نیچے تک ہی دکھائی دیتا تھا۔ اور نیم تاریکی میں ہی نظر آتا تھا۔

اس حصے کے پتھر بھی جسامت میں خاصے بڑے تھے اور جہاں جہاں وہ آپس میں جڑے تھے وہاں وہاں سے اُن میں کچھ پودے اور پتے پھوٹتے تھے۔ جیسے ہمارے ہاں پرانے کنوؤں کی اینٹوں کے درمیان میں سے پتیل کے پتے پھوٹتے ہیں۔ ہری گھاس کی ایک دو لڑیاں نکلتی تھیں۔ اور ان کی نمود گواہی دیتی تھی کہ پاتال میں کیسی نمی ہے جو ان کو پنبھتی ہے۔

اُس لمحے ایک نامعلوم ہی ٹھنڈک سے شرابور ہوا۔ نہایت مدھم اور ہلکی جو کبھی محسوس ہو جاتی اور کبھی واہمہ لگتی اور مجھ تک آئی اور میری لمبی گردن کے آگے اشتیاق سے بے وقوف ہوتا جو چہرہ تھا اُسے چھوٹی خبر کر گئی کہ کنواں ابھی تک نہیں سوکھا۔ اس کی تہہ میں پانی ہیں جو تمہیں یہاں سے نظر نہیں آ سکتے۔

اب میں اُس خبر کرتی ہوا کو کیسے آگاہ کرتا کہ تم اُس پانی پر تیرتی جو سیاہ تلیاں دیکھ کر آئی ہو وہ میری آنکھیں ہیں۔

اُس مقام اور اُس لمحے میں جب میرا پورا بدن 2002ء کی دھوپ میں تھا اور میرا چہرہ سن بھری کے پہلے سال میں تھا۔ تصور کے بلیک بک سیاہ ہرن بے قابو ہوئے جاتے تھے۔ فلاںچیں بھرتے ہوئے اُس منڈیر کے پاس جا کر اپنی ہرن آنکھیں قصویٰ کے اُس سوار پر دھرتے تھے جو قبا کے راستے پر کچھ دیر سستانے کی خاطر دو گھونٹ پانی پینے کی خاطر وہاں بیٹھا ہوا تھا۔ انہیں اپنی آنکھوں پر۔ اپنی چشم آہو پر ناز تھا تو اُس مسافر کی آنکھیں دیکھ کر شرمندہ ہوتے تھے۔ اپنے بدن کی ملائمت اور خوبصورتی پر فخر تھا تو اُس کے بدن کو دیکھ کر نام نہوتے تھے۔ تھو تھنیاں اٹھائے اُسے حیرت سے دیکھتے تھے۔

صاحب اس کنویں سے پانی کیسے پیے ہوں گے؟

یقیناً اُس زمانے میں اس پر ایک چڑھوی آویزاں ہوگی جس پر ایک دی لپٹی ہوگی جس کے آخر میں پڑے گا ایک بوکا ہوگا اور ہمارے صاحب چڑھوی ڈھلی کر کے بڑے کو پانیوں میں ڈبوئے

ہوں گے اور پھر اُسے گہرا کر دیا جائے گا۔ اور پانی پیتے ہوں گے

نماز کے بعد میں نفل ادا کرنے کی خاطر مسجد قباء کے اس منبر کے قریب چلا گیا جس کے بارے میں مجھے اب جا کر علم ہوا تھا کہ یہ مسجد نبویؐ سے یہاں لایا گیا تھا اور منبر رسولؐ ہے۔ یہ مسجد قباء کے محلے میں یوں آیا کہ مسجد نبویؐ کے لیے ایک نیا منبر تخلیق کر لیا گیا تھا۔
یہ سادہ اور سنگ مرمر کی سفیدی میں ڈھلا منبر تھا۔ سجدہ کرتے ہوئے سنگ مرمر کی سختی نرمی میں بدل جاتی تھی۔

مسجد قباء میں ظہر کی وہ نماز اور متعدد نوافل میری یاد میں استنہ واضح نہیں ہیں جتنا واضح وہ سیاہ لٹام۔ براق لباس میں لپٹا وہ امام ہے جس نے نماز پڑھائی۔

نماز سے فارغ ہو کر اُس نے کُرخ ہماری جانب کیا اور آلتی پالتی مار کر ہم سے باتیں کرنے لگا۔
بہت مدھم اور شائستہ۔ نرم ترین لہجے میں۔ اُس ٹھنڈک کی طرح آسودگی دینے والے لہجے میں جو ہر غرض میں جھانکتے ہوئے میں نے محسوس کی تھی وہ ہم سے۔ اُن چند لوگوں سے جو نماز کے بعد اُجھٹے رہے تھے باتیں کرنے لگا۔
اور باتیں بھی اُسی ٹھنڈک کے بارے میں کرنے لگا۔

یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اُس نے جان لیا ہے کہ یہ جو سامنے بیٹھا ہوا شخص ہے اس کی دونوں آنکھیں ایسی سیاہ تھلیاں ہوئی تھیں۔ اُن پانیوں پر تیری تھیں جن میں حضورؐ کے لب تیرے تھے تو وہ مجھ سے ہی مخاطب تھا۔

میں مبہوت ہوا سنتا رہا۔ اگرچہ زبان عربی تھی لیکن اس کے باوجود کہیں کہیں کوئی آشنا لفظ ایسا آ جاتا کہ میں مفہوم کا اندازہ لگا لیتا۔

استنہ پیار سے۔ اتنی آشتی اور امن سے۔ استنہ بزرگ ٹھہراؤ سے وہ سیاہ فام۔ حضرت بلالؓ کا ہمائی نہایت دھیرج سے حضورؐ کی باتیں کرتا تھا۔ اور مجھے وہ سعودی نوجوان یاد آتا تھا جو خانہ کعبہ کی جانب ہاتھ اٹھا کر یوں قرأت کرتا تھا جیسے براہ راست اللہ سے مخاطب ہو۔ ایسے یہ پراثر بزرگ یوں باتیں کرتا تھا جیسے حضورؐ موجود ہوں اور وہ مودب ہو کر ایک گہرے عشق میں مبتلا اُن کی موجودگی کے تاثرات ہم تک پہنچاتا تھا۔ اور مجھے چیخنے چلاتے ڈراتے دھمکاتے اپنے وہ خطیب یاد آئے جو بدگمان کرتے ہیں بلکہ بے ایمان کر دیتے ہیں۔

وہ حضورؐ کی حیات کے شب و روز یوں ہمارے سامنے بیان کر رہا تھا جیسے آنکھوں دیکھا حال بیان کر رہا ہو۔ اور اس کی تاثیر بھی آنکھوں کی تھلیوں پر اثر کرتی اُن کے پر کیے کرتی تھی۔

”برادر بلال مسجد قباء میں رسولؐ کی باتیں کرتے ہیں“

ظہر کا وقت ہوا تو ہم مسجد قباء کے آس پاس تھے۔

مسجد کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے دائیں جانب ایک چار دیواری کے اندر ادھر ادھر کچھ پتھر بکھرے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور یہ قباء کا قدیم قبرستان ہے۔ جانے اس میں کون کون سے حضورؐ کی قربت سے آشنا لوگ۔ اُن لوگوں میں سے کوئی جنہوں نے قباء میں ورود پر قصویٰ کے سوار کے آگے اپنی آنکھیں بچھائی تھیں۔ جو بیتابی سے ادھر گئے تھے جدھر خبر تھی کہ مدینے کا مسافر ایک شجر تلے آرام کرتا ہے اور یہ نہ جانتے تھے کہ سائے تلے جو دو مسافر ہیں اُن میں سے کون سا محمدؐ ہے۔ اور جب ایک مسافر دھوپ میں آیا تو دوسرے مسافر نے اٹھ کر اُس پر اپنی چادر تان دی۔ تو انہوں نے جانا کہ یہ محمدؐ ہیں اور جو سایہ کرتے ہیں وہ اُن کے یار ابو بکر ہیں۔ اُن میں سے کچھ لوگ قباء کے اس قبرستان میں ہوں گے۔

میں بیان کر چکا ہوں کہ مسجد قباء کی بیرونی دیوار پر ایک تختی آویزاں ہے جس پر یہ حدیث کندہ ہے کہ یہاں دو نفل پڑھنے کا ثواب ایک عمرے کے برابر ہے۔

پورے سعودی عرب میں شاید یہ واحد تختی ہے جس پر رسول اللہؐ کی ایک حدیث درج ہے۔
ایک دوست جو دین کو سمجھتے ہیں انہوں نے اس حدیث کا جواز بتایا کہ مدینے سے بہت سے لوگ حضورؐ سے گلا کرتے تھے کہ چاہتے ہوئے بھی ہم مکہ تک کا طویل اور پرخطر سفر اختیار نہیں کر سکتے۔ چاہت رکھتے ہوئے بھی عمرہ کرنے سے قاصر ہیں تو حضورؐ نے اُن کے لیے یہ آسانی پیدا کر دی۔

صرف اسی محاسن میں نہیں بلکہ صاحب نے تو ہر معاملے میں اتنی آسانیاں عطا کر دیں کہ گنہگارے گنہگار شخص بھی آسانی سے آتش جہنم سے بچ سکتا ہے۔ یہ تو صرف کج کلاہ اور پر خشونت لہجے والے ہیں جو زندگی بھر میں اگر ایک نماز بھی قضا ہو جائے تو آپ کو جہنم میں دھکیل دیتے ہیں۔

مسجد قباء میں داخل ہو کر مینوروں کے لیے مخصوص محلے میں چل کی تھی۔

کہا، ہوگا۔ وہ ایرانیوں کے دین کے ساتھ بیجا جائے گا اور اس کا ظہور عرب میں ہوگا، جہاں وہ اپنے گھر سے ہجرت کرے گا ایک ایسی ہستی کی جانب جو وہ آتش فشانی نعلوں کے درمیان واقع ہوگی اور وہاں گھوڑوں کے باغ ہوں گے، اس کی کچھ نشانیاں عیاں ہوں گی۔ وہ تجھے کے طور پر پیش کی گئی خوراک تو کھالے گا لیکن خیرات قبول نہیں کرے گا۔ اور اس کے کندھوں کے درمیان پیغمبری کی مہر ہوگی۔“

سلمان نے اس پیغمبر کی خدمت میں حاضر ہونے کا ارادہ کر لیا اور قبیلہ کلب کے سوداگروں کو بلوایا، اگر کے ان کے ہمراہ عرب کی مسافت اختیار کی۔ لیکن جو نبی وہ بحیرہ احمر کے شمال میں خلیج عقبہ کے قریب وادی القراء میں پہنچے تو ان سوداگروں نے سلمان کو غلام کے طور پر ایک یہودی کے ہاتھوں فروخت کر دیا۔ کچھ عرصہ بعد اس یہودی نے سلمان کو مدینے کے بنو قریظہ قبیلے کے ایک عزیز کے پاس بیچ دیا۔ اور جو نبی سلمان نے مدینے پر نظر کی تو وہ جان گیا کہ وہ پیغمبر ہجرت کر کے اسی مقام پر آئے گا۔

سلمان کے نئے مالک کا ایک عزیز جو قبائلی رہتا تھا رسول اللہ کی آمد کی خبر کرنے کے لیے پہنچا۔ سلمان کا مالک اس لئے کھجور کے ایک درخت تلے بیٹھا تھا اور سلمان اس درخت پر چڑھ کر کام کر رہا تھا جب اس نے قبائلی کے یہودی کو یہ کہتے ہوئے سنا ”ایک شخص مکہ سے آیا ہے اور براہ وقت صبح کے نوں کو وہ کہتے ہیں کہ وہ ایک پیغمبر ہے۔“ یہ خبر سن کر سلمان کا پورا بدن کانپنے لگا اور اسے خدشہ ہوا کہ وہ درخت سے گر جائے گا۔ اس شام کچھ بچی کچھی خوراک لے کر وہ قبائلی کی جانب روانہ ہو گیا جہاں اس نے پیغمبر کو اپنے متعدد رفیقوں کے ہمراہ بیٹھا ہوا پایا۔ جن میں سے کچھ پرانے اور کچھ نئے تھے۔ اگرچہ سلمان قائل ہو چکا تھا لیکن پھر بھی اس نے ان کی خدمت میں کچھ خوراک پیش کی یہ کہتے ہوئے کہ یہ ہمدان کے طور پر ہے۔ پیغمبر نے اپنے رفیقوں سے کہا کہ وہ کھالیں لیکن اس نے خود اس خوراک کو کھانے لگا یا۔ سلمان کی تمنا تھی کہ وہ کسی دن مہر رسالت بھی دیکھ لے گا۔ لیکن پیغمبر کی محفل میں رہنا اور انہیں ہاتھیں کرتے ہوئے سننا ہی پہلی ملاقات کے لیے کافی تھا۔ سلمان پر مسرت اور شکر گزار مدینے والوں چلا گیا۔“

اور پھر فارس کے یہی سلمان پیغمبر کو ایک خندق کھودنے کا مشورہ دیتے ہیں اور مدینے کو چلا جاتے ہیں۔

انہیں یہ باغ اسی پیغمبر نے عطا کیا تھا جس کی تلاش میں وہ عمر بھر سرگرداں رہے۔ غلام ہاتھ گئے۔ بہت مدت نہیں ہوئی جب اس قطعہ زمین پر جواب ویران تھا۔ ایک پتے ایک بوٹے کے نیچے۔ یہاں کھجور کے وہ درخت موجود تھے جو سلمان کا باغ تھے اور پھر انہیں نابود کر دیا گیا۔

”آتش پرست کہتے ہیں اہل جہاں مجھے...

فارس کا سلمان“

فارس کے سلمان کا باغ۔

ایک چٹیل اور گرد آلود بے روح قطعہ زمین۔ جہاں ایک پتہ بھی نہ تھا۔ ایک بوٹا بھی نہ تھا۔ اور یہاں چیر ویں پتوں کے جھوم تھے۔ جھوم نکل تھے۔ انہیں سینچنے کے لیے ایک کنواں تھا اور سلمان فارسی تھے۔

اصفہان کے ایک گاؤں کے رہنے والے آتش پرست ماں باپ کے بیٹے۔ حق کی تلاش میں شام گئے عیسائیت اختیار کی۔ پھر ایک پیغمبر کی آمد کی نوید ملی تو سرزمین عرب کی جانب چل دیئے۔ غلام بنا دیئے گئے۔ قبائلی حضور سے ملاقات کرنے والوں میں سے تھے اور پھر ہمیشہ کے لیے ان کے ہو گئے۔

مارٹن لوتھر ابو بکر سراج الدین ان کی حیات کی تفصیل بیان کرتے ہیں۔

”پیغمبر کو قبائلی خوش آمدید کہنے والے بہت سے لوگ آئے جن میں مدینے کے یہودی بھی شامل تھے جو نیک ارادوں سے نہیں تجسس کی خاطر آئے۔ لیکن دوسری یا تیسری شب ایک ایسا شخص آیا جس کی وضع قطع دوسروں سے سراسر مختلف تھی۔ صاف ظاہر ہوتا تھا کہ نہ وہ عرب ہے اور نہ یہودی۔ سلمان اس کا نام تھا۔ وہ اصفہان کے قریب ایک گاؤں ہے جس میں ایرانی آتش پرست والدین کے گھر پیدا ہوا۔ نوجوانی میں ہی اس نے عیسائیت اختیار کر لی اور شام چلا گیا۔ وہاں اس نے ایک صوفی بزرگ ہشپ کی صحبت اختیار کی جس نے بستر مرگ پر اسے وصیت کی کہ وہ اب موصل کے صوفی ہشپ کے پاس چلا جائے۔ سلمان نے وہاں سے شمالی عراق کی جانب رخ کیا۔ جہاں وہ مختلف چسائی راہوں کی رفاقت میں راہروان میں سے آخری نے بھی اپنے بستر مرگ پر اسے بتایا کہ یہی وہ زمانہ ہے جب ایک پیغمبر کا

البتہ کنواں باقی تھا۔ لیکن اُس کے دن بھی پورے ہوئے کو آ رہے تھے۔ وہ مسلمان کی یادوں کا آخری مہمان تھا اور چند روزہ تھا۔ رخصت ہوا چاہتا تھا۔

جہاں ہماری کارکھڑی تھی۔ اُس کے دائیں جانب وہ باغ ہوا کرتا تھا۔ اور بائیں ہاتھ پر کسی سکول کی نئی عمارت کا ڈھانچا بلند ہو رہا تھا۔ اس کے گرد آہنی جالیوں کا حفاظتی جنگل تھا۔ اور اس کے اندر وہ دور سے نظر نہ آتا تھا۔ قریب آنے پر لوہے کے شہتروں۔ سیمنٹ اور سلاخوں کے درمیان قید وہ کنواں نظر آ جاتا تھا۔ عمارت کے مکمل ہونے پر اسے اوجھل ہو جانا تھا۔ اُسے برقرار رکھنے کا کوئی موہوم سا ارادہ بھی ہوتا تو اُسے عمارت کے رقبے میں شامل ہی نہ کیا جاتا۔ اگرچہ ابھی یہی تاثر دیا جا رہا تھا کہ یہ عمارت کے اندر محفوظ رہ جائے گا۔ لیکن امکان نہ تھا۔ کہ جس پیغمبر کی تلاش میں وہ آتش پرستی اور عیسائیت کے راستوں پر در بدر ہوتا غلامی کی اذیت سہتا بلا آخر قباء میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تھا تو اُس پیغمبر کی نشانیاں اگر اس لائق نہ تھیں کہ انہیں سنبھالا جاتا تو مسلمان ایک عامیہ نہ سے محاورے کے مطابق کس باغ کی مولیٰ تھا۔ اُس کے باغ کی کیا حیثیت تھی۔

وہ کنواں جتنا بھی نظر آیا۔ عمارتی سامان کے درمیان میں جتنا بھی نظر آیا تو مجھے وہ بیضر غرض جیسا ہی نظر آیا۔ وہی طرز تعمیر۔ ویسے ہی بڑے بڑے مستطیل سیاہ ہوتے پتھر۔ البتہ ان پتھروں کی درزوں میں سے نہ گھاس لگتی تھی اور نہ کوئی اور نمود ظاہر ہوتی تھی۔ شاید اس کی تہہ میں پانی نہ رہے تھے۔ اُس کا گھیر بھی بیضر غرض جتنا ہی تھا۔ اس کی چرخوی گھما کر فارس کے مسلمان اپنا باغ سینچنے کے لیے پانی تو نکالتے ہی ہوں گے لیکن یہ بھی تو ناممکنات میں سے ہے کہ حضور اپنے اس دور دراز کے شہروں سے آئے ہوئے غیر ملکی صحابی سے ملنے یہاں اکثر نہ آتے ہوں گے اور اس کنویں سے اپنی پیاس نہ بجھاتے ہوں گے۔

لگتا ہے کہ جس جس کنویں نے حضور کی پیاس بجھائی اُسے اس جرم میں بجا دیا گیا یا بجا دیا جانے والا ہے۔ چاہے وہ بیضر عثمان ہو یا بیضر غرض یا پھر مسلمان فارسی کا کنواں ہو۔

کنویں سے پرے کچھ خالی زمین دکھائی دے رہی تھی جس کی جانب یہ نئی عمارت ہوئے ہوئے بڑھ رہی تھی۔ مولابخش کا کہنا تھا کہ وہاں اس کنویں کی قربت میں اُس کی آنکھوں دیکھے کھجور کے دو درخت ہوا کرتے تھے جو مسلمان فارسی کے باغ میں سے تھے اور روایت تھی کہ وہ حضور کے ہاتھوں کے لگائے ہوئے تھے۔ اور اُن کی نسل کا تسلسل چلا آتا تھا۔ ان دو شجروں سے اترنے والی کھجوریں مدینہ کی کھجور مارکیٹ میں تین ریاں فی کھجور کے حساب سے فروخت ہوتی تھیں تو اس بدعت کے خاتمے کے لیے ان دو درختوں کو کاٹ دیا گیا۔ لیکن لوگ پھر بھی بدعت پسندی سے باز نہ آئے اور اُن کے سوتکے

ہوئے گھوں سے کٹوی حاصل کر کے اُن سے کھجور کے ٹکڑے تراشے گئے۔ پتا چڑھ اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ انہیں جڑ سے اکھاڑ پھینکا جائے۔ کچھ اہل مدینہ کے ہاں ان درختوں کی کھجوروں کی گھٹلیاں موجود ہیں انہیں وہ بیست بیست کر رکھتے ہیں۔ بدعت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ملائف کی اس مسجد کی مانند جہاں حضور پر پتھر برسائے گئے تھے مسلمان فارسی کا باغ بھی جلا دیا گیا تھا۔

شاید اس لیے کہ کبھی وہ آتش پرست تھا۔ تو اس کے باغ کو جلا ہی دینا چاہیے تھا۔

اس شہر سنگ دل کو جلا دینا چاہیے۔

اور پھر اس کی خاک کو اڑا دینا چاہیے۔

اُن کے لیے جنہوں نے اسے جلا یا یہ باغ سنگ دل ہی تھا۔ اور ہم ڈھلتی دھوپ میں اُس کانٹیل میدان سے اڑتی ہوئی خاک کو آنکھوں میں اتارتے تھے۔

چاہت تھی کہ اس کی راکھ کو بھی کریدتے۔

جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہو گا۔

راکھ میں سے کریدتے کوئی ایسا درخت بھی نمودار ہو جانا تھا جس کے تنے سے لپٹ کر ایک غلام نے نیچے سے ایک آواز سنی تھی کہ وہ قبا میں پہنچ گیا ہے اور اس خبر سے اس کا ایرانی بدن کپکپانے لگا تھا۔ اُسے خدشہ ہوا کہ وہ کھجور کے درخت سے گر جائے گا۔

تب وہ نہ گرا۔

اب اُسے گرا دیا گیا۔

گیا ہے شام کا وقت ہے کہ وہ بھرے جاتے ہیں۔ بھر کر اور کھانا لایا گیا۔ کسی شخص کو اس زندگی میں اور کیا چاہیے۔ بکری کا گوشت اور بکری کی روٹی یا بھر کر اور فریج فرازا۔ ایک صحابی کا مکان جہاں حضورؐ نے کھانا تناول فرمایا تھا یا ایک پٹرول پمپ۔ یقیناً ایک پٹرول پمپ۔

وہی مقام تھا سات مسجدوں والا۔ جنگ خندق کے دوران جہاں صحابہ کرامؓ رسول اللہؐ اور ان کے عزیز و اقارب خیمہ زن ہوئے تھے عین ان جگہوں پر چھوٹی چھوٹی مسجدیں تعمیر کی گئی تھیں۔ جواب مسلمان کی جاری تھیں اور ان کی جگہ ایک عظیم الشان مسجد اس چٹانوں سے بھری بلندی کے دامن میں تعمیر کی جارہی تھی جس کے آس پاس یہ سات مسجدیں ہوا کرتی تھیں۔

جج کے بعد جب یہاں آئے تھے تو یونہی متأسف ہو کر چلے گئے تھے۔ مسجد فاطمہ حب متفعل تھی اور اب بھی تھی البتہ ہم اس بارے میں جانے کیوں لا علم رہے کہ پٹان کے دامن میں چند سیڑھیوں طے کرنے کے بعد جو چھوٹی سی مسجد نظر آتی تھی وہ سلمان فارسی کی خیمہ گاہ تھی۔ اور اس سے اوپر وہاں۔ جہاں سے یہ سارا علاقہ جنگ خندق کا علاقہ۔ قدموں کے سامنے بچھا نظر آتا ہے جیسے ایک طائر اس پر نظر کرتا ہے تو وہاں جو مسجد فتح تھی وہ اس مقام پر تھی جہاں حضورؐ نے اپنا خیمہ نصب کیا تھا۔

میں جنگ خندق کو جج کے سفر نامے میں تفصیل سے بیان کر چکا ہوں اب میں سلمان فارسی اور رسول اللہؐ کے خیموں کے قریب جاتا ہوں۔

پہلے اس کبھی آتش پرست اور کبھی صلیب پرست کے خیمے کی جانب جاتا ہوں جو اللہ پرست ہوا۔ اور جس کا آتش زدہ باغ ہم دیکھ کر آئے تھے۔ جو حضورؐ کے ظہور کی خبر سن کر کھجور کے درخت سے گرنے والا ہو گیا تھا۔

وہاں تک۔ پہاڑ میں کھدی ہوئی۔ دھوپ میں جھلکتی سیڑھیاں جاری تھیں اور ہم دونوں بار بار سانس درست کرنے کے لیے رکتے۔ میں اور میمونہ۔ پسینہ پونچھتے سلمان فارسی کے پاس ہو گئے۔ مسجد بہت مختصر۔ ایک نشان کے طور پر کہ یہاں خندق کھودنے کا مشورہ دے کر نبیؐ کی بستی کو بچانے والے فارس کے سلمان نے خیمہ لگایا تھا۔

ایک کمرے کے سائز کی چھوٹی سی مسجد اور ایک مختصر محراب۔ بہت بے آباد۔ ویران۔ دیواروں پر مار کر اور پینٹ سے زائرین نے اپنے نام لکھے ہوئے۔ اور اس کی حیات بھی لگتا تھا کہ چند روزہ ہے۔ جب دامن میں تعمیر ہونے والی شاندار مسجد مکمل ہو

”سلمان فارسی کی خندق۔“

اور بابا نے جہاں خیمہ لگایا تھا۔“

سلمان فارسی کے باغ سے اس کے مشورے سے کھودی ہوئی خندق کے مقام تک جانا ایک قدرتی سفر تھا۔

اگرچہ اس کا باغ رہا تھا اور نہ اس کی خندق کا کوئی نشان باقی تھا۔ اس خندق کو کھودنے کے دوران غربت اور فاقہ کشی کے دوران ایک صحابی نے شکایت کی کہ اے اللہ کے رسولؐ یہ دیکھئے میں نے پیٹ پر پتھر باندھ رکھا ہے تو حضورؐ نے کہا تم دیکھو کہ میرے پیٹ پر ایک نہیں دو پتھر ہیں تاکہ بھوک کے عذاب کو سہہ سکوں۔

جابر بن عبد اللہؓ نے آپؐ کی یہ حالت دیکھی تو ایک بکری ذبح کی اور بیوی سے کہا ”تم جو پیس کر روٹیاں تیار کر لینا۔ میں رسول اللہؐ کو دعوت دے رہا ہوں۔“

”کھانا کتنا ہے جو آپؐ نے تیار کروایا ہے؟“ رسول اللہؐ نے دریافت کیا۔ جابر نے عرض کیا ”ایک چھوٹی سی بکری کا گوشت ہے اور بکری روٹیاں ہیں۔“

ان کی بیوی نے دیکھا کہ رسول اللہؐ اپنے ہمراہ بہت سے انصار اور مہاجرین کو بھی لا رہے ہیں۔ آج تو رسوائی ہو جائے گی۔ اس نے سوچا کھانا تو بہت کم ہے۔

رسول اللہؐ نے گوشت کے برتن سامنے رکھے اور بسم اللہ پڑھ کر اپنے دست مبارک سے گوشت اور روٹیاں تقسیم کرنے لگے۔

کل محلہ اور ساتھیوں نے جی بھر کے کھایا مگر ہانڈی میں گوشت پھر بھی بچ رہا تھا۔ ”اب تم خود کھاؤ اور پڑوسیوں کو بھی بھیجو۔“ رسول اللہؐ نے کہا۔

عین اس مقام پر جہاں جابر بن عبد اللہؓ کا گھر تھا وہاں اب ایک شاندار پٹرول پمپ تعمیر کر دیا

جائے گی تو اس مقام کا جواز باقی نہ رہے گا۔ چونکہ وہ بھی آتش پرست رہا تھا تو اس کی خیمہ گاہ کے مقام کے نشان کو بھی راکھ کر دیا جائے گا۔

میمونہ باہر صحن میں نفل ادا کرنے میں مصروف تھی۔

اور میں مسجد کی زبوں حالی کے اندر تنہا سلمان فارسی سے پوچھ رہا تھا کہ اے سلمان کیا آتش پرست ہونے کے باعث تم میں وہ کیسی آگ بھڑکی کہ تم نے اپنے ماں باپ اور وطن کو ترک کیا۔ کبھی راہبوں کے خادم ہوئے اور کبھی یہودیوں کے غلام ہوئے صرف اس لیے کہ میرے بابا کو پاسکو۔ اصحاب صفہ کے تھڑے پر اپنا مقام بنا سکو اور پھر پر شکوہ اور صاحب اقتدار ہستیوں کی نسبت ایوب انصاریؑ ابوذر غفاریؑ عبیدہ بن الجراحؑ عبداللہ بن مسعودؓ عبداللہ بن عمرؓ اور حلیہ سعدیہ کی مانند میرے دل میں بھی مقام بنا لو۔ تم کیسے نصیب والے تھے کہ تم جس کی کھوج میں تھے اُسے قباء میں اپنے سامنے حاصل کر لیا۔ اور میں کیا نصیب لے کر آیا ہوں کہ میرے دل کی بدگمانیاں نہیں جاتیں۔ میں اگر تیری طرح ایک آتش پرست پیدا ہوتا تو شاید میں بھی تجھ ایسے نصیب والا ہو جاتا۔

مسجد سلمان فارسی سے آگے بلکہ چٹان کی بلندی پر اس سلمان کے آقا نے اپنا خیمہ لگایا تھا اور یہاں میں نے ایک ہلکی سی خوشی ایک بے نام سا فخر محسوس کیا کہ مجھے ایک خلش کا جواز مل گیا تھا۔

حضرت عمر فاروقؓ۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ۔ حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کی جنگ خندق کے دوران خیمہ گاہیں اس چٹان کے قدموں میں کیوں ہیں۔ اور ان سے ذرا بلندی پر سلمان فارسی کا خیمہ کیوں تھا۔ حضورؐ کے خیمے کے راستے میں اور ان سے قریب تر کیوں تھا۔ شاید اس لیے کہ اس جنگ کی حکمت عملی سلمان فارسی کے ذہن کی تخلیق تھی اور انہیں ہی سپہ سالار کے قریب تر ہونا چاہیے تھا۔

مسجد فتح تک جاتی ہوئی بہت سی میڑھیاں تھیں اور وہ سب کی سب دھوپ میں سلگتی تھیں۔

”مجھ میں سکت نہیں۔ آپ ہو آئیے۔“ میمونہ نے کہا۔

”اوپر حضورؐ کی خیمہ گاہ ہے۔“

”مجھ میں ہمت نہیں۔“ اور وہ نیچے اتر گئی۔

ہمت تو مجھ میں بھی نہیں تھی لیکن اوپر سے بلاوے میں بہت شدت تھی۔ بابا خیمہ زن تھے۔

میں اپنے آپ کو اپنے سانس کو سنبھالتا دھوپ کی شدت برداشت کرتا آہستہ آہستہ بلند ہو گیا۔ یہ خیال کرتے ہوئے کہ ان زمانوں میں تو یہ میڑھیاں نہ تھیں تو بابا کیسی مشقت سے اوپر کھینچے ہوں گے لیکن پھر جبل نور کی بلندی پر عکاز کا خیال آیا کہ وہ بابا لوگ تو وہاں تک بھی جا پہنچتے تھے تو اس چڑھائی کو کہاں خاطر میں لاتے ہوں گے۔

میں اُس لیے پر تکی ہی کیا جہاں مسجد فتح بلندی کی دھوپ میں سلگتی تھی۔

جہاں سرکار کے خیمے کی میٹھیں چٹانوں میں پیوست تھیں۔

اس مقام پر مسجد فتح تھی۔ یہاں ہوا تیز تھی۔ یہ بھی مختصر تھی اور جب میں وہاں پہنچا تو صد شکر

کے وہاں تھی۔

وائیں جانب مدینے کے شہر کی آبادیوں میں یہ چٹانیں اُترتی تھیں اور بائیں ہاتھ کہیں خثیب میں مہد اللہ بن جابر کے گھر پر قابض وہ پٹرول پمپ تھا اور پکی کچی مسجدیں تھیں۔ ٹریفک کا شور مدھم ہو چکا تھا کہیں نیچے رہ گیا تھا۔ اس بلندی سے کہ یہ مقام ایسا تھا خثیب میں پھیلا ہوا پورا علاقہ اور وائیں جانب طبع نامی چٹانیں نظر آ رہی تھیں۔

تو یہاں بھی میرے تصور کی کھنڈی پر ایک ہی خیال کھٹ کھٹ کرتا رہا کہ بھلا بابا کا خیمہ جو یہاں نصب تھا کیسا تھا وہ خیمہ جو انہوں نے چمن چمن کرتی قصویٰ سے اتر کر جبل رحمت میں اپنے سامنے پایا تھا تو وہ تو اونٹ کے سیاہ بالوں سے بنا ہوا تھا۔ تو کیا یہاں بھی وہی خیمہ تھا۔ میری کوہ نور دیوں کے ساتھی نیموں ایسا شوخ اور بھڑکیلے رنگوں کا تو نہ ہوگا تو کیسا ہوگا۔ ظاہر ہے اُس کے پردے اس منظر پر کھلتے ہوں گے جس میں بہت نیچے مل کھاتی سلمان کی خندق دکھائی دیتی ہوگی۔ اور اس کے پار دس ہزار قریش کا غضب آلود لشکر۔ ہزاروں ساندھنیاں۔ گھوڑے۔ بکواریں۔ نیزے اور بھالے دھوپ میں چلتے دکھائی دیتے ہوں گے۔

جیسے میں کوہ نور دی کی اذیت کے دن کے آخر میں اپنے پورٹروں سے کہتا تھا کہ میرا خیمہ ایسے مقام پر نصب کرنا جہاں سے ”منظر“ دکھائی دیتا ہو۔ ایسے بابا نے بھی ہدایت کی ہوگی کہ میرا خیمہ ایسے مقام پر لگانا جہاں سے ”منظر“ نظر آتا ہو۔

دیسے یہ بھی یقین ممکن ہے کہ بابا نے صحابہ کو تکلیف دینا گوارا نہ کیا ہو اور اپنے ہاتھوں سے خیمے کی میٹھیں ٹھونگی ہوں۔ اُس کی طنائیں کسی ہوں کہ وہ اپنے کام اپنے ہاتھوں سے کرتے تھے۔ اپنے کرتے کے پوند خود لگاتے تھے۔ اپنے جوتے خود گانٹتے تھے اور ان میں میٹھیں لگاتے تھے تو یہی قرین اذقیاس ہے کہ انہوں نے اس مقام پر کسی کی مدد طلب نہ کی تھی اور اپنے خیمے کی میٹھیں اپنے ہاتھوں سے ٹھونگی ہوں گی۔

ایک کوہ نور کسی دوسرے پر انصار نہیں کرتا۔

میٹھیں اُس کے جوتے کی ہوں یا خیمے کی اپنے ہاتھوں سے ٹھونکتا ہے۔

میں مسجد فتح کی مکمل تنہائی میں داخل ہوں۔

”تیر اندازوں کا ٹیلہ اور جس گڑھے میں حضور
گرے تھے.. عشق پر پلستر نہیں کیا جاسکتا“

جیسے میں پھر مدینے میں تھا..

ایسے میں پھر اُحد میں تھا..

اگرچہ میں جنگ اُحد کو نہایت تفصیل سے بیان کر چکا ہوں پھر بھی اُحد کی تیز ہوا میں کچھ
پھڑپھڑاتی ہوئی آوازیں بار بار سنائی دیتی جاتی تھیں..

”ہماری طرف دیکھو ہم زہرہ اور مشتری کی کوکھ سے پیدا ہونے والیاں ہیں..“ ہندو اور قریش
کی مورتیں اپنے مردوں کو مسلمانوں سے جنگ بدر کا انتقام لینے کے لیے ابھار رہی تھیں..

”مجھے تمہاری شکست کا خطرہ ہے..“ رسول اللہ اپنی رائے کو پھر دوہرا رہے ہیں..

”کسی نبی کی شایاں نہیں کہ وہ زڑہ بکتر پھن لینے کے بعد دشمن کا مقابلہ کیے بغیر زڑہ

اتار دے..“

”کون ہے جو یہ تلوار لے کر اس کا حق ادا کرے..“

جبیر اپنے غلام سے کہہ رہا ہے.. ”اے وحشی.. اگر تو میرے چچا سلمہ کے بدلے میں محمدؐ کے ہاتھ
مزدہ کو قتل کر دے گا تو میری طرف سے تو آزاد ہوگا“

وحشی کہہ رہا ہے ”اب حمزہ میری طرف لپکے.. لیکن وہ شکست ہو چکے تھے.. زمین پر
گر پڑے.. میں نے انہیں اسی حالت میں چھوڑ دیا تا آنکہ وہ جاں بحق ہو گئے..“

صفیہ اپنے حقیقی بھائی حمزہ کو دیکھنے کے لیے اُحد میں پھرتی تھیں..

رسول اللہ حضرت حمزہ کی لاش پر کھڑے ہو کر کہہ رہے ہیں ”مجھے کبھی اتنا غم اور صدمہ نہیں پہنچے

کا جتنا حمیری شہادت سے پہنچا ہے..“

بہت معمولی.. بہت دیران.. دیواروں پر زائرین کی بدقیاسیاں اُن کے ناموں کی صورت
میں.. ایک دو جائے نماز.. باہر محن میں دھوپ کی تیزی..!

اس مختصر مسجد میں وہ مقام تھا جہاں حضور کا خیمہ نصب تھا..

میں ہوتا تو خواہ مخواہ کوئی میخ اکھاڑ کر کہتا ”بابا یہ میخ کس نے گاڑی تھی.. اس نے تو ذرا سی ہوا
کے چلتے ہی اکھڑ جانا تھا.. میں گاڑ دوں.. یہ طنائیں قدرے ڈھیلی ہیں انہیں کس دیتا ہوں.. میں یہیں آس
پاس بیٹھا رہتا ہوں خیمے کی کوئی پرابلم ہو تو مجھے بلا لیجیے گا.. میں بہت ایکسپیرٹ ہوں خیمے لگانے کا..

مسجد فتح کے فرش پر سجدہ کرتے ہوئے میں نے بابا کی موجودگی محسوس کی.. گویا وہ وہاں
تھے.. جہاں وہ بہت راتیں سوئے تھے یا جاگتے ہی رہے تھے اور اُن کے خیمے کے پردوں کے پار جو منظر
تھا اس میں خندق کے پار قریش کے غضب ناک لشکر کے الاؤ چلتے تھے..

اور وہ ذرا نشیب میں مقیم مسلمان فارسی کو آواز دیتے تھے کہ اے مسلمان تمہیں یقین ہے کہ
قریش اس خندق کے پار نہیں آئیں گے..

اور مسلمان کہتے ہیں.. میں تیرے لیے یونہی در بدر تو نہیں ہوا.. تیرے عشق میں آتش پرستی
ترک کر کے یونہی غلام تو نہیں ہو گیا.. تیری آمد کی خبر سن کر کجھور کے درخت پر چڑھے کام کرتے کیا یونہی
مسرت سے بے اختیار ہو کر کاٹنے تو نہیں لگا تھا.. جو قریش اس خندق کے پار آ جائیں گے..

UrduPhoto.com

UrduPhoto.com

UrduPhoto.com

”لیکن حمزہ پر رونے والی عورتیں نہیں ہیں۔“

انصار اپنی عورتوں سے کہہ رہے ہیں۔ ”جاؤ اور رسول اللہ ﷺ کے چچا پر لوہہ کرؤ“
 اُحد حمزہ کے سوا کیا ہے۔ محض ایک خشک پہاڑ۔

اس خشک پہاڑ کے دامن میں چونکہ حمزہ دفن ہیں اس لیے وہ پہاڑ بھی معتبر ہو گیا۔ امیر الشہداء اُسی مقام پر دفن ہیں جہاں وحشی نے انہیں شہید کر دیا۔ حفاظتی شخصے کی اوٹ سے چار دیواری کے اندر جو چند پتھر پڑے تھے میں نے اُن پر نگاہ کرتے ہوئے حضرت حمزہ کے لیے فاتحہ پڑھی اور مڑ کر اُس ٹیلے کی جانب دیکھا جو اُحد کے میدان میں ابھرا ہوا تھا اور آج بھی ایرانی زائرین کے سیاہ لہاوے اُس کی بلندی پر پھڑپھڑاتے تھے۔

”شیخ صاحب۔ اس ٹیلے کی بھی کوئی تاریخی اہمیت ہے یا لوگ یونہی عقیدت کی خاطر اس کی بلندی تک جاتے ہیں۔“

”یہ وہی ٹیلہ ہے تارڑ صاحب۔“ شیخ صاحب نے فاتحہ سے فارغ ہو کر مڑ کر دیکھا ”جس کی وجہ سے یہ جنگ ہاری گئی تھی۔ تیر اندازوں کا ٹیلہ۔“

میرے لیے یہ ایک خبر تھی۔ پچھلی مرتبہ جب مولانا بخش کے ہمراہ اُحد آیا تھا تو میں ہرگز آگاہ نہ ہوا کہ یہی وہ ٹیلہ ہے جس نے اس جنگ کا فیصلہ کیا تھا۔ جہاں تیر اندازوں کو تعینات کیا گیا تھا۔ اور تب میں حیرت میں مبتلا ہوتا تھا کہ آخر زائرین اس کے اوپر کیوں جا رہے ہیں۔

اب میں نے بھی اوپر جانا تھا۔

اس کی بلندی کچھ زیادہ نہ تھی۔

باغ جناح کی کسی پہاڑی سے نصف کے قریب ہوگی۔

البتہ اس کی چوٹی پر پہنچ کر احساس ہوتا تھا کہ اس کی اونچائی اتنی کم بھی نہیں کیونکہ وہاں کھڑے ہو کر دائیں ہاتھ پر مدینے کی بستیاں نظر آ رہی تھیں اور ان سے پرے وہ پہاڑی سلسلے جو اس بستی کے داخلے پر واقع تھے اور بائیں جانب اس ٹیلے کے نیچے حضرت حمزہ کے مزار کے آثار تھے۔ پھر کچھ خالی زمین تھی اور اس سے آگے ایک بے ترتیب آبادی شروع ہو جاتی تھی جو جبل اُحد کی چینل بلندی سے ہی جا رہی تھی۔ اُحد کے سلسلے کے آخری حصوں کے قریب ہم سے چار پانچ کلومیٹر کے فاصلے پر مجبوروں کے نہایت گھنے باغ ایک وسیع علاقے پر چھائے ہوئے تھے۔

وہاں سیاہوں کے لیے ایک پارک اور دیگر سولتیس تعمیراتی جگہاں ہیں ان ہانوں کے جھنڈ

میں۔“ شیخ صاحب نے اصرار کیا۔

”یعنی جنگ اُحد کے حوالے سے کوئی قسم پارک بنایا جا رہا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں۔ تاریخ کا کوئی حوالہ نہیں۔ ایک تقریبی پارک ہوگا۔“

تاریخ سے یاد آیا کہ شیخ صدیق تاریخ کے حوالے سے ہی میرے ہمراہ تھے۔ مدینہ میں دفنی انٹر ایکسٹریج تھے اور بہت ”تاریخی“ تھے یعنی تاریخ سے بے حد شغف رکھتے تھے۔ سبوتق نے ان سے درخواست کی تھی کہ باپائی کو بھی یہی عارضہ لاحق ہے تو ان کا کچھ دوا دارو کریں۔

چنانچہ وہ میرا دوا دارو کرنے کی خاطر مجھے اُحد لے آئے تھے۔ میری تمنا بھی یہی تھی کہ اُحد کو از سر نو تاریخی تامل میں دیکھا جائے۔ یعنی تاریخی مقامات کی نشاندہی کی جائے۔ اور وہ وہی تھی۔ کچھ زائر ٹیلے پر نقل ادا کر رہے تھے۔

ہوا تیز تھی اور اُحد کے بچے کچھ میدان میں جوڑی تھی اس کے ذروں کو فضا میں اڑاتی تھی۔ اُسی فضا میں جس میں ایرانی زائرین کے سیاہ لہاوے اور ماضی کی آوازیں پھڑپھڑاتی تھیں۔ ”تم نے کسی بھی حالت میں اس ٹیلے کو نہیں چھوڑنا چاہیے ہم جنگ جیت بھی جائیں تب بھی نہیں۔“

شیخ صاحب کے سامنے جیسے ایک نقش کھلا تھا۔ وہ جنگ کو میرے سامنے زندہ اور متحرک کر لے لگے۔ ”قریش اوپر سے مدینے کے اوپر سے اس میں داخل ہوئے بغیر اس سامنے والے میدان کے قریب خیمہ زن ہوئے تھے۔ اور حضورؐ اپنی سپاہ کے ہمراہ ادھر سے بستی کی جانب سے تشریف لائے تھے اور سب سے پہلا کام یہی کیا تھا کہ ماہر تیر اندازوں کو خود اس ٹیلے پر قریش کی جانب رخ کیے ہوئے تعین کیا تھا۔“

”یعنی حضورؐ بھی اس ٹیلے پر چڑھے تھے۔“

”جی ہاں۔ ایسا ہی ہوا ہوگا۔“

اگر ایسا ہوا تھا تو وہ کہاں کھڑے ہوں گے۔ یہ نہیں کہیں میرے آس پاس انہی سنگرزوں پر۔ اور اسی منظر کو دیکھتے ہوئے جو میری نظروں کے سامنے پھیلا ہوا تھا۔ اور انہیں علم نہ تھا کہ ٹیلے کے عین نیچے اس کھلی جگہ پر ابھی تھوڑی دیر کے بعد ان کے چچا حمزہ جی کے بھالے کا شکار ہو کر دم توڑ رہے ہوں گے اور ہندو ان کے اعضاء کاٹ کر ان کا ہار اپنے گلے میں ڈال کر اُحد کی ایک چٹان پر کھڑی ہو کر چلی رہی ہوگی۔

”آج جنگ اُحد میں ہم نے جنگ کا بدلہ اُتار دیا۔ پس میں ساری

مہر وحشی کی شہرگز اور ہوں گی جہاں تک کہ میری ہڈیاں قبر میں نکل جائیں۔“

”یہ تصور کسی حد تک باطل ہے کہ سب کے سب تیر انداز اس ٹیلے کو چھوڑ کر صرف مال غنیمت حاصل کرنے کی خاطر اتر گئے تھے۔ نہیں۔ ان میں سے کچھ وہیں ڈٹے رہے۔ انہوں نے ٹیلہ چھوڑنے سے انکار کر دیا کہ ان سے یہی کہا گیا تھا۔ وہ سب کے سب بعد میں مدافعت کرتے شہید ہو گئے۔۔۔“

خالد بن ولید براہ راست ادھر نہیں آئے تھے بلکہ اپنے گھڑسواروں سمیت جبل اُحد کے عقب میں روپوش ہوئے اور پھر اس ٹیلے کے پیچھے نمودار ہو کر مسلمانوں پر حملہ آور ہو گئے۔“

جیتی ہوئی جنگ ہار میں بدل گئی۔

”اس ٹیلے کی بلندی کچھ زیادہ نہیں۔“

”چودہ سو برس گزر چکے ہیں۔ اور ان برسوں میں جتنی ہوائیں چلی ہیں اور طوفان اٹھے ہیں ان کے باعث اس کی بلندی کسی حد تک ان دنوں کی نسبت کم ہو چکی ہے۔“

یہاں بھی وہی خیال آیا کہ آئے ہیں اس گلی میں تو پتھر ہی لے چلیں۔

لیکن صرف ایک پتھر اٹھانے سے اس ٹیلے کی بلندی میں کمی آتی تھی جو مجھے گوارہ نہ تھا۔

”اگر آپ نیچے دیکھیں۔۔۔ جدھر سے ہم آئے ہیں اس کی دوسری جانب جہاں سے ٹیلا شروع

ہوتا ہے وہاں ایک چھوٹی سی دیوار ہوا کرتی تھی۔ اب بھی چند اینٹیں موجود ہیں۔ مجھے معلوم نہیں کہ ان کی تاریخی حیثیت کیا ہے؟“

وہ چند اینٹیں۔۔۔ موجود تھیں اور بہت قدیم زمانوں کی لگتی تھیں۔

”عقبہ کے پتھر سے رسول کا ہونٹ کٹ گیا۔ اور دائیں طرف کا نیچے کا دانٹ ٹوٹ گیا۔ ابن قتیہ کے وار سے خود کی کڑیاں رسول کے رخساروں میں جھنس گئیں۔ آپ کی پیشانی پر وار کر کے عبداللہ بن شہاب نے اسے خون آلود کر دیا۔ آپ اپنے بچاؤ کی خاطر ایک گڑھے میں کود گئے۔ یا نڈھال ہو کر گر گئے۔ یہ گڑھے ابو عامر نے مسلمانوں کو ذک پہنچانے کے لیے کھودے تھے۔“

”شیخ صاحب۔۔۔ میں نے بہت سوں سے دریافت کیا ہے اور آپ سے بھی پوچھتا ہوں کہ کیا آپ جانتے ہیں کہ رسول اللہ زخمی ہو کر کہاں۔۔۔ یہاں اُحد کے میدان میں کس مقام پر ایک گڑھے میں

UrduPhoto.com

ہاں۔۔۔ میں جانتا ہوں۔“

UrduPhoto.com

”میں جتنا جانتا ہوں اس کے مطابق۔ ذرا اچھے مزہ کے مزاد سے پہلے جبل اُحد کے دامن

UrduPhoto.com

تک پہلی ہولی آبادی کی جانب غور سے دیکھئے۔ تو وہاں اُحد کے پہاڑ کے مین ٹیلے وہ گڑھا ہے جس میں حضور مگرے تھے۔“

”تو چلئے۔“

میرے ذہن میں ساخت کی کچھ بڑی خرابی ہے جس کے باعث میں معتدل نہیں رہا۔ میں تاریخ کے بڑے بڑے اہم اور شاندار واقعات سے بے اثر رہتا ہوں اور کسی ایک چھوٹے اور معمولی واقعے کا مجھ پر اثر ہو جاتا ہے۔ جنگ اُحد میں حمزہ کی شہادت۔۔۔ ابو دجانہ کا اکڑ کر چلنا۔ رسول کے لیے ام عمارہ کا درجنوں زخم سہنا۔ تیر اندازوں کا ٹیلہ چھوڑنا سب اپنی جگہ لیکن بابا کا زخمی ہو کر ایک گڑھے میں گر جانا ان سب پر فوقیت لے جاتا ہے۔ تو اس ”تو چلئے“ میں اسی دماغی خلل کی اثر اندازی کی بے تابی تھی۔

”چلتے ہیں۔“ شیخ صاحب نے اطمینان سے کہا ”لیکن اس ٹیلے سے اترنے سے شستر میں ایک اور اہم مقام کی نشاندہی کرنا چاہتا ہوں۔ جو یہیں سے ہو سکتی ہے۔ جہاں آبادی جبل اُحد کے دامن میں جا کر گڑھ کی ہے اور پہاڑ بلند ہوتا ہے۔ تو وہاں ذرا غور سے دیکھئے۔“

میں جتنے غور سے دیکھ سکتا تھا دیکھتا رہا۔

”دامن سے ذرا اوپر اُحد کی چٹانوں میں آپ کو کوئی کھوہ نظر آتی ہے۔“

”نہیں نظر آتی۔“

”ایک سیاہ دھبہ نظر آتا ہے؟“

”ہاں وہ کچھ کچھ نظر آتا ہے۔ کیا ہے؟“

”روایت ہے کہ جب صحابہ کرامؓ نے حضورؐ کو اس گڑھے میں سے نکالا۔ تو ذرا بلندی پر لے گئے۔ اور اس کھوہ میں لے گئے۔ شاید ابو عبیدہ نے اسی کھوہ میں ان کے رخساروں میں لکھی ہوئی کڑیاں

وانٹوں سے نکالی تھیں۔“

ایک نہ شد۔ دو شد۔۔۔

دماغی خلل اندازی کی اب تو حد ہی ہو گئی۔ ”شیخ صاحب۔۔۔ وقت ضائع نہ کیجئے۔ مجھے لے

چلئے۔ ویسے آپ اس کھوہ کے اندر گئے ہیں؟“

”نہیں۔ وہاں دامن میں عام طور پر پولیس کے ایک دو سپاہی تعینات ہوتے ہیں جو کسی کو اوپر

نہیں جانے دیتے۔ میں بھی نہیں گیا۔“

”لہر بھی لے چلئے۔“

اہم دونوں ٹیلے سے اترے۔

اس سے پیشتر ”ہم دونوں“ سے مراد ہوتی تھی میں اور بیوٹ۔ تو بیوٹ کہاں تھی۔

اس نے کہا تھا کہ میں تو مدینے میں صرف اس لیے آئی ہوں کہ مسجد نبویؐ میں کچھ وقت گزار سکوں۔ بروئے رسولؐ کے آس پاس منڈلاتی رہوں۔ آپؐ ہو آئیے جدھر بھی آپؐ نے تاریخ کے لیے ہونا ہے۔

چنانچہ ہم دونوں۔ یعنی میں اور شیخ صاحب ٹیلے سے اترے۔ ان کی کار میں سوار ہوئے اور جبل احد کے سائے میں پھیلتی ہوئی بے ترتیب بستی میں چلے گئے۔ جیسے ایسی بستیاں ہوا کرتی ہیں۔ گلیوں میں فٹ بال کھیلنے بچے۔ بے مقصد گھومتے نوجوان۔ بندکانوں کے تھڑوں پر بیٹھے ہوئے بوڑھے اور کھڑکیوں میں سے جھانکتی عورتیں۔ اور وہ سب ہماری کار کی جانب متوجہ ہو جاتے تھے کہ یہ کس سلسلے میں ادھر نکل آئے ہیں۔ شاید بھٹک گئے ہیں۔ امیر حمزہ کے مزار پر فاتحہ پڑھ کر واپس مدینے کیوں نہیں چلے گئے۔

شیخ صاحب صرف ایک بار بھٹکے۔ یکدم اپنے سامنے احد کی چٹانوں کو پایا اور پھر بیک گیر لگا کر راہ راست پر آ گئے۔ ویسے وہ اپنے راستے جانتے تھے۔

بستی جہاں تھم جاتی تھی۔ رُک جاتی تھی۔ جہاں سے احد کے سلسلے کا آغاز ہو جاتا تھا وہاں شیخ صاحب نے کار روک دی۔

کچھ اہل احد نے ہم دونوں پر تشویش کی نگاہیں ڈالیں کہ یہ یہاں کیا کر رہے ہیں اور پھر اگلے لمحے ہم سے غافل ہو گئے۔ اور ہم ان کی غفلت کے شکر گزار ہوئے۔ جہاں سے احد کے پہاڑ کا آغاز ہوتا تھا وہاں ایک چٹان۔ مختصر جسامت کی ایک عام کمرے کے حجم جتنی ساکت تھی۔ شیخ صاحب مجھے اس کے قریب لے گئے اسے اور اس کے دامن کو غور سے دیکھا اور پھر تأسف سے بولے ”چھپلی ہار جب میں یہاں آیا تھا تو اس چٹان کے نیچے ایک چھوٹا سا گڑھا موجود تھا۔ زیادہ گہرا نہیں تھا۔ اس میں گرا تو نہیں جاسکتا تھا لیکن وہ موجود تھا۔“

جہاں وہ گڑھا۔ یا اس کی نشانی کچھ عرصہ پہلے موجود تھی۔ وہ نشانی پُر ہو چکی تھی۔ اسے سینٹ اور بگری سے پاٹ دیا گیا تھا۔ وہاں صرف ایک ناہموار سطح تھی۔ اور تازہ تازہ پُر کی ہوئی۔ سینٹ شدہ۔

شیخ صاحب یوں شرمندہ ہوئے جیسے انہوں نے ذاتی طور پر اس گڑھے کو بھر کر اس پر پلستر کر دیا ہو جس میں ہمارا زخمی ہو کر گر گئے تھے۔ ”یہاں بھی کبھی کوئی راز آ جاتا تھا اور گریہ کرتا تھا حضورؐ کے زخموں اور دامنوں کے شہید ہونے کی یاد میں۔ تو شاید اس لیے اسے انہی دنوں نابود کر دیا گیا ہے۔“

”حضرت ابو بکر صدیقؓ اپنے یار غار کی جانب دوڑے۔ باقی صحابہ بھی ”چڑیوں کی مانند“ اڑتے رسول اللہؐ کی گرد جمع ہو گئے۔ حضرت علیؓ نے جھٹک کر اُن کا ہاتھ تھاما۔ طلحہ بن عبید اللہؓ نے سہارا دے کر آپؐ کو اٹھایا اور سیدھا کھڑا کر دیا۔ مالک بن نسان نے آپؐ کے چہرے سے خون چوس چوس کر لیا۔“

وہ گڑھا۔ یا جہاں اُس کے ہونے کا امکان تھا۔ چودہ سو برس تک موجود رہا اور اب جا کر وہ شرک کی رد میں آیا اور سینٹ اور بگری سے بھر کر پختہ اور ہموار کر دیا گیا۔ جو نے نوازی حضرت علیؓ۔ ابو بکر صدیقؓ۔ عبید اللہ بن جراحؓ اپنے رسولؐ کی اُلفت میں کرتے تھے۔ وہ نے نوازی اس گڑھے کے کچھ کام نہ آئی۔

اس گڑھے میں بابا کا جو خون گرا تھا۔ شاید دانت بھی گرے تھے۔ وہ سب دفن کر کے اُن پر سینٹ کا پلستر کر دیا گیا تاکہ شرک کا قلع قمع کر دیا جائے۔

پر شرک یوں تو نابود ہونے سے رہا۔

عشق تو موجود رہتا ہے۔ اس پر پلستر نہیں ہو سکتا۔

وہ موجود رہتا ہے۔

اسے گلتا چلا جا رہا تھا اس لیے جب اس کے سیاہ دہانے میں سے دو تین لوگ برآمد ہو کر پیچھے اترنے لگے تو انہیں دیکھ کر میرا رنگ بدلا اور چونکہ میں ایک دماغی مریض تھا اس لیے یک لخت مسکرائے لگا اور مسکراتا چلا گیا۔ شیخ صاحب مجھے اس کیفیت میں مبتلا دیکھ کر قدرے تشویش میں مبتلا ہوئے تو میں نے کہا "شیخ اوپر برف پگھل گئی ہے... دیوسائی کے راستے کھل گئے ہیں... قافلے بلندی سے آرہے ہیں جس کا مطلب ہے ہم بھی اوپر جا سکتے ہیں... اتنی دیر میں وہ چند لوگ جو مقامی تھے ہمارے قریب ایک پٹان سے اترے اور آپس میں باتیں کرتے چلے گئے... آجائیں شیخ جی... کہیں پھر سے برف ہاری نہ شروع ہو جائے... راستے مسدود نہ ہو جائیں... کوئی روک نہ لے..."

سنگریزوں پر پاؤں پھسلتا تھا اس لیے کہ میرے پاؤں میں چپل تھی جو گر نہ تھے... شیخ صاحب لہانے تا بعد اری سے مجھے تھامنے سہارا دینے کی کوشش کرتے تھے...

چٹانیں ٹھوس نہ تھیں بلکہ کھردری اور تہہ در تہہ تھیں جیسے بڑی بڑی سلیٹوں کو جوڑ کر بنائی گئی ہوں... ان پر چڑھنا بھی آسان تھا کہ کھردری سطح پاؤں پکڑ لیتی تھی... شیخ صاحب نے اذرا احتیاط لیا اور مسلسل میری طرف بڑھا رکھا تھا تاکہ بھٹکنے کی صورت میں وہ مجھے گرفت میں لے لیں...

"شیخ صاحب یہ چار گز کی چڑھائی تو کوئی بات نہیں... آپ فکر نہ کریں اور اپنے بازو کو تھوڑا آرام دیں..."

میں عرض کر چکا ہوں کہ کھوہ زیادہ اونچائی پر نہ تھی... ایک صحت مند شخص آسانی سے سانس سہارا چار پانچ منٹ میں وہاں پہنچ سکتا تھا... اب چونکہ میری بدنی صحت بھی کچھ اچھی نہ تھی اور دماغی صحت بھی مشکوک ہو چکی تھی اس لیے میں دو چار قدم کے بعد رک جاتا تھا... ظاہر یہی کرتا تھا کہ سانس درست کرنا چاہتا ہوں لیکن ایسا نہیں تھا... میں دل ہی دل میں حساب لگا رہا تھا کہ اگر یہ وہی کھوہ ہے تو صحابہ کرام حضور کو سہارا دیتے اسی راستے سے اوپر جا سکتے تھے... اس کھوہ کا تذکرہ اگرچہ سیرت النبی کی کسی کتاب میں براہ راست نہیں ملتا لیکن ہر سیرت نگار یہ لکھتا ہے کہ زخمی ہونے کے بعد صحابہ انہیں سہارا بن گئے... ذرا اوپر لے گئے یا حضور خود بلندی کی طرف چلے گئے...

"رسول اللہ نے والوں کے درمیان سے راستہ بناتے ہوئے جبل احد کی بلندی کی طرف چلے تاکہ راہ اونچائی تک پہنچ سکیں..."

"خالد بن ولید احد کی بلندی پر چڑھ گئے... رسول اللہ نے دعا کی "اے اللہ یہ ہم سے اوپر کی طرف سے آ لے پائیں... حضرت عمر فاروقؓ نے مہاجرین کی ایک جماعت کے ساتھ خالد بن ولید اور اسحاق کو لے پا کر دیا..." (ذکر)

"اندر... اندر میرے رسول کی خوشبو ہے"

بستی احد کے پہاڑ کے قریب ہوتے ہی ختم گئی تھی... پہلو میں جو چھوٹی سی سڑک تھی اسے بھی احد کی چٹانوں نے روک لیا تھا... اور ہماری کار بھی جہاں شرک کا اختتام ہو رہا تھا وہاں رکی ہوئی تھی... سیمنٹ شدہ گڑھے سے ذرا آگے ہم ہوئے... احد کے دامن میں کھڑے ہو کر اوپر دیکھا... سطح زمین سے تقریباً چالیس پیاس فٹ کی اونچائی پر احد کی اونچی نیچی چٹانوں میں ایک کھوہ کی تاریکی صاف دکھائی دے رہی تھی...

حضور نے فرمایا "احد جنت کا پہاڑ ہے اور میں اسے پسند کرتا ہوں..."

اسی پہاڑ کی اس کھوہ نے اُن کو پناہ دی تھی...

"تارڑ صاحب... ایک بات سمجھ میں نہیں آرہی... شیخ صاحب نے ہمارے قدموں سے شروع ہو کر بلندی پر کھوہ تک جانے والی چڑھائی کو ایک نظر دیکھا اور پھر آس پاس بہت احتیاط سے نظر کی..." میں جتنی بار بھی یہاں آیا ہوں... یہاں اس مقام پر... ایک یا کبھی دو سپاہی موجود ہوتے ہیں تاکہ کوئی اوپر نہ جا سکے... آج پہلی بار یہاں کوئی نہیں..."

"اس کا مطلب ہے کہ ہم اوپر جانے کا سوچ سکتے ہیں..."

"نہیں... اس کی ہرگز اجازت نہیں... کوئی نہ کوئی شخص آس پاس ہوگا جو ہمیں روک دے گا..."

"کوئی روک دے گا تو رک جائیں گے شیخ صاحب... کہہ دیں گے کہ ہم تو یونہی کوہ پیمائی کر رہے تھے ہمیں کیا پتہ کہ اوپر کوئی کھوہ ہے... اور اگر ہے تو ہم نے اس کھوہ سے کیا لینا دینا..."

شیخ صاحب جانتے تھے کہ میں اتنا نادان نہیں ہوں اور خوب جانتے تھے کہ دماغ پر اثر ہو چکا ہے اور میں پہلے تراشتا ہوں...

چونکہ میں نے ابھی تک اس کھوہ سے نظر ہٹائی نہ تھی... منہ اٹھا لے ایک دماغی مریض کی مانند

ذرا اوپر ہوئے تو کھوہ کی اہیت کا ایک اور ثبوت سامنے پایا۔

جہاں ہم سانس لینے کے لیے رکے تھے وہاں سے ہم ذرا سی اونچائی پر کھوہ کا دہانہ دیکھ سکتے تھے اور یہ بھی دیکھ سکتے تھے کہ وہ پہاڑ کے اندر ایک قدرتی غار نہیں ہے بلکہ حرا کی مانند بڑی بڑی چٹانوں کے ٹکڑیوں کی وجہ سے گرنے سے وجود میں آئی ہے۔

ایک اور ثبوت یہ تھا کہ ہمارا راستہ روکتی ہوئی ایک قدیم اور پتھریلی دیوار تقریباً دو میٹر اونچی اور ساتھی تھی۔ جو صرف اس لیے تعمیر کی گئی تھی کہ اگر کوئی چوری چھپے بھی اوپر آ جاتا ہے تو اسے خود سے ٹکراتے ہوئے اور کھوہ تک نہ پہنچ سکے۔

اب کیا دیکھتے ہیں کہ دو تین خواتین نمودار ہوتی ہیں اور ان کے ہمراہ ایک چھوٹی سی بچی بھی ہے۔ ہمیں دیکھ کر ہلکتی ہیں اور پھر اس دیوار سے چٹ کر دھم سے ہمارے قریب لینڈ کر جاتی ہیں۔ بچی اگلے لگتی ہے تو پھسل کر گرے لگتی ہے لیکن ہم اس کی مدد کے لیے چاہتے ہوئے بھی ہاتھ نہیں بڑھا سکتے کہ ہم غیر محرم ہیں۔ یہ خاندان ہمیں کن اکیوں سے دیکھتا ہے اتر جاتا ہے۔

ہم اس محفے میں ہیں کہ اس دیوار کو عبور کریں یا نہ کریں۔ ہمیں سے کھوہ کی قریب ترین راستہ کر کے پسپائی اختیار کریں یا نہ کریں۔ اگر یہ خواتین وہاں تک ہو آئیں اور یقیناً اس دیوار کو عبور کر کے ہی اوپر گئی تھیں تو ہم ایسا کریں یا نہ کریں تب ہم نے دیکھا کہ کھوہ میں سے ایک نہایت گورے بالوں والی نظر میں ہی پسند آ جانے والے بزرگ۔ مجھ سے بھی بزرگ برآمد ہوتے ہیں ایک ڈھیلے چوٹے اور نہایت گم۔ کھوئے ہوئے۔ چہرہ زرد جیسے کوئی عارضہ لاحق ہو۔ کسی صدمے میں ہوں جیسے۔ کھوہ سے اڑ کر ہماری سطح پر آتے ہیں اور پھر آہستگی سے دیوار پر قدم رکھ کر اترتے ہیں ہم سے لاطعلق گزرنے لگتے ہیں تو شیخ صاحب جو عربی سے واقف ہیں انہیں سلام کرنے کے بعد پوچھتے ہیں "آپ اردن سے آئے ہیں؟" "کوہ اسی ملک کے باشندے لگتے تھے۔"

وہ سر ہل کر کہتے ہیں "نہیں۔ میں سعودی ہوں۔"

میرے اور شیخ صاحب کے لیے ان کا سعودی ہونا باعث حیرت تھا کہ ایسے مقامات پر سعودی نہیں پائے جاتے۔ وہ چاہیں تو بھی تعزیر کے خوف سے نہیں پائے جاتے کہ اس قسم کے مقامات کی آمد نہ کرنا ان کے نزدیک۔ بلکہ حکومت وقت کے نزدیک بدعت ہے اور اسی لیے شیخ صاحب نے انہیں اردنی سمجھا۔

وہ اپنے آپ میں غم ہم سے لاطعلق۔ انہوں نے ہماری جانب آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔ انہوں نے کہا ہیں۔ پھر ہیں یا انسان ہیں۔ ہمارے کو تھے کہ شیخ صاحب نے نہایت نرم لہجہ میں

"ابو اعلیٰ نے بیان کیا کہ رسول اللہ نے اٹھ کر (گڑھے میں سے) پہاڑ کی ایک چٹان چڑھنے کی کوشش کی مگر عمر بھی تھی آپ میں اس وقت ضعف و ناتوانی بھی پیدا ہو گئی تھی نیز آپ نے وہ دو درہیں پہن رکھی تھیں لہذا چڑھ نہ سکے۔ طلحہ بن عبید اللہ آ کر نیچے بیٹھ گیا اور آپ نے ان کی مدد سے چٹان پر چڑھ کر اپنے آپ کو سنبھال لیا۔" (ہشام)

"آنحضرت (کھائی میں سے نکل کر) اپنے اصحاب کے ساتھ احد پر تشریف لے گئے جہاں دشمنوں کے تعاقب سے قدرتی طور پر حفاظت حاصل تھی۔"

"اب وہ احد کے ایک بلند ٹیلے پر جا پہنچے جہاں رسول اللہ دشمنوں کی شدت سے بیٹھ کر نماز پڑھانے پر مجبور ہو گئے۔" (بکری)

اگر احد کے میدان کے اُس حصے کا تعین کرنا مقصود ہو جہاں یہ جنگ لڑی گئی تو اس کی وہ بڑی نشانیاں تیر اندازوں کا ٹیلہ اور حضرت حمزہؓ کا جائے شہادت ہے۔ یہ مقام جہاں ہم تھے یہاں سے بمشکل ایک کلومیٹر کے فاصلے پر تھے اور آبادی سے پرے صاف نظر آ رہے تھے۔ مسلمان اپنے دفاع کی خاطر اگر احد کی گھاٹی میں چلے گئے تو نزدیک ترین گھاٹی یہی تھی جس میں سے ہم آئے تھے اور جہاں ہماری کار کھڑی تھی۔ اور ہمیں پر اس گڑھے کا تعین کیا گیا تھا جس میں حضورؐ گرے تھے۔ اور وہاں سے نکلنے پر قدرتی طور پر انہوں نے اپنے بچاؤ کی خاطر پہاڑ پر چڑھنا تھا تو دشمنی حالت میں دور جا کر تو نہیں چڑھنا تھا قریب ترین جگہ سے اوپر جانا تھا۔ گڑھے کے عین اوپر ایک چٹان بھی تھی۔ شاید وہی جس پر حضورؐ نے چڑھنے کی کوشش فرمائی تھی۔

اگر وہ اسی علاقے کے آس پاس تھے تو یہاں کچھ بلندی پر بس یہی ایک غار یا کھوہ موجود تھی۔ یوں بھی مقامی روایت بھی یہی تھی اور اوپر وہاں تک جانے پر پابندی بھی اسی لیے لگائی گئی تھی کہ اس کی کوئی اہیت تھی۔ یہاں کچھ ثابت کرنا مقصود نہیں صرف جغرافیائی اور قدرتی عوامل کو پیش نظر رکھ کر۔ اور تاریخی حوالوں میں بیان کردہ صورت حال کو سامنے رکھ کر کسی نتیجے پر پہنچنے کی سعی کرتا ہے۔ اگر اس گڑھے کی کوئی اہیت نہ ہوتی تو اُسے کبھی پُر نہ کیا جاتا اور اگر اس کھوہ سے کچھ وابستہ نہ ہوتا تو اس تک جانے والا راستہ بند نہ کیا جاتا۔ جبل احد کے دامن میں جو لوگ مدتوں سے رہتے ہیں وہ بھی اسی روایت پر یقین رکھتے ہیں۔

تو یہ طے تھا کہ اگر حضورؐ جبل احد پر چڑھے تھے تو یہاں سے آس پاس سے ہی اوپر چلے گئے۔ اور میدان احد میں جو دشمن ان کے خون کا پیاسا ہو رہا تھا اس کی نظروں کے سامنے بلندی پر کھڑے نہیں رہے۔ بلکہ انہیں نہ کہیں اس کی نظروں سے اوجھل ہوئے تھے۔

میں نے کھو میں جھانکا، اندر اس اتنی کچھلی کہ صرف ایک شخص دونوں جاہ کی چٹانوں کو

ایسا افسانہ ہے جس میں ایک شخص نے اپنی زندگی بھر کے لیے ایک لمحہ کی بات کو یاد رکھا۔

اب صورت حال کچھ یوں تھی کہ ہمیں ہاتھ پر یہ غار تنگ ہوتی اور اٹھتی چھت سے چالنی تھی اور وہاں مکمل اندھیرا تھا۔ اور دائیں جانب میرا پورا جسم چٹان کی اوٹ میں ہو چکا تھا ایسے کہ کھوہ کے وہاں پہنچنے پر بھی کھڑا کوئی شخص یہ نہیں جان سکتا تھا کہ اندر کوئی ہے۔ کوئی روپوش ہے۔

میں دیوار سے لگے کندھوں کو آگے کر کے جیسے جھانکتے ہیں ذرا آگے ہو کر جب اس اوٹ سے دائیں جانب نظر کرتا تھا تو کھوہ کے وہاں کے نیچے اُحد کی بستی نظر آتی تھی جو ان دنوں جنگ کا میدان تھا۔ مکان... ٹیلی ویژن ایریل... چھتوں پر سوکتے کپڑے... جگ گھیاں اور ان سے پرے حضرت حمزہؓ کے مدفن کی چار دیواری دھوپ میں مدھم ہوتی دکھائی دیتی تھی۔ چار دیواری سے آگے غیر اندازوں کا ٹیلہ بلند تھا۔ اور ٹیلے پر جو چند لوگ کھڑے تھے وہ تب تک پتھر کے گلتے تھے جب تک کہ پتھر ان میں سے کسی ایک کے حیران کن کوفضا میں پھڑپھڑاتی نہ تھی۔

شیخ صاحب میرے گھٹنوں کی سطح پر تھے "پوشیدگی کے لیے اس سے زیادہ مناسب مقام نہیں ہو سکتا تھا۔ یہاں جہاں آپ بیٹھے ہیں یہاں کسی کی نظر نہیں جاسکتی تھی اور ذرا آگے ہو کر اُحد کے میدان میں برپا جنگ پر بھی نظر رکھی جاسکتی تھی۔"

یہاں سے میدان کی سطح پر وہ چٹان بھی نظر آ رہی تھی جس کے دامن وہ گڑھا تھا۔ تو یہ کڑیاں ملتی تھیں۔ واقعات کی ترتیب یہی ممکن تھی۔

اچانک عتبہ بن ابوقحاص اور ابن قتیہ نمودار ہوئے۔ ان دونوں نے رسول اللہ کو قتل کرنے کی قسم کھائی تھی۔ عتبہ کے پتھر سے رسول کا ہونٹ کٹ گیا اور دائیں طرف کا نیچے کا دانت ٹوٹ گیا۔ ابن قتیہ نے تلوار کا وار کیا جس کی شدت سے خود کی کڑیاں رسول کے رخساروں میں جھنس گئیں۔ آپ کی پیشانی عبداللہ بن شہاب کے وار سے زخم آلود ہوئی۔ آپ یا تو زخموں کی شدت سے غد حال ہو کر گڑھے میں گر گئے یا پھاؤ کی خاطر اس میں کود گئے۔ امکان غالب ہے کہ گر گئے کیونکہ ابوعامر نے مسلمانوں کو ہلاک کرنے کی خاطر یہ گڑھے کھودے تھے اور ظاہر ہے انہیں مٹی اور پتھروں سے ایسے پھسایا ہوگا کہ وہ نظر نہ آئیں۔ اسی لیے گرنے کا امکان زیادہ نظر آتا ہے۔

حضرت علیؓ نے جھک کر رسول اللہؐ کا ہاتھ تھاما اور طلحہ بن عبید اللہ نے سہارا دے کر آپ کو اٹھایا اور سیدھا کھڑا کیا۔

کیا اسی مقام پر حضورؐ کو گڑھے سے باہر نکال کر مالک بن نسان نے چہرے سے خون چوس چوس کر خوکا نہیں۔ لگن گئے۔ اور کیا وہیں ابوعبیدہ بن الجراح نے اپنے دانتوں سے حضورؐ کے رخساروں میں دھنسی کڑیاں نکالی تھیں؟ بے شک ایسا بھی ہو سکتا ہے لیکن عام طور پر ایسے مقام کو دشمن کے حملے کے

تھام کر کھڑا ہو سکتا تھا۔
شیخ صاحب نے کرم کیا اور پھر "آئیے" کہا اور اس مرتبہ میں ان کا شکر گزار ہوا کہ وہ پہلے مجھے اندر جانے کا کہہ رہے ہیں۔

میں دو قدم آگے ہوا تو روشنی یکدم کم ہو گئی۔ گھٹ گئی۔ فرش بھی۔ یعنی جہاں انسان کھڑا ہو سکتا تھا بس دو چار قدم کا ہی تھا اور اس کے آگے پتھروں کا ایک ڈھیر یوں اونچا ہوتا تھا کہ ذرا دور جا کر چھت سے جا لگتا تھا۔

اور کھڑے ہونے کے لیے بھی ایک شخص کی گنجائش تھی۔ پہلو پہلو دو افراد کا کھڑا ہونا ممکن نہ تھا۔ چٹانیں اس مختصر کھوہ کو بھیج کر اس کا وجود ختم کرنے کے لیے قریب ہوتی جاتی تھیں۔
شیخ صاحب میرے پیچھے کھڑے تھے اور وہاں سے جتنی بھی روشنی آ رہی تھی وہ بھی مزید گھٹ گئی تھی۔

یہاں روپوش ہونے کے لیے تو کوئی کونہ کھدرا نہ تھا۔ نیم تاریکی میں جگ ہوتی چٹانوں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ یا پتھروں کا ایک ڈھیر تھا۔ اور تب مجھے دائیں ہاتھ پر جہاں میں کھڑا تھا وہاں سے وہاں تھا اوپر ایک خلاء سادکھائی دیا۔ چٹانوں میں قدرتی طور پر وجود میں آنے والی ایک ایسی گنجائش اور اتنی سی کہ اُس پر ایک شخص کھوہ میں پاؤں لٹکا کر آسانی سے بیٹھ سکتا تھا۔

اس کھوہ میں اور کوئی جگہ نہ تھی سوائے اس چھوٹی سی پتھریلی نشست کے۔
حضورؐ نے اگر اس کھوہ میں پناہ لی تھی تو اس پتھریلی قدرتی نشست کے سوا اور کوئی مقام نہ تھا جہاں وہ بیٹھ سکتے۔

شیخ صاحب بھی مجھ سے اتفاق کرتے تھے۔ یہی جگہ ہو سکتی تھی۔
نیچے سے اُحد کے دامن میں پھیلی ہوئی بستی سے کوئی بھی اور اس جانب نہیں آ رہا تھا۔
کھوہ میں ہم دونوں ہی تھے۔ اور اسی سوچ میں تھے کہ اس پتھر پر چڑھ کر بیٹھنا چاہیے یا نہیں۔

"آپ بیٹھیں گے شیخ صاحب۔"
"نہیں جی۔" شیخ صاحب بھی میری طرح اس مقام کے رعب میں تھے۔ "آپ بیٹھیں۔"
انہوں نے میرا ایک ہاتھ تھاما۔ پتھریلی میں نے کھوہ کی چھت پر جھکا کر اپنے آپ کو ذرا اوپر کیا اور دیر تا دیر اسی پتھریلی نشست پر جا بیٹھا۔ بدن میں جو ایک خفیف سی لرزش تھی وہ جس کیل کو جسم دیتی تھی اس سے کسی کو آگاہ نہ کیا۔ وہاں سے اس کو اندازہ نہیں۔ میری پشت کھوہ کی دیوار کے ساتھ لگی تھی۔

پیش نظر فوری طور پر چھوڑ کر زخمی کو پہلے کسی محفوظ مقام پر پہنچایا جاتا ہے اور پھر اس کی دیکھ بھال کی جاتی ہے۔ اور اگر گڑھا وہاں تھا اور یہاں سے نظر آ رہا تھا اور صحابہ کرام انہیں اُحد پہاڑ پر لے گئے تھے یا وہ ذرا بلندی پر چلے گئے تھے تو یہ "ذرا" بلندی یہی ہو سکتی ہے اور اس کھوہ کے سوا اور کوئی پناہ گاہ نہیں ہو سکتی اور بے شک ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ رسول اللہ کے زخمی چہرے سے خون اس کھوہ میں چوسا گیا تھا اور ابو عبیدہ نے بھی یہیں رسول کے رخساروں کو بوسہ دینے کا مرتبہ حاصل کیا تھا۔ کھوہ کے باہر ذرا سی بلندی پر اُحد کے میدان میں انہی کو تلاش کرتے قریش کو وہ صاف نظر آ سکتے تھے۔ اس لیے اس کھوہ میں ان کا پناہ لینا قدرتی بنتا تھا۔ اور یہاں اس پتھر کی نشست کے سوا اور کوئی جگہ نہ تھی جہاں وہ آرام کر سکتے اور جیسے شیخ صاحب کھڑے تھے صحابہ کرام ان کے گھٹنوں کی سطح پر ہوتے۔ اس صورت میں یہ خیال بھی دل کو دہلا دیتا ہے کہ اس کھوہ کے اندر یا باہر دہانے کے قریب کیسے کیسے نایاب لوگ کھڑے تھے۔ یہ مستند تاریخ نہیں ہے۔ محض میرے اندازے ہیں۔ کچھ حساب کتاب ہے۔ ہو سکتا ہے مقامی روایات درست نہ ہوں۔ یہ گڑھا وہ نہ ہو۔ یہ ذرا سی بلندی کہیں اور ہو۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ گڑھا وہی ہے اور ذرا سی بلندی یہی ہے اور یہی کھوہ ہے جس میں صحابہ کرام اپنے رسول کو لے کر آئے تھے اور ان کی دیکھ بھال کی تھی کہ سارے اشاروں کے قدرتی رخ اسی جانب چلے آتے ہیں۔

"جہاں میں ہوں۔ اسی جانب" میں نے سوچا اور بدن کی لرزش میں اضافہ ہو گیا۔ اور مجھے پہلی بار شدت سے احساس ہوا کہ مجھے اس نشست پر نہیں بیٹھنا چاہیے تھا۔

غار کی چھت میں ایک چھوٹا سا شگاف تھا جس میں سے کچھ دھول اور چند میٹکیاں گریں۔ شاید اُحد پر ہوا تیز ہو چلی تھی۔

میں دیوار سے ٹیک لگا تا تو دائیں جانب جو چٹائی پردہ تھا اس کی اوٹ میں ہو جاتا اور جب ذرا آگے ہو کر کھوہ کے باہر دیکھتا تو اُحد کی بستی پھیلتی ہوئی تیر اندازوں کے ٹیلے تک چلی جاتی جس پر چڑھنے والے زائرین اب حرکت کرتے دکھائی دے جاتے تھے۔ لیکن اس کے سوا میں نے یہ بھی دیکھا کہ نیچے سے چند زائرین اوپر آ رہے ہیں۔ ہماری تنہائی ختم ہونے کو تھی۔ چودہ سو برس کی تنہائی کا صرف ایک لمحہ میری گرفت میں آیا تھا اور مجھے ہرا بھرا کر گیا تھا۔

میں اس نشست سے جدا ہو کر اُٹھنے کو تھا۔ اوٹے کی چٹان سطح پر ہتھیلی جما کر اترنے کو تھا جب میرا ایک سانس تو ایک معمول کا سانس تھا اور دوسرے سانس میں ایک ہلکی سی مہک تیرتی آگئی۔ اتنی ہلکی کہ اسی پر نہ ہونے کا گمان بھی گزر سکتا تھا۔ جیسے ہوا سنگھار کے کھول جب سردی میں سورج کی پہلی کرنوں کی تاب نہ لا کر ڈنٹھلوں سے جدا ہو کر گرتے ہیں تو ان کی خوشبو کبھی ہوتی ہے کبھی نہیں ہوتی۔ یا سرشام

بلند ہمارے ہاتھوں میں سے جو ہاں اٹھتی ہے۔ یا جیسے ایک تھلی آہستہ سے ایک رخسار پر اترتی ہے تو ہاتھوں کو بھی جاتا ہے اور نہیں بھی ہوتا۔ ایسے یہ مہک ہلکی تھی۔ لیکن تھی۔ ایک عجیب سا آشنا خوشبو کہیں آس پاس قیام کرتی تھی اور مجھے اپنے ہونے کی دے پاؤں خبر دیتی تھی۔

وہاں ایک ہلکی ٹھٹھکی تھی۔ میں نے اوٹ کے پتھر کو دنگھا کیا اس میں سے آ رہی ہے۔ وہ اٹھا کر چھت کی جانب دیکھا۔ کون سا پتھر ٹھٹھکا رہا ہو رہا تھا۔ از گہائے آید ایں ٹھٹھکا۔

اند میرے رسول کی خوشبو تھی۔

اس کی تو جیسے بہت ہو سکتی ہیں۔ اور غالب امکان ہے کہ درست ہو سکتی ہیں۔ یہ کسی زائر کے لہاؤں کا ساتھ چھوڑ کر یہاں رو گئی تھی۔ کسی عقیدت مند نے کسی معطر روٹی کے گالے سے ان پتھروں کو چھوا ہوگا۔ کوئی ایسی مہک نہیں ہے جو چودہ سو برس تک قائم رہے۔ ہواؤں میں قیام کر جائے۔ زائر کھوہ کے دہانے تک آ کر منتظر تھے۔

وہ مہک ایسی تھی کہ میں اس سے شناسا نہ تھا۔ میرے منتھوں میں ایسی خوشبو نے میرے بدن کو اس میں بھگوایا نہ تھا۔ نہ تو اس میں مغرب کی خوشبوؤں کا کوئی شائبہ تھا اور نہ ہی یہ مشرقی تیز اور دماغ کو بھل کر دینے والی تھی۔

اگر میں آج تک ایسی مہک سے شناسا نہیں ہوا تھا تو اسے کیسے بیان کر سکتا تھا۔ جیسے میں اپنے والد صاحب کا لمبل کا کرتہ درست کرتے ہوئے ان کے شاندار مگر زوال پذیر بدن پر بھٹکا تھا تو اس میں سے سادگی اور پاکیزگی کی حامل ایک مہک آتی تھی شاید ویسی۔ یا میری والدہ کے دوپٹے میں سے سوت پٹے اور بامتا کی جو خوشبو صرف میرے لیے ہی تخلیق ہوتی جاتی تھی ویسی۔

یہ سب کچھ بھی اس مہک میں تھا اور اس کے سوا کچھ اور بھی تھا۔

کیا تھا۔ کیا کہوں کہ کیا تھا۔

مجھے کچھ غرض نہ تھی کہ یہ مہک کسی زائر کے لہاؤں کا ساتھ چھوڑ کر یہاں رو گئی ہے یا کسی معطر روٹی کے لہس سے وجود میں آئی ہے۔ میرے لیے یہ میرے رسول کی خوشبو تھی۔

شیخ صاحب نے کچھ ذکر کیا اور نہ ہی میں نے کچھ حیرت کا اظہار کیا لیکن اس کے باوجود ہم دونوں جانتے تھے کہ کیا گزر رہی ہے۔

باہر منتظر زائرین اب صبر کا دامن چھوڑنے کو تھے۔ وہ کھوہ کی نیم تاریکی میں کھڑے شیخ صاحب کو دیکھ رہے تھے کہ میں ان کی نظروں سے اوجھل تھا اور وہ بے چین ہو رہے تھے کہ آخر یہ ایک

کا اظہار کیا۔

”شیخ صاحب! آپ بھی تھوڑی دیر کے لیے بیٹھ جائیے۔ میں آپ کا ہاتھ تھامتا ہوں۔“
 ”نہیں جی۔“ وہ عجیب سی حالت میں تھے۔ ”آپ جانے کیسے بیٹھ گئے۔ مجھ میں تو استقامت نہیں۔“ وہ آگے ہوئے۔ اس پتھر کی نشست کو متعدد بو سے دیے اور پیچھے ہو گئے۔ میں نے بھی رخصتی سے پیشتر کچھ دیر اپنے لب اس پتھر کی نشست پر ثبت رکھے۔ دائیں بائیں جہاں بھی ہاتھ کے ہاتھوں کے شائبے ہو سکتے تھے ان کو چوما۔ بے شک شرک کا مرتکب ہوا۔ پر عشق شرک کے بغیر عشق نہیں ہوتا۔
 کھوہ میں سے نکلنے سے پیشتر میں نے جب پیچھے مڑ کر اس کی تاریکی میں وہاں تک نظر کی جہاں محبت کی چٹانیں جھک کر اور فرش کے پتھر بلند ہو کر آپس میں ملتے تھے تو وہاں ان کے گلم جہاں محبت محفوظ نہ جاسکتا تھا۔ وہاں میں نے دو بھڑکتی ہوئی آنکھیں دیکھیں۔ گھپ اندھیرے میں ایک حیوانی چمک والی آنکھیں اور میں واقعی یکدم بہت ڈر گیا۔ ایسے مقام پر ایسی آنکھیں آگھیں۔ یہ کیا تھا۔ اور پھر ذرا غور کیا اس تاریکی کو عادت کر کے جانا کہ یہ ایک نئی ہے۔ اور مجھے گھورتی جا رہی ہے۔ جب ہم اس کھوہ میں داخل ہوئے تھے تو میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ وہاں نہیں تھی۔
 کہاں سے آگئی ہے۔
 کس کی ہے؟

بلیوں کے باپ کی تو نہیں۔ کہ ابو ہریرہ بھی اصحاب صفہ کے تھوڑے پردن رات کرتے حضور کو اپنے حجرے میں سے کبل کے پردے میں سے باہر آتے اور پھر رات گئے لوٹتے ہر وقت اپنی نظر میں رکھتے تھے تو کیا پتہ ابو ہریرہ کی بلیوں کی نسل میں سے یہ نئی بھی نظر رکھتی ہو کہ اس کے باپ کے محبوب جس کھوہ میں کبھی پناہ لینے کے لیے آئے تھے تو اس کھوہ میں کون کون آتا ہو۔ نظر رکھتی ہو۔

”شیخ صاحب! بلی۔“

”شیخ صاحب چونک گئے۔“ کہاں؟

”وہاں۔“ میں نے اشارہ کیا۔

انہوں نے زبرد لب کچھ پڑھا اور کہنے لگے ”مارڑ صاحب اب یہاں سے نکل چلیں۔“ لیکن وہ اس بلی کی وہاں موجودگی سے بے حد متاثر ہوئے تھے اور جب ہم دونوں کھوہ سے باہر آئے تو مختصر لڑائیوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگے ”ہریرہ۔۔۔ ہریرہ۔۔۔“

اور انہوں نے جو مختصر لڑائی کی کبھی صاحب کے ذہن میں کچھ فوری ہے جو ہریرہ ہریرہ کرتے باہر آ رہے ہیں۔ بھلا ادھر ہریرہ کہاں سے آگئی۔

شخص جو اندر کھڑا ہے تو دائیں جانب چہرہ کیے کس سے باتیں کر رہا ہے۔ گئے دیکھتا ہے۔ کیا یہ خود سے ٹھوکھام ہے۔ یہ باہر آئے گا تو ہم اندر جائیں گے۔

وہ مہک ایسی تھی کہ مسلسل سانس کا حصہ بنی رہتی۔ ابھی کچھ بھی نہیں۔۔۔ خالی ہوا ہے اور ابھی پھر سے وہ سانس میں سانس لیتی ہے۔ میں نے ایک گہرا سانس بھرا۔ اور اس مہک کو خوب محسوس کر کے اپنے اندر اتارا۔ اور اترنے کا ارادہ کیا۔ اس پتھر کی پوشیدہ نشست سے اٹھنے کے لیے دایاں ہاتھ پتھر کی اوٹ پر رکھا اور دوسرا ہاتھ بڑھا کر اپنے سامنے جھکی ہوئی چٹان پر ثبت کر کے اترنے کو تھا۔ پھر ایک خیال آ گیا۔ میں رک گیا۔ اتر نہیں آؤں انہی جگہوں پر ہاتھ رکھے ٹھہر گیا۔ کیونکہ ایک خوابیدہ خلیہ دماغ کا بیدار ہوا اور اس میں سے لمس کا ایک جھرنا بہنے لگا۔

اس نشست پر چڑھ بیٹھنے کے تو دو چار طریقے ہو سکتے تھے لیکن یہاں سے نیچے اترنے کے لیے اس کے سوا اور کوئی طریقہ نہ تھا کہ انسان ایک ہاتھ سے اس چٹانی اوٹ پر تھیلی پھیلا کر اپنے آپ کو سہارا دے کر ذرا آگے لے جائے اور پھر دوسرا ہاتھ سامنے جو چٹان تھی اس پر جما کر نیچے اتر جائے۔ اس کے سوا اور کوئی طریقہ ممکن ہی نہ تھا۔ تو لمس کا ایک جھرنا یوں پھوٹا کہ حضورؐ نے اس پناہ گاہ سے اترتے ہوئے اپنی تھیلی بس یہیں رکھی ہوگی اور لامحالہ دوسرا ہاتھ اس چٹان پر رکھا ہوگا سہارے کے لیے۔ میں ایک بار پھر پتھر ہو گیا۔ اُسی حالت میں منجھ سا ہو گیا ایک ساکت تصویر ہو گیا۔ اور میں پتھر ایسا ہوا اُسی حالت میں جیسے اس اوٹ سے تھیلی اٹھا لوں گا۔ چٹان پر سے ہاتھ پرے کر لوں گا تو یہ کھوہ منہدم ہو جائے گی۔

میں اترنے والا تھا اور اترنے کی حالت میں پتھر ہو گیا تھا تب شیخ صاحب کہنے لگے ”کیا ہوا ہے؟“

میں نے اسی ساکت حالت میں انہیں اس کیفیت میں شامل کر لیا۔ ”شیخ صاحب! اگر اپنے بابا نے اسی کھوہ میں پناہ لی تھی اور یہیں بیٹھے تھے تو یہاں سے اترتے ہوئے انہوں نے یہیں تھیلی بھائی تھی۔ یہیں۔۔۔ جہاں میری تھیلی ہے۔ اور اسی چٹان کا سہارا لیا ہوگا جسے میرا ہاتھ تھامتا ہے۔ اسی طور ان کے پاؤں کھوہ کے فرش سے ذرا اونچے ہوں گے۔ تو اترنے کے لیے۔“

میں شاید کچھ دیر اسی حالت سکوت میں رہتا۔ چودہ سو برس پیشتر کی ہاتھوں کی لکیروں پر اپنی تھیلی رکھ کر ان میں سے کسی ایک لکیر کو اپنی قسمت میں شامل کرنے کی آرزو کرتا تھا لیکن کھوہ کے باہر جو مختصر تھے وہ ناگوار سی کا اظہار کرتے تھے اور میں نے اپنی تھیلی اور ہاتھ کو بے مشکل الگ کیا۔ لیکن الگ کرنے سے پیشتر نیچے اتر گیا۔ باہر جو مختصر تھے انہوں نے یکدم ایک اور شخص کی موجودگی پر حیرت

غار کے باہر کی ہوا سراسر خالی تھی۔ اس میں کوئی ٹھٹھک نہ تھی۔

ہم دونوں اصحاب کہف میں سے تھے کہ جبل اُحد کی اس غار میں سے باہر آئے تو زمانے کی زد میں آ گئے۔ چودہ سو برس پیشتر سوئے تھے تو اب کہیں جا کر بیدار ہوئے تھے اور باہر زمانہ بدل چکا تھا۔ ان زائرین میں سے جو کھوکھو کے اندر جانے کو تھے کسی نے بھی مجھ سے نہ پوچھا کہ اندر کیا ہے؟ اگر کوئی پوچھتا تو ”اندر“ جیسے ایک عالم خواب میں... میں کہتا ”اندر میرے رسول کی خوشبو ہے۔“

”جذہ میں ہونا بس ایسا ویسا ہی ہوتا ہے۔۔۔

غار حرا پر اٹکی ہوئی سوئی ”برسورے“

میں مدینے سے لوٹ آیا تھا اور جذہ میں تھا۔۔۔

اور جذہ میں ہونا کیسا ہوتا ہے۔۔

بس ایسا ویسا ہی ہوتا ہے۔۔

جو ہونا ہوتا ہے وہ مدینے میں اور مکے میں ہونا ہوتا ہے۔ جذہ میں کیا ہونا ہوتا ہے۔ جذہ پہنچ کر میں نے اگرچہ منہ دل کبے شریف ہی رکھا۔ عمرے کیے، ثواب کمائے لیکن میرے ذہن کی کند ہو چکی سوئی۔ غار حرا کے ریکارڈ پر ہی اٹکی رہی۔

ہاں پچھلے زمانوں میں ہم اتنی آسانی سے اپنے من پسند گیت اور غزلیں یوں ڈی ڈی ڈی میں ایک سی ڈی داخل کر کے اس کے ریوٹ پر ایک پورے ایک نمبر چھو کر ہمد وقت نہیں سن سکتے تھے۔ اس معصوم خواہش کے لیے ایک بھونپو والا۔ گراموفون درکار ہوتا تھا۔ پھر ہم اپنا پسندیدہ اٹھنچر گردشوں والا ساہوکار ملک کا تواریکار ڈسٹلاش کرتے تھے جس پر ایک عدد ڈاکی بھونپو کے سامنے بیٹھا سہگل کاٹن ہالا یا شوریدہ کوکان کھڑے کیے ہوئے نہایت اشتیاق اور گہری توجہ سے سن رہا ہوتا تھا۔ اس ریکارڈ کو گراموفون پر چڑھایا جاتا تھا اور پھر سونیوں کی ڈبیا سے ایک نئی سوئی اس کے بازو میں فٹ کر کے اس کا بیج کس کر اسے پلاسٹک کے گھومتے ہوئے ریکارڈ کے آغاز میں احتیاط سے رکھ دیتے تھے اور تب جا کر کہیں اس میں سے ایک گہری آواز ”برسورے۔“ کی برآمد ہوتی تھی۔ لیکن جب سوئی کند ہو جاتی تھی۔ گھس جاتی تھی تو اپنی مرضی سے کہیں اٹک جاتی تھی اور ”برسورے۔ برسورے۔“ پر رُک جاتی تھی۔ کچھ اسی طور پر میری قلمی کتاب کی سوئی ”حرا۔ حرا۔ حرا۔“ پر اٹکی ہوئی تھی۔ اس کا کچھ مداوانہ ہو سکتا تھا کہ ذہن کی ڈبیا میں اس کی ایک سوئی تھی جو کند ہو چکی تھی۔۔۔

UrduPhoto.com

UrduPhoto.com

UrduPhoto.com

”میں غار حرا میں ایک رات گزارنا چاہتا ہوں۔“

”نہیں ابو۔“ سلجوق نے مسکرا کر ایک خاص بزرگانہ فکر مندی سے میری طرف دیکھا۔

”لیکن بیٹے کیوں نہیں؟“

وہ حج کے زمانے تھے۔

صلائے عام تھی یا ران نکتہ واں کے لیے۔ اور نکتہ واں تقریباً پچیس لاکھ کے قریب تھے تو ان میں ایک نقطہ یعنی میں کہاں شمار ہوتا تھا۔ کہاں دکھائی دے سکتا تھا۔ تو ہم غار حرا تک بھی انہی زمانوں میں گئے تھے۔

اسی برس میں فروری کے مہینے میں ہی تو گئے تھے لیکن لگتا تھا کہ زمانے بیت چکے ہیں۔

کعبہ کا سیاہ پوش مکعب۔ آنکھوں میں گھٹی سبز باس بھرنے والا گنبد۔ اصحاب صفہ کا تحضر۔ بس یہی تو چار خواہشیں تھیں جن پر دم نکلتا تھا۔ پہلی تین تو پوری ہو گئیں اور چوتھی دو چار ہاتھ رہ گئی۔ لب بام نہیں کہ ہم اوپر نہیں بام سے نیچے محن میں اترنا چاہتے تھے۔

انہی زمانوں میں میرا بلند قامت بچہ نمبر اور میں غار حرا کے بام پر۔ چھت پر نہایت آسودگی سے براجمان غار کے اندر نوافل ادا کرنے کے بعد جو مردوزن اس ہجوم میں سے نکلتا چاہتے تھے ان کے بڑھے ہوئے ہماری جانب بلند ہوتے ہاتھ تمام کرانہیں سہارا دے کر اوپر لاتے تھے اور محض یہی ثواب کمانے پر اکتفا کرتے تھے کہ جن پتھروں پر وہ اپنے ماتھے چھو کر آتے تھے ان تک ہماری رسائی ممکن نہ تھی۔

جس محن میں دس پندرہ لوگوں کی بھی گنجائش نہ تھی وہاں پچاس ساٹھ مردوزن پیک ہوئے حرا کی غار کے اندر نوافل ادا کرنے کے لالچ میں ٹھنسنے پڑے تھے۔

میں جو نیکی چھت سے ان کے اوپر کود پڑنے کا سوچتا تو نمبر میری سوچ کو پڑھ لیتا اور میرا بازو تمام کر کہتا ”نہیں ابو۔“

تو میری یہ چوتھی خواہش ادھوری رہ گئی اور دم نکلتا رہا۔

یہ وہی لمحہ تھا جب میرے ذہن کی سوئی کند ہو کر غار حرا پر اٹک گئی۔ میں نے سوچا کہ نہ میرا

ارادہ تھا اور نہ ہی کوئی اتنی شدید خواہش تھی اور یونہی سبب لہنے گئے اور میں چلا آیا۔ اسے اگر بلا دے گا نام

دیا جائے تو جس نے بلایا تھا وہ یقیناً کبھی نہ کبھی اپنی بلا دے کی فہرست پر نظر ثانی تو کرے گا اور آگاہ ہو

جائے گا کہ یہ جو سرخ آنکھوں والا لکھتے بھرا لکھتے بدن والا ہے اس کے ذہن کی سوئی کند ہو کر

اٹک گئی ہے۔ جو اس لمحے غار حرا کی چھت پر ایک تنہا کتاب کا مادہ چوتھی خواہش کی تکمیل نہ ہونے پر

اس کا دم نکلتا ہے۔ صرف اقراء کے جہان کے پتھروں میں دو سانس لینا چاہتا ہے۔ دو نفل ادا کرنا چاہتا ہے۔ تو اسے پھر سے بلایا جائے۔ اس کی تنہا پوری کر دی جائے۔ اس کے ذہن کی کند سوئی کو اسی کی تنہا کی سانس لگا کر تیز کر دیا جائے۔ تاکہ یہ اقراء کا گیت بغیر کسی انگ کے سن لے۔

اور جب مجھے قنطر کے بین الاقوامی ایوارڈ سے نوازا گیا تو پہلا خیال نہ اعزاز کا آیا اور نہ انعامی رقم کا۔ بس نوازیئے جانے کا خیال آیا کہ بلا دے کی فہرست پر نظر ثانی ہو گئی ہے۔ یہ ایوارڈ تو محض ایک ہمارا ہے۔ میں دن رات میمونہ کے ساتھ غار حرا تک پہنچنے اور وہاں نہ صرف دو نفل ادا کرنے کے بلکہ کچھ دیکھ کر اڑنے کے بارے میں باتیں کرنے لگا۔

حج کے زمانے میں بہت لوگ ہوتے ہیں۔ اب کم لوگ ہوں گے۔ ہو سکتا ہے محن میں صرف اس بارہ لوگ ہوں تو مجھے اندر جانے کا موقع مل جائے۔ ہو سکتا ہے وہ لوگ میرا کچھ لحاظ کریں اور میں کچھ اور وہاں طہرار ہوں۔ دو چار پتھروں کو ہاتھ لگا سکوں۔ دو چار سانس لے سکوں جہاں کچھ سانس ٹھہرے ہوں۔ جن ان سانسوں میں سانس لے سکوں۔ اور میمونہ نے جو عام طور پر مجھے دیوانہ جانتی ہے اس چوتھی خواہش کی تکمیل کی بے صبری کو قطعی طور پر دیوانگی نہ جانا اور مکمل طور پر مجھے سپورٹ کیا کہ ہاں تمہیں ہر صورت میں غار حرا تک اور اس کے اندر جانا چاہیے۔

ایک روز میں نے استفسار کیا ”مونا بیگم۔ نہ تم نے میری اس دیوانگی کا ٹھٹھا اڑایا ہے۔ نہ

انہی خواہشیں مسکراہٹ سے میری دل شکنی کی ہے جو کہ تم اکثر کرتی ہو۔ تو اس بار ایسا کیوں ہے؟“

تو اس نے نہایت بردباری اور متانت سے جواب دیا ”تمہاری اکثر گھمٹیں اور جذبے عارضی

ہوتے ہیں۔ تم یکدم کسی ایک منظر ایک کتاب یا ایک چہرے کے سحر میں گرفتار ہو کر کچھ بوجھ سے عادی ہو

جاتے ہو اور میں انتظار کرتی ہوں اور وہ لمحہ آ جاتا ہے جب وہ سحر زائل ہو جاتا ہے اور تم پھر سے نادل ہو

جاتے ہو۔ جیسے وہ سحر کبھی تھا ہی نہیں۔ لیکن میں نے محسوس کر لیا ہے کہ یہ سحر عارضی نہیں۔ یہ خلل جانے والا

نہیں۔ اس لیے میں چاہتی ہوں کہ تمہاری یہ چوتھی خواہش پوری ہو جائے۔ اسی میں ہم دونوں کی بہتری

ہے۔“

میمونہ مکمل طور پر میرا ساتھ دے رہی تھی۔

لیکن میرے بچے میرا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔

وہ بھی میرے ذہن میں جو عارضی طور آتے تھے ان سے واقف تھے اور اسے ایک وقتی اہمال

کچھ کہ میری خواہش کے اظہار پر اگرچہ فکر مندی سے لیکن مسکراتے تھے۔

تو جب میں نے مہینے سے والہی ہے۔ ہذا میں کچھ روز اس کے ایک شام یہ کہا کہ میں

سلجوق نے آخر میں جو یہ "تو اب چلیز" کہا تو گویا میرے دل میں چسید کر دیا، اس کے بعد وہ اپنے ممر سید و باپ کے لیے ایسی محبت بھری پر چھائیاں سیاہ ہوئیں کہ میں نے فی الفور پیار وارہ کر دیا۔

"ابو آپ جانتے ہیں کہ ان دنوں سعودیہ میں بہت بکڑھکڑ ہو رہی ہے... حکومت اس وقت گردی سے اتنی دہشت زدہ ہو چکی ہے کہ اپنے پرانے کی تیز نشیں کر سکتی، اب آپ ہی فیصلہ کریں کہ اگر آپ وہاں اوپر جاتے ہیں اور رات گزارنے کا قصد کرتے ہیں اور وہاں پولیس چیک کرنے کو آجاتی ہے تو پھر آپ کی کون سے گا... میرا خیال ہی نہیں یقین ہے کہ وہاں سرے سے رات گزارنے کی اجازت ہی نہیں دینا... میں یہاں بڑے بڑے سر بھرے حضرات کو جانتا ہوں جن ان میں سے کسی ایک نے یہ بھی نہیں کہا کہ ہاں میں نے سنا ہے کہ کبھی کوئی شخص وہاں رات بسر کر کے آیا ہے... تو اگر اجازت ہی نہیں ہے تو..."

ظاہر ہے سلجوق سعودیہ کے تازہ ترین اور مخدوش حالات سے آگاہ تھا... اور درست کہتا تھا... یہ اس کے اچھے نہ تھے...

میں سمجھ سا گیا... وہ جو تمنا بے تاب ہوئی جاتی تھی اس پر اس پر گئی... اگلے ایک دو روز میں میں کچھ سنبھل گیا اور مجھے احساس ہوا کہ یہ ایک بے جواز خواہش تھی اس لیے اس کا ادوارہ جانا ہی بہتر تھا... چلے فرض کر لیجیے کہ میں غارجرا میں ایک رات بسر کر بھی لیتا ہوں تو کیا ہوگا... میں جیسا اوت کا اوت ہوں ایسا ہی رہوں گا... میری اس خواہش میں نہ مذہبی جذبات کی قوت کا کچھ عمل دخل تھا نہ آخرت کی کچھ فکر تھی اور نہ ہی ثواب کا لپکا تھا تو میں نے وہاں جا کر کیا کرنا تھا اگر ہاں کی اللہ مجھے وہاں رات بسر کرنے پر اسکا تھی تو کیا ان کی تلقین کا مجھ پہ کوئی اثر ہوا تھا... جو وہ کہتے تھے کیا میں اس پر عمل پیرا ہوا تھا... نہیں ہوا تھا ناں تو پھر اس خواہش کا جواز سوائے اس کے اور کیا ہو سکتا تھا کہ میں صرف ایک تجربے میں سے گزر کر اسے بیان کرنا چاہتا تھا... کسی طور ممتاز ہونا چاہتا تھا تو یہ عملی یا بی عمل فرضی تھی نمود کی کیسی قابل مذمت آرزو تھی... میرے پاس کوئی جواب نہ تھا سوائے اس کے کہ میرا ہی چاہتا تھا... کیوں جی چاہتا تھا؟ اس کا جواب تو جی ہی دے سکتا تھا اور وہ صرف یہ کہتا تھا کہ بس میں یہ چاہتا ہوں... جیسے کوئی بچہ یکدم ضد کرنے لگے کہ ابو میں نے غبارہ لینا ہے اور رات کے اسی پہر لینا ہے... جیسے بلی جی چاہتے لگتا تھا کہ میں نے بہر صورت جھیل کر دیکھنی ہے... سنو لیک تک جانا ہے... اور اسی میں جانا ہے... بے سود اور بے جواز خواہشیں جو ایک آوارہ گردانہ بن کے غلیوں میں ٹوٹ پھوٹ کے عمل سے ہم لیتی ہیں اور جو اس پر سوار ہو جاتی ہیں... ایسے شخص کا پاسان عقل چونکہ پیدا نہیں ہو سکتا اس

غارجرا میں ایک رات گزارنا چاہتا ہوں تو سلجوق نے ایک گہری بزرگانہ لکڑمندی سے میری طرف دیکھا "نہیں ابو..."

"لیکن بیٹے کیوں نہیں؟"

اس نے ڈانٹنگ ٹنل پر بھی روز بخاری کے پلاؤ سے لبریز ڈش میرے آگے سرکاتے ہوئے کہا "ابو... یہ بٹخ اور بخارہ کے یکینوں کا روٹ کر وہ چکن ہے... فی الحال اسے نوش فرمائیں... نہایت خست اور ہڈ ڈانٹہ ہے..."

میرا کراؤن پرنس مجھے قطعی طور پر سنجیدگی سے نہیں لے رہا تھا...

میری اکلوتی بہو رابعہ نے جب میری اس تمنا کے بارے میں سنا تو اس کی سرسبز آنکھیں شرارت سے ہری بھری پھول جھڑیاں بکھیرنے لگیں "انگل... میں ایک سعودی سکول میں انگلش پڑھاتی ہوں اور مجھے یقین ہے کہ آپ تو وہاں گرفتار ہو جائیں گے... سعودی شریطے آپ کو پکڑ کر لے جائیں گے اور پھر آپ بے شک دوپائی دیتے رہیں گے میں ایک نائب قونصل کا باپ ہوں پھر بھی پکڑ کر لے جائیں گے اور انکل ہو سکتا ہے کہ وہ نہ صرف آپ کو گرفتار کر لیں بلکہ خوب خوب ماریں بھی... ڈنڈوں کے ساتھ..."

اگرچہ میں ایک نہایت اُلفت بھرا سر تھا لیکن مجھے شک ہوا کہ میری بہو کی درپردہ ایک تمنا تھی کہ مجھے خوب خوب زد و کوب کیا جائے اور وہ بھی ڈنڈوں کے ساتھ...

یہ طے تھا کہ کوئی بھی مجھے سنجیدگی سے نہیں لے رہا تھا اور ہر کوئی سوائے میمونہ کے مجھے ذہنی طور پر کھسکا ہوا سمجھ رہا تھا...

چنانچہ یہ معاملہ میں نے مؤخر کر دیا...

کسی اور دن پر اٹھا دیا...

کوئی اور دن آیا تو میں نے پھر اپنا مدعا بیان کیا تو سلجوق مجھے سمجھانے لگا... ایسے دن تھے جب میں اسے سمجھایا کرتا تھا اور اب ایسے وقت آگئے تھے کہ وہ مجھے سمجھا رہا تھا "میرا بزرگ بن بیٹا تھا" اب! اگر تو آپ نے غارجرا میں دو نفل ادا کرنے ہیں تو اس کا بندوبست آسانی سے ہو جائے گا... لیکن یہ جو وہاں رات گزارنے کا آپ ارادہ کرتے ہیں تو یہ ممکن نظر نہیں آتا... میں نے اس دوران ادھر ادھر سے معلومات اکٹھی کی ہیں... جذبہ کے کچھ پرانے لوگوں سے پوچھا ہے... تو نصیحت میں جو قدیمی اور ہانجر حضرات ہیں ان سے ذکر کیا ہے تو سب کا یہی کہنا ہے کہ ہم نے کبھی نہیں سنا کہ کسی شخص نے غارجرا میں پوری رات گزار دی ہو... تو اب چلیز..."

اگلے میں بس اتنی قیمت میں پورا اجازت دیا جاسکتا تھا۔ نگہ اور حد سے سمیت اور اگر اس میں بپ شامل کر لیا جائے تو لحد کا سودا ہو سکتا تھا۔ ان نقد و نقد سودوں میں غار حرا کے چند پتھروں کی کیا وقعت تھی۔ پاکستان والیسی کے دن قریب آ رہے تھے۔

سلجوق اپنی امی کے لیے۔ اور چونکہ میں اس کی امی کا خاوند تھا اس لیے ضمنی طور پر میرے لیے بھی تکلف پر وگرام ترتیب دے رہا تھا۔ شہر کے پاس اور منگے ریسٹورانوں میں کھانے۔ جدہ کے دوستوں کے گھروں میں غفلیں۔ وغیرہ۔ اور یہ جو اس کی امی تھی اور میری بیگم تھی بلکہ اب بھی ہے۔ سنت جوگی۔ اپنے چٹے اور ہوش میں مست۔ بس اپنی بہو کی لاڈلی اور دل میں اتر جانے والی باتوں پر لٹو ہوئی جاتی تھی۔

اور وہ کوئی ایک تھوڑی سی تھی جو رابعہ کے گرد گھومتی تھی۔

جو کوئی بھی اس سے ملتا تھا وہ گھومنے لگتا تھا۔

اور ان میں میرا بر خور دار بھی شامل تھا جو فل پیڈ پر گھومتا تھا۔

سلجوق ان محفلوں میں۔ ان پر تکلف و دعوتوں میں۔ اپنی ٹائی کی گرہ درست کرتا۔ اپنی ڈیوٹیکل کھانگو اور مسلسل مسکراہٹ میں مگن ٹینک سنبھالتا کبھی کبھار جب میری جانب دیکھتا اور میری تمام تر مسرت اور سوشل ہونے کی اداکاری کے باوجود جب میری جانب دیکھتا تو اس کے چہرے پر ایک پچھائیں سی تیر جاتی۔ اس کے اندر کوئی نہایت ہی سپر ٹیک سسٹم نصب تھا جو اسے فوری طور پر آگاہ کر دیتا کہ اس لمحے۔ انا جو پڑ مسرت قہقہے لگا رہا ہے۔ بے وجہ ہر دل عزیز ہونے کی کوشش کر رہا ہے تو یہ اہل حال نہیں ہے۔ ابھی تک جلتا ہے۔ اداکاری کے جوہر جو اس میں نہیں ہیں انہیں دکھا رہا ہے۔ اسی گلابی جنتاب کی ناؤ میں ڈولتا پھرتا ہے۔ وہ مجھے زبردست زبردست پا کر کیسے نہ میرے دل کا حال جانتا کہ جدہ آئے والے فون کو لاہور میں اٹھا کر جب میں صرف "ہیلو" کہتا تھا تو وہ اس ایک "ہیلو" سے سب کچھ جان جاتا تھا۔ ابو آپ کی طبیعت ٹھیک ہے ناں۔ کیا بات ہے والد صاحب۔ اور والد صاحب کی طبیعت واقعی ٹھیک نہیں ہوتی تھی۔

تو وہ کیسے نہ مجھے زبردست زبردست پا کر میرے دل کا حال نہ جانتا۔

وہ جانتا تھا کہ ابا جی ناخوش ہیں۔ ان کا دل اٹکا ہوا ہے۔ جیسے ایک گولڈن فٹس پانی کی گہرائی میں تھک چلی جائے تو وہ آبی پودوں میں اُلجھ جاتی ہے۔ لاکھ نہری ہونے کی سعی کرے۔ سچ آب پر آنے کے لیے گھمڑے پھلا کر اپنے اندر آکسیجن بھرنے کی کوشش کرے تاکام رہتی ہے۔ وہیں ابھی رات ہے اگلی رات ہے۔ یوں یہ ابا بھی اٹکا ہوا ہے۔ اسی لیے وہ جب کبھی میری جانب دیکھتا تھا تو اس کے چہرے پر ایک پچھائیں سی تیر جاتی تھی۔ جیسے ایک اور کے سرے پر بندھی ہوئی نشان ایسی جیسی کنڈی کو

ہوتا ہے اس لیے کبھی نہیں اکثر دل کو تباہ چھوڑ دیتا ہے چنانچہ دل۔ دل مانی کر لے لگتا ہے۔ میں غصے میں پڑ گیا۔ بہت اُلجھ گیا۔ ہزاروں خواہشیں بے جواز ہو سکتی تھیں لیکن غار حرا میں رات بسر کرنے کی خواہش ہرگز بے جواز نہیں ہو سکتی تھی۔ جواز اگر میرے پاس نہ تھا تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہ تھا کہ جواز نہ تھا۔ وہ مقام بذات خود ایک جواز تھا اور اس نے میرے اندر یہ خواہش بھری تھی۔

کبھی اس نتیجے پر پہنچتا کہ محض حج کے ہیجان نے مجھے وقتی طور پر یہ اشتعال دلایا ہے۔ محض ایک اور تجربے میں سے گزرنے کی ہوس ہے۔ جس کھوہ میں بابا راتیں بسر کرتے تھے تو اس کے پتھروں کو جی بھر کے وہاں وہاں چھونے کے لالچ میں گرفتار ہوں جہاں جہاں اُن کا لمس اثر انداز ہوا تھا۔ سہارا لیتے۔ اندر داخل ہوتے۔ بیٹھتے۔ لیٹتے ان کا بدن جن پتھروں سے مس ہوتا تھا میں بھی ان کو چھو لوں۔ یہ کیا خواہش ہوئی۔ اور یہ خواہش تو چند لمحوں میں پوری ہو سکتی ہے تو پوری رات بسر کر کے وہاں کیا لینا ہے۔ یہی کافی ہے کہ اس بار اس کے اندر دو نفل ادا کر لوں چند جتنے گہرے سانس میں لے سکتا ہوں اتنے۔ یا ایک دوسری بھی سانس لوں اور جبل نور سے اتر آؤں۔

میں نے اپنے حتی فیصلے سے اپنی آل اولاد کو آگاہ کر دیا اور رات گزارنے کی خواہش سے دستبرداری کا بخوشی اعلان کر دیا۔

سب کے چہروں پر اطمینان بھری مسکراہٹیں نمودار ہو گئیں سوائے میمونہ کے۔ کہ وہ جانتی تھی کہ یہ بے شک کچھ بھی اعلان کرے اندر سے بے ایمان ہی رہے گا۔

چنانچہ اُس شب اس دستبرداری کی خوشی میں ہم سلجوق کے ولا سے نکل کر فلسطین سٹریٹ پر آئے۔ "مرچی ریسٹوران" میں میکسیکو کے تیز مرچوں والے پکوان اور پاپز کھائے۔ اور جدہ کی واحد تفریح گاہ جہلیا سٹریٹ میں بے مقصد گھومے۔ چند سپر سنورز اور شاپنگ مالز میں پیدل چل چل کر اپنے آپ کو بے وجہ تھکایا۔ سمندر کے کنارے لمبی ڈرائیو کی۔

جدہ کے نواح میں ایک شاپنگ کمپلیکس کی پیشانی پر "حرا" کا نیون سائن روشن دیکھ کر میں نے سوچا غار حرا نہ سہی حرا کا شاپنگ کمپلیکس ہی سہی۔ وہاں تو گھپ اندھیرا ہو گا اور یہاں برقی نور ہی نور تھا۔ سنورز۔ شور و مزہ۔ بناوٹی پھولوں کی دکائیں۔ سوٹ کیس۔ شاربک کافی۔ جاپانی معجزوں کے انبار۔ اور اُن شور و مزہ میں ایسی ایسی کاریں ہوتی جو یورپ اور امریکہ والے بھی نہیں دیکھ پاتے۔ کہ وہ انہیں انورا نہیں کر سکتے۔ اور محض سودیوں کے لیے خرسنگالی کے جذبات رکھتے ہوئے ان کی محبت میں مارے ہوئے ان مالکوں کو ادھر روانہ کر دیتے ہیں۔ اس حرا کمپلیکس میں یقیناً کروڑوں ڈالر کا ہمارے لیے سامان پیش تھا جسے کہتے ہیں کہ سامان تفریح تھا۔ کسی ایک کار کی قیمت اتنی تھی کہ حضور کے

”میرا خیال ہے آپ واپس آ کر پکن نوڈل ہی نوش کریں گے۔“ سلجوق نے اپنے دانتوں کی نمائش کی جس پر رابعہ فوراً فکر مند ہو گئی۔ ”سلجوق آپ کے دانت ہم سب سے خراب ہیں۔ ذرا آگے پیچھے ہیں۔ کسی وقت چپک کروں گی۔“ کیونکہ وہ ایک ڈینٹل سرجن ہونے کو تھی اور جب سے شادی ہوئی تھی سلجوق اس کے سامنے مسکرانے سے گریز کرتا تھا۔

”ویسے ابو۔۔۔ وہ بہت متانت سے ٹھہر ٹھہر کر بولنے لگا۔“ آئیڈیاز بردست ہے۔ یقین کیجیے میرا اگلی بہت ہی چاہتا ہے کہ آپ کے ساتھ اوپر چلوں۔ وہاں ہم دونوں ایک رات گزاریں۔“

”تو کیوں نہیں چلتے۔“

”میری سرکاری ذمہ داریاں ایسی نوعیت کی ہیں کہ۔۔۔ اگر کسی کو خبر ہو گئی تو حساس نوعیت کا معاملہ ہو جائے گا۔ ویسے ابو جو کہنا سنا وہ اپنی جگہ۔ لیکن مکہ کے گرد جو خشک صحرائی پہاڑیاں ہیں ان میں گرم علاقوں میں پائے جانے والے حشرات الارض بھی بہت ہیں۔ رینگنے والے زہریلے کیڑے۔۔۔ بچھو وغیرہ بھی ہیں تو زمین پر سونا خطرے سے خالی نہیں۔ آپ کو بلڈ پریشر کا بھی کچھ عارضہ ہے۔ اور خدا نخواستہ وہاں کوئی لہر جنسی ہو گئی تو کیا ہوگا۔“

”کچھ بھی نہیں ہوگا بیٹے۔ اگر کچھ ہو گیا تو اس سے بہتر جگہ کچھ ہو جانے کی کیا روئے زمین پر اور کس ہے؟ کبھی نہ کبھی تو کچھ ہونا ہے۔ وہاں ہو جائے تو کیا ہی نصیب والی بات ہے۔ کہ نہیں؟“

”ہاں ہے تو سہی۔“ حیرت انگیز طور پر اس نے مجھ سے اتفاق کیا اور پھر اپنی مسکراہٹ کو عیاں

کرایا کرتا رہ گیا۔ ”ویسے والد صاحب۔۔۔ اوپر جانے کی کچھ تیاری بھی کی ہے؟“

”مکمل ہے۔“ میں ٹھل کر مسکرایا چونکہ میری بیوی ڈینٹل سرجن نہ تھی۔

خوراک سمجھ کر ایک مچھلی منہ مار لیتی ہے اور وہ کنڈی اس کے گھمروں میں پروئی جاتی ہے۔ اور اس ڈور کو کوئی لکا ہوا چمپا ہوا کھینچتا ہے تو مچھلی کا کچھ اختیار نہیں رہتا۔ وہ انگی رہتی ہے۔ ایسے ہی ابابھی اٹکا ہوا تھا۔

پاکستان واپسی کے دن بہت قریب ہونے لگے۔

یہ طے کیا جا چکا تھا کہ روانگی سے ایک روز پیشتر جب ہم عمرہ کرنے جائیں گے تو فجر کے فوراً بعد جائیں گے اور پہلے غار حرا تک جائیں گے۔ نفل ادا کر کے نیچے آئیں گے اور پھر خانہ کعبہ جائیں گے۔

انکی ہوئی مچھلی کو جب رہائی کی کوئی امید نہ رہی تو ایک روز سلجوق نے نہایت سرسری انداز میں کہا ”ابا۔۔۔ میں اس دوران بیکار نہیں بیٹھا رہا۔ ہوم ورک کرتا رہا آپ کے پروجیکٹ کے بارے میں۔ میں نے خاصی تحقیق کی ہے۔ اپنے سفارتی ذرائع بروئے کار لا کر کھوج لگائی ہے کہ بظاہر تو غار حرا میں رات بسر کرنے پر کوئی سرکاری پابندی نہیں ہے۔ میرے ذرائع نے اطلاع فراہم کی ہے کہ جبل نور کی چوٹی پر رات کے وقت کچھ کشمیری لوگ قیام کرتے ہیں جو وہاں کھوکھے لگائے مشروبات وغیرہ فروخت کرتے ہیں۔ ان میں سے کچھ تو شام ڈھلے نیچے آ جاتے ہیں لیکن دو چار افراد وہیں رات گزارتے ہیں۔ پولیس وہاں جا کر چیکنگ کرتی ہے یا نہیں اس کے بارے میں کچھ علم نہیں ہو سکا۔ تو میرا مشورہ یہی ہے کہ آپ بے شک اوپر جائیں۔ غار میں کچھ دیر ٹھہریں اور پھر حالات کا جائزہ لیں۔ اگر کوئی مسئلہ نہ ہو تو۔۔۔“

”صحیح۔“ میں نے یہ لفظ تب ادا کیا جب سلجوق کے کمپاؤنڈ میں واقع سوئمنگ پول میں ایک روسی خاتون آہستگی سے اپنی تیراکی کی مشاقی کی بدولت پانی پر ایک لہر بھی ابھرنے نہ دیتی تھی۔ تیرتی جاتی تھی۔ شام ڈھلے پول میں اترتی تھی اور ایک روبوٹ کی مانند رات گئے تک تیرتی رہتی تھی۔ دیکھو۔۔۔ میں ایسا کرتا ہوں کہ شام سے پہلے۔۔۔ دن کی روشنی میں وہاں جاتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ میں ایک بار پھر جبل نور کی کٹھن چڑھائی طے کر لوں گا اور چوٹی تک پہنچ جاؤں گا۔ اگر تو وہاں زیادہ لوگ نہ ہوئے اور امکان یہی ہے کہ نہیں ہوں گے۔ تو غار حرا میں چند نفل ادا کروں گا اطمینان سے۔ کچھ دیر اس میں قیام کروں گا اور پھر نہایت ٹھنڈے دباؤ سے جہد باتیت کے بغیر حالات کا جائزہ لوں گا۔ اگر تو وہاں کوئی پابندی نہ ہوئی۔ کچھ دشواری نہ ہوئی اور اس مقام پر پوری رات گزارنے کے خیال سے میں دہشت زدہ نہ ہوا تو ٹھہر جاؤں گا۔ اور نہ تیراکی چھوڑنے سے جو جبل نور سے اتر کر سامنے سے آئے والی پہلی عکسی پ سوار ہو کر ”جہد۔ جہد۔“ نکاروں گا اور واپس آ کر ڈنر میں شریک ہو جاؤں گا اور رابعہ کے تیار کردہ پکن نوڈل نوڈل کھوں گا اور پھر کوئی چھتاؤں ہوگا۔“

۴۔ ایک تسبیح..

۵۔ ایک جائے نماز..

۶۔ ایک بہت بڑا سینڈ ویج.. پیڑ اور مکھن سے بھرا..

۷۔ کوئی اور پھل.. سیب وغیرہ..

۸۔ منرل واٹر کی بوتلیں..

۹۔ ایک عدد پتیسی..

۱۰۔ پوٹو چپس کے ایک دو پیکٹ..

۱۱۔ اگر ڈر کی وجہ سے.. یا دہشت کے باعث نیند نہ آئے تو اعصاب کو سکون دینے کے لیے

"Relaxin" کی چند گولیاں..

۱۲۔ بلڈ پریشر کی "Norvasc" اور اسپرین کی گولیاں..

۱۳۔ دور کی عینک..

۱۴۔ سگریٹ اور لائٹر..

۱۵۔ پاسپورٹ اور شناختی کارڈ..

۱۶۔ ٹشو پیپر کا ایک پیکٹ..

۱۷۔ ایک ٹارچ (یہ بہت اہم ہے)

۱۸۔ تولیہ برش اور ٹوتھ پیسٹ..

مندرجہ بالا جتنی بھی اشیاء کی میں نے تفصیل درج کی ہے ان میں وہ جائے نماز بھی شامل تھا۔
 اب رابعہ کے ابو نے خانہ کعبہ میں بسر کی گئی عبادت کی راتوں میں استعمال کیا تھا اور اس نے بہ طور خاص
 اس چیز کے کو میرے حوالے کر دیا تھا..

فہرست میں درج پیشتر اشیاء کو میں نے دبیز کپڑے کی تہتی رُک سیک میں ہاری ہاری پیک کیا
 تھا۔ اس رُک سیک کو میں نیپال سے لایا تھا اور پھر اسے قطر کے لیے روانہ ہوتے ہوئے خاص طور پر اپنے
 سامان کا حصہ بنایا تھا کہ اگر اوپر جانا ممکن ہو گیا تو کاندھے پر ڈالنے کے لیے یہ بہت موزوں ہوگا..
 پھر یہ.. جتنی بہت ہیں.. زپ سے بند ہو سکتی ہیں تو بہت موزوں ہے..

تھمبل میں کھنڈو کے پر رونق بازار میں.. جنت سے آئے ہوئے مہاجرین کی ایک دکان
 میں.. شمع رنگوں کی.. میسکیو کے پانچوڑ کے رنگوں کی.. جتنی نمونوں والی درجنوں دیدہ زیب کھڑی پر بنی
 ہوئی مصنوعات تھیں.. برس.. بیک.. ڈیپلے سوٹ کیس.. چادریں.. جاکٹیں.. اور یہ ڈھیروں میں تھیں.. اور

”فہرست سامان برائے غارجا..

تہتی رُک سیک میں“

سلجوق نہیں جانتا تھا کہ میں نے یہ تیاری اُسی روز شروع کر دی تھی جس روز یہ امکان رونما ہوا
 تھا کہ میں قطر سے فارغ ہو کر جدہ جاسکتا ہوں.. کسی بھی کوہ نور دی کی مہم سے پیشتر اُس مہم کے لیے درکار
 سامان کی فہرست تیار کرنے میں جو بیجان خیز مسرت بدن کو نکھارتی ہے وہی تو اصل ایڈ وچر ہوتا ہے.. کہ
 خیمہ جو ایک برس سے پیک پڑا ہے اُسے کھول کر دھوپ میں رکھو ہوا لگواؤ.. ڈاؤن جیکٹ چمک
 کرو.. ٹریکنگ بوٹ پہن کر ایک دو روز اُن میں گھومو.. اوئی انڈرویزر.. چترالی ٹوپی.. فلسطینی رومال.. اور
 برف کی راتوں کے لیے خشک گوشت.. پیڑ.. سارڈین مچھلی.. خوراک کے نمین.. کافی.. دلی
 گھی.. چاول.. وغیرہ وغیرہ.. تو میں نے اس ”مہم“ کے لیے بھی کہ غارجا تک پہنچنا بھی تو ایک کوہستانی مہم
 تھی.. جبل نور بے شک بہت بلند تھا لیکن ایک پہاڑ تھا اور اُس کی چوٹی پر پہنچنا تھا اور وہاں قیام کرنا تھا تو
 میں نے اس مہم کے لیے بھی سامان کی ایک فہرست تیار کر رکھی تھی.. جس کی تفصیل میں ہو بہو نقل کیے
 دیتا ہوں..

”سامان غارجا“

۱۔ ایک عدد چھوٹا سا رُک سیک..

۲۔ گرم ازگم پاؤ بھر کھجوریں.. باگراجوئی ہوں تو بہتر ہے (کہ حضور اُس بلند آماجگاہ میں قیام

کے دوران یہی پھل استعمال کرتے تھے)

۳۔ دودھ کی ایک بڑی بوتل.. (شاید خاتون جنت.. یا ایک اور فاطمہ چھوٹی سی بی بی کی

حیثیت میں نشیب میں واقع وادی سے حضور کے لیے بکریوں کا تازہ دودھ اُچے لے کر جاتی تھیں)..

”تخت ہزارے لے چل بکھیا“

چنانچہ اگلی دوپہر..

وہ مناسب بدن کی روسی خاتون جانے کوئی آبی جانور تھی.. وہ اگلی دوپہر بھی کیاؤنڈ کے

دو رنگ پول میں ایک روباٹ کی مانند بے آواز تیر رہی تھی..

میسونہ مطمئن تھی.. رابعہ پُر تشویش اور سلجوق ان دونوں کیفیتوں کے درمیان میں کہیں الجھا

اور آپ میں جو گرز کے قسے باندھ رہا تھا.. نہیں مجھے یاد آ گیا کہ میں نے خاص طور پر اُس روز ایسے

اور گرز پہنے تھے جن کے آپس میں جڑ جانے والے فلیپ تھے تاکہ غار حرا میں.. اُس کی رات میں انہیں

پہلے اور اتارنے میں آسانی ہو تو سموں میں نہ الجھا رہوں.. رابعہ نے چڑھائی کے دوران دھوپ سے بچاؤ

کے لیے ایک چھوٹا سا تولیہ بھی رُک سیک کی ایک جیب میں رکھ دیا..

اُرا نیور کا نام امانت تھا..

اس نے مجھے مکہ سے پرے جبل نور کے دامن میں ڈراپ کرنا تھا.. نہیں ڈراپ نہیں کرنا تھا

بلکہ سلجوق نے اُسے ہدایت کی تھی کہ یہ ابابھی ایک امانت ہے انہیں جبل نور کے دامن تک لے جانا ہے

اور آپ نے وہاں انتظار کرنا ہے کہ کب یہ ابابھونکتا اور بے حال ہوتا تو بہ تائب ہو کر واپس آتا ہے اور

اسے لے کر واپس آتا ہے رات کے کھانے سے پہلے.. یعنی چکن نوڈل کے ڈنر سے پہلے پہلے..

وہ میرے ساتھ کیاؤنڈ سے باہر آ گیا جہاں امانت منتظر تھا..

”ابو.. کیا یہ کافی نہ ہوگا کہ آپ اوپر پہنچ جائیں.. وہاں غار کے اندر کچھ دیر ٹھہریں اور پھر واپس

آجائیں؟“ میرے لیے اس کی تشویش پھر لوٹ آئی تھی..

”ہاں.. کافی ہوگا“

”تو آپ آ ہی جائیے گا..“

”دیکھتے ہیں“

ایک ڈھیر کے بھیڑ میں سے یہ مختصر سا تھیلا اپنے رنگوں کی چھب دکھاتا جھانک رہا تھا.. میں نے اس کا ایک سٹریپ پکڑ کر کھینچ نکالا اور قیمت بہت مناسب تھی.. خرید لیا.. کہ شاید یہ مینی کو پسند آ جائے اور وہ اپنی میڈیکل کی بھاری کتابیں اس میں ڈال کر کالج میں اپنی سہیلیوں کو یہ کہہ کر حسد میں مبتلا کرے کہ یہ تو ابو نیپال سے لائے تھے.. جبت کا بنا ہوا ہے..

تو اس لمحے جب میں تحصیل سٹریٹ میں ایک ڈھیر میں سے اس قیمتی رُک سیک کو کھینچ کر نکالا تھا اور نہایت کاروباری ہوشیار اور چھٹی ناک کے باوجود ایک نہایت دل پذیر شکل والی قیمتی دوشیزہ سے بھاؤ تاؤ کرتا تھا تو کیا اُس لمحے میں گمان کر سکتا تھا کہ میں اس تھیلے میں غار حرا تک جانے اور وہاں ایک رات بسر کرنے کی آرزو کے سامان بھروں گا.. یا اس کا دبیز بھیڑ کیلے رنگوں والا کھس نما کپڑا یہ جانتا تھا کہ.. کیا میں ایک ایسے سفید فام سیاح کے کاندھوں پر ہوں گا جو مجھ میں نیپال کی خالص چرس پوشیدہ کر کے کنجن چنگا کی برف پوش وادیوں میں جائے گا.. مجھ میں کسی امریکی خاتون کے زیر جامہ ہوں گے.. یا یہ کہ.. مجھ میں آج سے چودہ سو برس پیشتر کے کچھ سامان ہوں گے.. کچھ خوراکیں ہوں گی اور میں غار حرا کے اندر ایک رات آرام کروں گا.. اپنے جبت سے.. دنیا کی چھت سے.. بہت دور ایک ایسی غار میں پنہاں ہوں گا.. جس میں سے اقراء کی روشنی ظاہر ہوئی اور کل کائناتوں کو منور کرتی چلی گئی..

اس قیمتی رُک سیک کے گمان میں یہ سب کچھ کیسے ہو سکتا تھا.. اور یہ بھی اُس کے قیمتی مہاتما دھیان میں کیسے آ سکتا تھا کہ جو شخص مجھے کاندھے پر ڈال کر وہاں تک لے جائے گا.. وہ کوئی دھیان گیان والا لامانیس.. محض ایک بیکار اور بے جواز زندگی گزارنے والا آوارہ گرد ہے..

یہ قیمتی رُک سیک خاص بھاری ہو گیا تھا..

لیکن میں نے یہی قیاس کیا کہ میرے گناہوں سے بڑھ کر کیا بھاری ہوگا..

اگر میں اُن کا بوجھ نہایت آسانی سے اور بنا شرمندگی کے اٹھائے پھرتا ہوں تو اُن کے

مقابلے میں یہ تو پروں کی پوٹلی ہے..

UrduPhoto.com

UrduPhoto.com

UrduPhoto.com

”مکہ مکرمہ... 90 کلومیٹر“

شاہراہ مکہ پر آویزاں... شاہراہ کے ماتھے پر نصب جس ماتھے کے نیچے سے ہم ایک ہموار ریل سے گزر گئے ایک مرتبہ پھر ایک شہر کا نام اور وہاں تک کا فاصلہ نظر آیا تو وہ دل کو وہی انہونی اور انوکھی حسرت بخش کیا جو زندگی میں پہلی بار نظر آیا تو حاصل ہوئی تھی... کیسا جادوئی نام تھا... میں امانت کے برابر میں بیٹھا تھا... سعودیہ میں پہلی بار ایک کار میں سلجوق کے سوا کسی اور کے بارے میں بیٹھا تھا اور ذرا تنہا محسوس کرتا تھا... بیٹے کی حفاظت کے بغیر ذرا بے چارہ محسوس کرتا تھا... تنہی... کھیس کے کپڑے سے بنا ہوا ڈھیلا ڈھالا رُک سیک میری گود میں تھا اور میں نے اُسے دلوں ہاتھوں سے یوں تمام رکھا تھا جیسے مجھے ڈر ہو کہ مجھ سے کوئی اسے چھین لے گا... جیسے نرمی کلاس میں داخل ہونے والا بچہ پہلے روز اپنے بستے کو تھامے ہوئے ہوتا ہے... ایک ایسا بچہ جو ابھی لکھ پڑھ نہیں سکتا تھا... اُمی تھا... اُس کے کانوں میں ابھی اقراء کی آواز نہیں آتی تھی...

”مکہ مکرمہ... 80 کلومیٹر“

اور مکہ کی جانب سفر کرتے ہوئے یہ مناسب موقع ہے کہ میں آپ کو... اپنے پڑھنے والوں کو ایک راز میں شامل کر لوں... دل کی ایک بات میں شریک کر لوں کہ میں وہ سب کچھ پوری ایمانداری سے جان کر رہا ہوں گا اور بلا جھجک آپ سے کہہ دوں گا جو مجھ پر گزرے گی اور جو مجھ پر گزر چکی تھی... مجھ پر جو کچھ گزر چکی تھی میں نے اُسے پوشیدہ رکھا تھا... کسی سے بھی اُس کا تذکرہ اس لیے نہیں کیا تھا کہ کہیں اسے بہانہ بنا کر مجھے وہ روک نہ لیں... اور یہ کیا تھا کہ شاید میں روکا ہی جانا چاہتا تھا...

جج سے واپسی پر پاکستان میں ایک مکمل طمانیت اور آسودگی میں رہا... زندگی میں سب سے اچھے انسانی تجربے کے نشے کے لطف میں رہا اور جب یہ نشہ کم ہوا... اور سب نشے بے شک وہ روحانی نوعیت کے ہی کیوں نہ ہوں کم ہو جاتے ہیں... کم از کم میرے ایسے شخص کے... جو میری کند سوتی غار حرا پر انگ

اور یہ دراصل سلجوق کا تکیہ کلام تھا کہ وہ کبھی بھی کوئی واضح فیصلہ نہیں کرتا تھا... ”بیٹے سوٹ کے ساتھ سادہ ٹائی پہنو گے یاد دہاریدار...“ ”دیکھتے ہیں...“

”کیا آج شام ہم! کیا کے شور روم میں کافی مگ خریدنے جائیں گے...“ ”دیکھتے ہیں...“

اُس کی یہ خامی اُس کے سفارتی کیریئر کے لیے نہایت موزوں ثابت ہوئی کہ ”دیکھتے ہیں“ میں نہ اقرار ہوتا ہے اور نہ صاف انکار... چنانچہ میرے ”دیکھتے ہیں“ کہنے پر وہ مسکرانے لگا ”ٹھیک ہے ابا... دیکھتے ہیں... اینڈ ٹیک کیر آف یور سیلف اینڈ سی یو ایٹ ڈنر...“

UrduPhoto.com

UrduPhoto.com

UrduPhoto.com

گئی۔ کیسے ہوگا کب ہوگا کیا اس حیات میں ممکن ہوگا؟ پھر اُس بین الاقوامی ایوارڈ کی ٹی بی مدد آگئی۔ پاکستان سے روانگی کے وقت قطر میں قیام کے دوران نہ مجھے خانہ کعبہ کی دید کی تمنا نے بیتاب کیا اور نہ عمرہ ادا کرنے کے ثواب نے میرا دامن پکڑا۔ غار حرا تک جانے اور وہاں اُس کے اندر نہ سہی اُس کے آس پاس جبل نور پر کہیں بھی ایک رات بسر کرنے کا ناقابلِ سمجھ خیال تھا جو ہمہ وقت مجھ پر طاری رہا۔ میں اگر کبھی بے دھیان ہوا غار حرا سے تو صرف روضہ رسولؐ پر دوبارہ حاضری کے خیال سے ہوا۔ اور وہ بھی چند لمحوں کے لیے ہوا۔ خطبہ کے سوا اسے اور کیا نام دیا جاسکتا ہے جو خانہ کعبہ اور روضہ رسولؐ سے بھی بے دھیان کر دے؟

اور اب میں آپ کو دل کی اُس بات میں شریک کرتا ہوں۔ جونہی جدہ ایئر پورٹ پر اُترا ہوں۔ پہلا قدم رکھا ہے تو گویا سوکھو میسر دور جبل نور کے دامن میں جا قدم رکھا ہے تو میرے پاؤں میں شدید خوف ایک آکاس بیل کی مانند لپٹ گیا ہے۔ اُن میں ڈر بھر گیا ہے۔ ایسا ڈر جو ریگلتا ہوا میرے پاؤں سے سرکتا ناگلوں کے راستے میرے دل کے گرد پہنچ کر ایک آسیب کی مانند مسلط ہو جاتا ہے۔ اور پھر اس ڈر میں سے سیاہ کوئلیں پھوٹتی ہیں اور بڑھتی جاتی دماغ کے اُن خلیوں کے گرد لپکتی جاتی ہیں جن میں غار حرا میں ایک رات بسر کرنے کا خطبہ مقیم ہے۔

لاہور میں۔۔۔ دوچہ میں قیام کے دوران کچھ ڈر نہ تھا۔ ایک ہمہ وقت تمنا کی بے تابی تھی۔ کوئی اور خیال نہ تھا۔ اور جونہی جدہ میں قدم رکھتا ہوں اُس تمنا کی تکمیل کی سرزمین پر یعنی اس کے بیس کمپ میں پہنچتا ہوں اور یہاں سے اوپر چوٹی تک پہنچنے کا امکان سامنے آتا ہے تو ڈر بھی آ جاتا ہے۔ جو ایک خیالی منصوبہ بندی تھی وہ یہاں حقیقت میں بدل سکتی تھی تو مجھ پر خوف طاری ہو جاتا ہے اور روکے جانے کی خواہش کرتا ہوں۔

جیسے اپنے سفر کے راستے کا تعین کرتے ہوئے کوئی ایک شہر، قرطبہ، دمشق یا بیت المقدس محض چند حرف ہوتے ہیں ایک نقشے پر اور اُن حرفوں میں پنہاں جو شہر ہوتا ہے اُسے ظاہر دیکھنے کے لیے آپ بے تاب ہوتے ہیں۔ لیکن جب آپ ایک طویل سفر کے بعد سچ سچ اُن کے دروازے پر جا کھڑے ہوتے ہیں اور ایک دستک دینے سے وہ کھل سکتے ہیں تب ایک خوف دامن گیر ہو جاتا ہے کہ پتہ نہیں اس در کے اندر کیا ہے۔ میں اس کے اندر چلا گیا تو کیا ہوگا؟ آپ ڈر جاتے ہیں۔ لیکن نہیں۔ یہ حوالہ یونہی خیال میں آ گیا۔ یہ کچھ صائب نہیں موزوں یا مناسب ہرگز نہیں۔ کہ ذات رسولؐ کے حوالے سے کوئی بھی مقام۔ جہاں اُن کے نقش پا ہوئے۔ جہاں اُن کے سانس اور موجودگی ہوئی اُس کا موازنہ کسی اور مقام یا احساس سے نہیں کیا جاسکتا۔

بیت المقدس میں ایک عارضی قیام تھا۔

بیس یوں سمجھ لیجیے کہ جدہ میں قدم رکھتے ہی میں یکدم شدید طور پر یوں خوفزدہ ہو گیا کہ یہ میں کیا سوچتا رہا ہوں۔ یہ میں کیسے سوچ ہی سکتا تھا کہ جہاں حضورؐ راتیں بسر کرتے تھے۔ میں؟ وہاں۔۔۔ رات بسر کروں۔۔۔ جہاں جبریل امینؑ پہ نفس نفس اُترے اور ہم کلام ہوئے۔ وہاں میں؟ جو کھرب ہا انسان گزر چکے اور جو ارب ہا انسان اس روئے زمین پر موجود ہیں اُن سب نے جس کتاب میں شک نہیں اُس پر سر جھکائے اور اُس کتاب کا پہلا نازل ہونے والا حکم ”اقراء“ پڑھا اور پڑھتے ہیں تو جہاں وہ نازل ہوا۔ اس مقام پر۔۔۔ اور جہاں جن پتھروں پر حضورؐ کے ہاتھوں کا لمس ہوا۔ اُن کے سانس اُن نہ تم ہوئے۔ جہاں دو سوال کرتے تھے۔ اُن کے ذہن میں جو سوال جنم لیتے تھے اُن کے جواب چاہتے تھے۔ بیٹھتے تھے۔ لیٹتے تھے۔ سوتے تھے اور جاگتے تھے تو میں وہاں؟ انسان بے شک دیوانگی کی ہر سرحد عبور کر جاتے لیکن اس سرحد کے پار اگر یہ مقام ہو تو اُس کی دیوانگی میں بھی خلل آ جائے گا۔ وہ ترک جائے گا۔ ڈر جائے گا۔

میں۔۔۔ جدہ کے قیام کے دوران۔۔۔ مدینے سے واپسی پر میمونہ کے ہمراہ اپنی بیوی کی فراہم کردہ گھریلو ضرورت کی اشیاء پر نظر ڈالتا ”بن داؤد“ شور میں کپڑے دھونے کا ساہن۔ شیشہ۔ تولیے یا پھل فروٹ اور ہنریاں پر کھ رہا ہوتا۔ بنیر کی مختلف اقسام کو لپچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا اور بیکری کے صندوق میں لگتی ہوئی خمیری روٹیوں اور پیزا کی مہک میں گمن ہوتا تو یکدم میرے ذہن میں ایک چنگاری بھڑک اُٹھتی کہ غار حرا میں ایک رات۔۔۔ تو میرا بدن سن ہو جاتا۔ کہ نہیں۔ یہ میں نے کیوں اور کیسے سوچ لیا تھا نہیں۔ میمونہ کسی سیب یا آڑو کی شوخ رنگت کو میرے سامنے کر کے کہتی ”یہ خرید لیں؟“ تو اُس کے گمان میں بھی نہ ہوتا کہ یہ شخص اس لمحے ڈر کی ایک ناقابلِ بیان حالت میں مبتلا ہے۔

جدہ میں کہیں بھی۔۔۔ سٹار بک میں کڑوی کافی سرکتے۔ ”گزاز“ میں کسی بہت مہنگے چین کو صحت سے نکلتے۔ یا کپاؤنڈ کے سوئچنگ پول کے کنارے اس سے پیشتر کہ وہ روی مچھلی اُس میں تیرنے لگے۔ ناشتے کے بعد پہلا سگریٹ پیتے ابھی میں ہشاش بشاش اور بے پرواہ ہوں اور ابھی میرے اندر اُس خیال سے ایک سراسیمگی پھیل جاتی ہے ساون کی گھٹاکی طرح چھا جاتی ہے اور میں بے جان سا ہونے لگتا ہوں۔

یہاں تک کہ صبح شیعہ بنانے کے لیے گالوں پر سفید جھاگ پوت رہا ہوں تو یکدم غار میں اُن تھا رات بسر کرنے کا خیال آ جاتا ہے اور وہ جھاگ بیٹھنے لگتی ہے میں اپنے آپ کو آکھینے میں دیکھتا ہوں کہ یہ صورت۔ جسم۔ ایک تاریک اتھاہ رات میں اُس غار میں جہاں۔ میں جان گیا کہ یہ ہونے کا نہیں۔ میں تو زندگی کے روزمرہ معمول کے معاملوں میں اسی خاصا ادب تک بندہ ہوں۔ یہاں تک کہ کبھی تکمیل نہیں چلی

سے قاصر رہا کہ مجھے کیا شے درکار ہے۔ وہ کبھی کوئی کھلونا میرے سامنے رکھ دیتے اور کبھی موبائل فون پیش کر دیتے کہ یہ چاہیے۔

”صاحب آپ فکر نہ کریں۔ مکہ پہنچیں گے تو وہاں ٹارچ مل جائے گی۔“

”مکہ میں تو مل ہی جائے گی امانت۔ کہ وہیں سے تو ساری ٹارچوں کو روشنی ملی تھی ورنہ پہلے تو

اُن کے سیل سگلیے سیلے ہو کر بیکار ہو چکے تھے۔“

امانت نے صرف ”جی ہاں“ کہا اور ڈرائیونگ میں مصروف ہو گیا۔ اُس کے مصروف ہونے سے پیشتر ہی میں شرمندہ ہو گیا کہ یہ فقرہ میں نے کیوں کہا کہ وہیں سے تو ساری ٹارچوں کو روشنی ملی تھی اس لیے کہ یہ میرے دل سے نہ نکلا تھا۔ میں نے صرف لفظوں کی شعبد بازی کی خاطر ٹارچ اور روشنی اور مکہ کو جوڑ کر امانت پر اپنی عقیدت کا رعب جمایا تھا۔ میرے ساتھ یہ کبھی کبھار ہو جاتا تھا اور پھر میں شرمندہ ہو جاتا تھا۔

میں نے اپنے آپ سے پھر وعدہ کیا کہ آئندہ احتیاط کروں گا بات جو دل سے نکلے گی صرف اُسے بیان کروں گا۔

شاہراہ کے اوپر جو رحل نما کمائیں آپس میں جڑتی تھیں اور اُن پر ایک قرآن پاک کی شہادت آرام کرتی تھی ہم اُن کے نیچے سے گزر کر جب کچھ دیر سفر کر گزرے تو مکہ نظر آنے لگا۔

دوپہر تو ڈھل چکی تھی لیکن دھوپ کا روشن نکھار ابھی زوال پذیر نہ ہوا تھا۔ پہاڑیوں کے درمیان۔ اور اُن کی ڈھلوانوں پر قدیم طرز کے کہنہ مکان آپس میں جڑے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔

”امانت۔“ میں نے صراحوں والے چوک کو قریب ہوتے دیکھ کر کہا ”آپ تو مکہ میں داخل

ہو رہے ہو۔ جبل نور تو شہر کے باہر ہے۔ کدھر جا رہے ہو؟“

”صاحب ظہر کی اذان ہونے کو ہے۔ تو نماز کدھر پڑھیں گے۔“

”پتہ نہیں۔ جبل نور کے دامن میں میں نے ایک مسجد دیکھی تھی وہاں پڑھ لیں گے۔“

امانت کے چہرے پر ناپسندیدگی سی آئی۔ ”صاحب اگر آپ اجازت دیں تو نماز خانہ کعبہ

میں پڑھ لیں۔“

اب میں کیسے انکار کر سکتا تھا۔ پھر بھی میں نے خفیف سا احتجاج کیا ”ڈھوپ کھٹتی جا رہی

ہے۔ دیر ہوتی جا رہی ہے۔ کہیں زیادہ دیر نہ ہو جائے۔“

”صاحب ابھی بہت ناظم ہے۔“ اُن نے صرف اتنا کہا اور مجھے ناپسندیدگی کے علاوہ کچھ

جائے تو اپنے گھر میں بھی تنہا سو نہیں سکتا۔ ساری رات کان لگا کر سنتا رہتا ہوں کہ پتہ نہیں مگن میں کوئی ہے۔ ہر آہٹ پر دم نکلتا ہے ہر سرسراہٹ سراپہ کر دیتی ہے اور فجر کی اذان سنائی دیتی ہے تو دم ذرا بحال ہوتا ہے اور پھر بیگم کو فون کرتا ہوں کہ کہ پلیز۔

تو میں اپنے گھر میں تنہا نہیں سو سکتا تو ”اُن“ کے گھر میں۔

مکہ مکرمہ۔ 60 کلومیٹر۔

امانت ایک سعودی دیدہ شخص تھا۔ تفصیلات میں ایک عرصے سے ڈرائیوری کر رہا تھا اور محض ڈرائیور نہ تھا بلکہ ایک تجربہ کار دانش رکھتا تھا۔ اُس پاس کی سوجھ بوجھ رکھتا تھا۔ اُسے ابھی تک علم نہیں تھا کہ اُس کے برابر میں براجمان نائب تو فصل کا جو ابا ہے یہ ایک فور شدہ ابا ہے۔ میں اُس کے لیے ایک اور زائر تھا جس نے غار حرا تک جانا تھا اور پھر رات کے کھانے تک واپس جدہ آنا تھا۔

میں نے ”سامان غار حرا“ کی فہرست کو چیک کیا تو سب سامان موجود تھا۔ دودھ اور منرل واٹر کے بارے میں سوچ رکھا تھا کہ جبل نور کے دامن میں جو سٹور ہیں وہاں سے تازہ اور خشک خرید لوں گا۔ لیکن ٹارچ بھول آیا تھا۔

غاروں کے لیے ٹارچ تو بہت ضروری آئٹم ہے۔

”امانت۔ راستے میں کسی ایسے مقام پر رُکنا جہاں سے ایک ٹارچ خرید سکوں۔“

”ٹارچ کیا کریں گے صاحب۔ آپ تاریکی ہونے سے پیشتر اُتر آئیں گے انشاء اللہ۔“

”کیا پتہ کچھ دیر ہو جائے۔“

ان راستوں کے کناروں پر آبادیاں بہت کم ہیں۔ جہاں کہیں زائرین کے قافلے تازہ دم ہونے کے لیے رُکتے ہیں وہاں ریسٹوران کے علاوہ ایک آدھ سٹور بھی ہوتا ہے تو امانت ایک ایسے ہی مقام کے قریب ہوتے ہوئے آہستہ ہوا اور کار کو شاہراہ سے اتار کر ایک شوروم کے سامنے جاڑا۔

”یہاں سے ٹارچ مل جائے گی؟“

”افغان لوگوں کا شوروم ہے صاحب۔ یہ بہت کچھ رکھتے ہیں۔“

افغانیوں کے وسیع شوروم میں ہر سو قالین اور غالیچے بچھے تھے اور دیواروں کو بھی ڈھانچتے

تھے۔ پر وہاں ٹارچ نام کی کوئی شے مہیا نہ تھی۔

وہاں سے رخصت ہوئے تو تھوڑی دیر بعد ایک پیر سٹور دکھائی دیا۔

اس پیر سٹور میں جو کچھ نمائش پر تھا اور بہت کچھ تھا لیکن اس بہت کچھ میں ٹارچ دکھائی نہ

دی۔ ٹارچ وہاں کہیں تھی ضرور لیکن سٹور میں کام کرنے والے افغانی اور مصری ملازمین کو میں یہ سمجھانے

بھری نظروں سے نوازا کہ یہ کیسا بھلا مانس ہے کہ خانہ کعبہ میں نماز پڑھنے سے کتر رہا ہے۔ کہ کہیں دیر نہ ہو جائے۔

نماز کے دوران اگرچہ میں نے سیاہ غلاف پر اپنی آنکھیں تادیر رکھیں۔ ہر خیال غار کو دل سے نکال دیا۔ میری آنکھیں اُس کی سنہری خطاطی پر سیاہ تیلیوں کی مانند پھڑپھڑاتی رہیں اور اس کے باوجود ہمہ وقت غلاف پر جو دھوپ دھیرے دھیرے ڈھلتی تھی اُس کی تشویش میرے اندر ڈھلتی رہی۔ کہ کہیں دیر نہ ہو جائے۔ اور دل سے اپنے اُس دل سے دعا مانگتا رہا جو کوئی جواز مہیا نہیں کرتا، کسی بھی منطقی بحث میں شامل ہونے سے انکاری ہو جاتا ہے تو اُسی دل سے یعنی صدق دل سے دعا کرتا رہا کہ اے مالکِ اول تو یہ کہ میں اس ناتوانی کے باوجود جبل نور کی چوٹی پر پہنچ جاؤں۔ اور اگر وہاں پہنچ جاؤں تو غار حرا کے صحن میں زیادہ لوگ منتظر نہ ہوں۔ مجھے غار کے اندر داخل ہونے کا موقع مل جائے۔ چند سجدے کرنے کا وقت نصیب میں آجائے۔ پوری شب گزارنے کی درخواست پیش نہیں کرتا۔ ویسے گرتو چاہے۔ یہی دعا کرتا رہا۔

حرم میں داخل ہونے سے پیشتر ہم نے یہ طے کر لیا تھا کہ ہم جہاں کہیں بھی نماز ادا کریں نماز کے بعد امانت فوری طور پر بازار مکہ کا رخ کرے گا وہاں سے نارچ خریدے گا اور میں باب عبدالعزیز کے سامنے اُسی گھڑیال کے قریب اُس کی واپسی کا انتظار کروں گا۔

یہ گھڑیال وہاں ایستادہ نہ ہوتا تو ہزاروں لوگ بہت بخل ہوتے۔ کہ باہم ملاقات کا یہی ایک واضح مقام حرم کے باہر کے صحن میں نمایاں تھا۔

اب میں وہاں کھڑا امانت کا انتظار کرتا ہوں۔

اور یہ انتظار طول کھینچتا چلا گیا۔

اتنی دیر ہو گئی کہ میں امانت کی شکل بھولنے لگا۔

بلکہ جوں جوں دھوپ کم ہو رہی تھی تو توں امانت کی شبابہت بھی کم ہونے لگی۔

اتنی دیر کا کوئی جواز نہ تھا۔

اتنی دیر میں ایک معمولی سی نارچ تو فرمایا کہ میں ایک سرخ لائٹ خریدی جاسکتی تھی۔

میرا جتنی تھکنا بھی کار کی اگلی نشست پر رکھا تھا۔ اور اگر میں خود مختار ہو کر جبل نور کا راستہ اختیار

بھی کرنا چاہتا تو نہ کر سکتا تھا۔

اور میری بے چینی اور سراسیمگی کا سبب یہ بھی تھا کہ مجھے اگلے ایک دو روز میں ہجہ و مہوڑ دینا تھا

اور اگر آج کوئی معمول جاتی تھی تو میرا ہوا میں لہا نہیں کرتے بلکہ فارم چمکڑے رہ جاتا تھا۔

امانت نے خیانت کر دی تھی۔

بلکہ خراتی دیر ہو گئی کہ کعبہ کے دروہام بھی چھاؤں میں جانے لگے تب امانت نمودار ہوا اور امانت شانت چہرے کے ساتھ اور قریب آ کر کہنے لگا "میں اس چینی ساخت کی نارچ کی تلاش میں تھا ملتی نہیں تھی۔ بہت اچھی روشنی دیتی ہے صاحب۔ اور سستی بھی ہے۔ پھر ایک پاکستانی دوست نے ہاسٹل کے لیے ٹھہرا لیا۔ ابھی بہت ٹائم ہے صاحب۔"

غصہ یوں بھی حرام ہے۔ اور حرم کے عین سامنے تو بہت حرام ہے اس لیے میں نے ضبط کا بے حال مظاہرہ کرتے ہوئے مسکرا کر کہا "ہاں ابھی بہت ٹائم ہے۔ اور یہ چینی نارچ بھی لا جواب ہے۔" اگرچہ یہ امانت بہت برسوں سے ادھر تھا لیکن مکہ سے جبل نور جانے والے راستے سے آگاہ نہیں تھا۔ اور ادھر دھوپ تھی کہ ڈھلتی جاتی تھی۔

وہ کبھی کسی روشن سنور کے اندر جا کر جبل نور کی جانب جانے والے راستے کے بارے میں معلومات حاصل کرتا اور کبھی کسی راہ گیر کو روک کر سوال جواب کرنے لگتا۔ نہ مجھے اُس کا سوال سمجھ میں آتا تھا۔ نہ راہ گیر کا جواب مجھے صرف یہی سمجھ میں آتا تھا کہ دھوپ ڈھل رہی ہے۔ دیر ہو رہی ہے اور میں ایک لاچار شخص کی مانند جتنی تھیلے کو سینے سے لگائے اُس کو آتا جاتا دیکھتا۔

اُس نے تو نہ دیکھا لیکن تین چار کلومیٹر کے بعد مجھے بائیں جانب جبل نور۔ عمارتوں سے ہاسٹل کے دھوپ سے خالی ہوتے ہوئے آسمان میں نظر آ گیا۔

لغیب میں جو ایک سوکھا ہوا درخت معلق تھا نور کے اسی پہاڑ کا واحد مکین تھا بناوٹی لگتا تھا جیسے کسی نے جبل کی مکمل بیابانی کی یکسانیت کو رنگ دینے کے لیے اسے وہاں سجایا ہو۔

ہاں اُس کا طلسم کسی کو و طور سے کم نہ تھا۔ اور کیسے ہوتا کہ دونوں بلند یوں پر کلام ہوا تھا۔ سندیر آ یا تھا۔ اُس سے جبل نور کی دھوپ چھاؤں میں ایسی کشش تھی کہ اُس نے میرا ڈرائل کر دیا اور مجھ میں ایک موسیٰ کا شوق بھر دیا کہ میں نے اس جبل پر چڑھنا ہے۔ شنید ہے کہ اوپر دور ہوتا ہے تو وہاں پہنچ کر دیکھنا ہے کہ وہ ہے کہ نہیں۔

ڈھل چکی دھوپ والے حصے میں چوٹی سے ڈرائیچے چند سفید سفید ذرے سے حرکت میں نظر آئے۔ کچھ لوگ اترتے آ رہے تھے واپس آ رہے تھے۔ اس منظر نے مجھے حد درجہ طمانیت سے دو چار کیا۔ یعنی وہاں تک آنا جانا لگا ہوا ہے۔ بے شک یہ صرف آنا ہی آنا تھا۔ نیچے سے اوپر کوئی بھی نہیں جا رہا تھا۔ مجھے ایک اطلاع یہ بھی ملی تھی کہ ان دنوں غار حرا تک جانے پر پابندی عائد کر دی گئی ہے تو یہ خدشہ بھی کہیں دل میں تھا اور اُن سفید دھیرے دھیرے حرکت کرتے اترتے ذروں نے میری ڈھارس بندھا دی تھی۔ اوپر جایا جاسکتا تھا۔

جہاں ہماری کارر کی تھی اور میں اُس کے ساتھ ٹیک لگا کر اپنے طور کو تک رہا تھا اُس کے عین سامنے ایک مقامی پرویز سنور کے گلے شیشوں کے پیچھے ایک نوجوان جوان لیتا دکھائی دے رہا تھا۔ غار حرا کے سامان کی فہرست میں جو منرل و اثر شامل تھا اُس کی دو ٹھنڈی بوتلیں میں نے اُس بیزار دکھدار سے خریدیں اور فریزر میں سب ترین ایک لٹر کی سفید پلاسٹک کی بینڈل والی جو بوتل تھی وہ نکال کر کاؤنٹر پر رکھ دی۔ میری انگلیوں کی پوروں میں اُس کی سفید خنکی دیر تک سنسناتی رہی۔

منرل و اثر کی دو بوتلوں اور دودھ کی اس سرد سفید ایک لٹر کی بوتل کو جب میں نے جتنی کھیس کے تھیلے میں ڈالا تو وہ ان کے وزن سے بوجھل ہو کر لٹک گیا۔ خاصا بھاری ہو گیا۔

میں نے پھر جبل نور کے سائے میں آئے ہوئے حصے کو دیکھا اور وزن کم کرنے کی خاطر وہ چھوٹا تولیہ امانت کے سپرد کر دیا کہ اسے جدہ پہنچ کر میری بہو کے حوالے کر دینا اور کہنا کہ چڑھائی کا راستہ سائے میں آ چکا تھا اس لیے اس کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی اور وہ جو اس نے مجھے ہدایت کی تھی کہ انکل اس تولیے سے سر ڈھانپ لیجیے گا کہیں چڑھائی پر تیز دھوپ کے باعث سن مشرک نہ ہو جائے اور انکل سن مشرک سے تو بندہ مر جاتا ہے تو سائے کی وجہ سے اس کا امکان کم ہو چکا ہے۔

امانت کی سمجھ میں نہ آیا کہ اگر ہم دونوں کچھ دیر بعد جدہ واپس جائیں گے تو یہ تولیہ میرے سپرد کیوں کیا جا رہا ہے۔

”تپش شوق نے ہر ذرے پہ اک دل باندھا۔

میں کیمپ غار حرا۔“

وہ جبل نظر آ یا تو میں خوش نہ ہوا۔ قدرے ہراساں ہوا کہ وہ بہت ہی بلند نظر آ رہا تھا۔ اُس کی چوٹی پر پہنچنا جو عقاب کی ایک چونچ کی مانند اُس کی بلندی سے نکلی تھی۔ ممکن نظر نہ آتا تھا۔ یہ ہر بلندی کا خاصا ہوتا ہے کہ وہ دور سے ناممکن ہی نظر آتی ہے۔

شاہراہ میں سے جدا ہوتی ایک چھوٹی سڑک بائیں جانب چلی جا رہی تھی اور ہماری کار بھی اُس کے ساتھ ساتھ چلی گئی یہاں تک کہ جبل نور کے دامن میں جو چند دکانیں تھیں سنور اور گھر تھے وہاں پہنچ کر اس سڑک کا اختتام ہوا تو ہمارا سفر بھی اختتام کو پہنچ گیا۔

بہت کم لوگ تھے۔ نہ کوئٹہ تھے اور نہ زائرین کی بسیں اور وینیں۔ قدرے ویرانی کا نقشہ تھا۔ دامن کے عین کنارے پر جو دکانیں تھیں وہ بند ہو رہی تھیں کہ ان میں زائرین کی دلچسپی اور عقیدت کے سامان تھے اور آخری زائر جنہوں نے آنا تھا آچکے تھے اور اوپر جبل نور پر دوپہر کی دھوپ مدھم ہونے لگی تھی۔

کارر کی۔ اُس کا انجن خاموش ہوا تو عجیب سا سناٹا در آیا جس میں وہ ڈر تھا جو جدہ میں قدم رکھتے ہی میرے ساتھ ہولیا تھا۔ میں اس سناٹے اور ڈر میں مہبوت کار سے باہر آ گیا۔ سر اٹھا کر جبل نور پر نگاہ کی۔ اُس کا طلسم کسی کو و طور سے کم نہ تھا۔ اُس پر دو پہریوں ڈھل رہی تھی کہ دامن سے چوٹی تک جو پایاں حصہ تھا وہ تو ابھی روشن تھا۔ جس حصے کا رخ خانہ کعبہ کی جانب تھا اور دائیں جانب جو گھاٹیاں تھیں وہ چھاؤں میں جا چکی تھیں اور اوپر جانے والا راستہ بھی جہاں میں تھا وہاں سے چوٹی تک مکمل طور پر چھاؤں میں آ چکا تھا۔ دھوپ اور چھاؤں نے جبل نور کو تقریباً درمیان میں سے دو حصوں میں بانٹ دیا تھا۔ جہاں ابھی دھوپ ٹھہری ہوئی تھی وہاں جو چٹانیں اور پتھر تھے وہ زرد ہو رہے تھے اور چوٹی سے ارا

ایک مہمان پر رسید کر دے گا۔

”چلا جاؤں گا صاحب.. آپ جاؤ۔“

”پہلے تم جاؤ.. جاؤ۔“

اُس نے ناچار ہو کر تعمیل کر دی۔

سلجوق کی کارامانت کے ہاتھوں سے شارٹ ہو کر ذرا پیچھے ہوئی اور پھر ایک نیم دائرہ بنا کر گھومی اور واپس ہو گئی۔ میں نے اُس پر تب تک نگاہ رکھی جب تک وہ مرکزی شاہراہ کے قریب پہنچ کر اس میں شامل ہونے سے چند ستر اُس کی عقبی روشنیاں بریک لگاتے ہوئے یکدم سرخ نہ ہوئیں اور جب لگ بھگ ہڈی کی جانب مڑتے ہوئے وہ بجھ نہ گئیں۔

میں نے ایک مرتبہ پھر سامانِ سفر کا حساب کیا۔ ٹارچ، منرل واٹر، دودھ تو موجود۔ بقیہ اشیاء بھی ایک ایک کر کے دوبارہ چیک کیں۔ البتہ ان سب کا وزن میرے اندازے سے کہیں زیادہ ہو گیا تھا۔ میں نے تہتی تھیلے کے سوتی سٹریپس کو دونوں بازوؤں میں پرو دیا اور اُسے کمر پر بوجھ کر لیا۔ وہ میری کمر پر ٹھنڈے سانس بھرتا تھا۔ ایسے کہ اُس میں سنور کردہ دودھ کی بوتل کی ٹھنڈک تہتی تھیں کے کپڑے میں سے سرایت کر کے میری پشت پر ایک خشک تھپکی دینے لگی کہ شاباش اب ہمت کرو۔ امانت نے دیکھا کہ میں نے رخت سفر کمر پر بوجھ کر لیا ہے اور اُس سے کچھ لا تعلق سا ہو گیا ہوں اور ہاتھ ملا کر اُسے شکر پیادا کرنے کے بعد خدا حافظ کہتا ہوں تو اُس نے کار کے ہانٹ کے ساتھ ٹیک لگا کر اُن ڈرائیوروں کے اطمینان کے ساتھ جن کی بیگمیں انہیں کسی شاپنگ مال میں ایک طویل عرصے کے لیے ترک کر رہی ہوتی ہیں اور وہ انتظار کی کوفت مٹانے کے لیے ایک سگریٹ سلگا لیتے ہیں اُس نے بھی ایک سگریٹ سلگا لیا۔

وہ نہیں جانتا تھا کہ یہ بیگم کچھ بے ایمان ہے.. ہو سکتا ہے واپس ہی نہ آئے۔

”صاحب میں انتظار کرتا ہوں۔“

”نہیں تم جاؤ امانت.. مجھے اوپر تک پہنچنے اور واپس آنے میں کم از کم تین چار گھنٹے لگیں گے۔ تم جاؤ۔“

”کوئی پروا نہیں جی.. میں انتظار کرتا ہوں۔“

”نہیں.. مجھے نیچے اتر کر یہاں سے رات کے کسی بھی پہر آسانی سے جدہ کے لیے سواری مل جائے گی.. ہو سکتا ہے اوپر کوئی اور سبیل نکل آئے.. رات بسر کرنے کی.. مجھے ٹھہرا لیا جائے تو اُس صورتحال میں تمہیں کیسے اطلاع کروں گا کہ تم جاؤ میری رہائش کا بندوبست کر دیا گیا ہے.. اس لیے تم جاؤ۔“

وہ تامل کر رہا تھا.. ”صاحب نے تو کہا تھا کہ..“

”صاحب کے ابا جو تمہیں کہتے ہیں کہ تم جاؤ۔“

وہ پھر بھی ٹس سے مس نہ ہوا۔

”دیکھو میں ذمہ لیتا ہوں کہ تم خالی ہاتھ واپس گئے تو صاحب ناراض نہیں ہوگا۔ اب تم میرے سامنے یہاں سے کار موڑ کر واپس شاہراہ تک جاؤ گے تب میں جبل نور پر پہلا قدم رکھوں گا۔“

”جی۔“

یہ سنی، کہہ کر بھی وہ کھڑا رہا۔ ڈھلے یقین میں رہا کہ جاؤں یا نہ جاؤں اور پھر شاید اُس نے میری خشکیوں نگاہوں سے اندازہ لگا لیا کہ اُنہیں جاؤں گا تو صاحب کا یہ اہم شخص ناراض نہیں ہوگا۔ مجھے

ان تین افریقی نوجوانوں کے بعد، جس تھڑے پر براہمان وہ اس ذہنی و دھڑلے میں، جیل نور
ان کا کمر تھا اس سے غافل، خوش گپیوں میں مصروف تھے تو اس آخری انسانی تعمیر کے بعد، اور یاد
دہش کہ یہاں تک میں آسانی سے پہل قدمی کرتا نہ آیا تھا بلکہ چار پانچ بار ڈک کر سانس درست کرتا آیا
تھا اور اپنے قیمتی منرل وائر کے چند گھونٹ بھر چکا تھا تو اس کے بعد یکدم منظر وسیع ہو جاتا تھا، کوئی رکاوٹ
الٹرو کوئی نہ تھی، بس آپ ہوتے ہیں اور جبل نور ہوتا ہے، ایک پتھر یا بے نشان، سنگریزوں سے بھرا
بے نام بلند ہوتا راستہ ہوتا ہے، بلکہ کئی راستے ہوتے ہیں، جدھر آپ کا قدم آسانی سے اٹھ جائے وہی
راستہ ہو جاتا ہے۔

جو بھی آبادی کے آثار اختتام کو پہنچے، جانے کہاں سے ایک ایسی ساخت کا شلوار قمیض میں
لوہاں لہاں خوش و خرم سانو جوان نمودار ہوا، مجھے پہلے تو مسکراہٹوں سے نوازتا رہا اور پھر کہنے لگا "چاچا اوچے
ہائے ہو؟"

"ہاں،" چاچا نے بیزار سے جواب دیا کہ یہاں یہ جیتجا کہاں سے ٹپک پڑا۔

"غار میں نقل ادا کرنے کے لیے جاتے ہو۔"

"ہاں۔"

"اس ٹیم کیوں جاتے ہو۔"

"بس جاتا ہوں۔" میں نے جان چھڑانے کی غرض سے ذرا خوشگوار ہو کر کہا۔

"مجھے اپنا سامان دے دو، میں اٹھا کر اوپر لے جاتا ہوں۔ مدد کرتا ہوں۔" اس نے بے تکلف

"نہیں، شکریہ۔"

"بوڑھے ہو، اوپر نہیں پہنچو گے، میں لے جاتا ہوں۔ مدد کروں گا۔"

"نہیں، تم جاؤ، میں پہنچ جاؤں گا۔"

وہ مسکراتا ہوا بغیر دل کو آزار دینے چلا گیا، شاید وہ کچھ ریال کمانا چاہتا تھا، شاید وہ تہہ دل سے
صرف انسانی ہمدردی کی خاطر میری مدد کرنا چاہتا تھا، یہ میں نہیں جانتا تھا۔

اوپر سے، چند زائرین، شاید ترک یا انڈونیشیا کے، کچھ ایرانی اترتے آرہے تھے۔

وہی سفید ڈرتے تھے جنہیں میں نے دامن میں کھڑے ہو کر جبل نور میں حرکت کرتے

دیکھا تھا، وہ مجھ سے کچھ کہے بغیر ٹھٹھے ہوئے، مجھ پر ایک نگاہ ڈالے بغیر میرے قریب سے گزر کر

اٹھتے گئے۔

”غارِ حرا میں ایک رات“

کار کی کشتی واپس جا چکی تھی، واپسی کے راستے مسدود ہو چکے تھے اور اب اس کے سوا اور کوئی
چارہ نہ تھا کہ آگے جایا جائے، اور آگے جبل نور تھا، جس پر سائے طویل ہو رہے تھے، دامن کی دکانوں
سے آگے ایک کچی کچی سڑک اور پراشٹی بلند ہوتی تھی، کہیں وہ ادھر جاتی تھی، کہیں سینٹ شدہ کچھ جیسے
پاؤں میں آتے تھے اور کہیں سنگریزے، چھوٹے پتھر اور روڑے، میں آہستہ آہستہ سانس سنبھالتا چلا
جاتا تھا، اس راستے کے آس پاس دو چار گھر، کچھ بے آباد سے مکان، جہاں تک ممکن تھا انسان لے اپنی
رہائش کے سامان کر رکھے تھے، ایک مختصر سفید رنگ کی مسجد، کچھ دکانیں جو بند ہو چکی تھیں، جودن کے
وقت اوپر جاتے ہوئے زائرین کے ہجوم کی پیاس بجھانے کا کاروبار کرتی تھیں، چند خالی تھڑے، کچھ
عارضی چھترجن کے نیچے مشروبات کے خالی کریٹ پڑے تھے۔

یہ تو میں نے پہلے قدم سے ہی طے کر لیا تھا کہ میں بہت دھیرج اور اطمینان سے آہستہ آہستہ
چڑھوں گا، لیکن میں اس طے شدہ آہستگی سے بھی کہیں آہستہ رک سیک کے بوجھ سے ہو رہا تھا، جو پہلی
بار میری کمر پر نہیں تھا، یہاں تک کہ جوس کے کارٹن اور منرل وائر بھی نمیرنے اٹھا رکھے تھے، اس بار
آسانی میسر نہ تھی تو بہت آہستہ آہستہ۔

جہاں آبادی کا اختتام ہو جاتا تھا، عمارتیں آس پاس کی ختم ہو جاتی تھیں وہاں جو آخری بند
دکان تھی، اور اس سے آگے بڑے بڑے پتھروں کا آغاز ہو جاتا تھا وہاں اس بند دکان کے تھڑے چٹیلے
افریقی نوجوان جو ہو سکتا ہے سعودی ہوں خوش گپیوں میں مصروف تھے وہ مجھے دیکھ کر چپ ہو گئے، میں
ایک نہایت شرمندہ سی مسکراہٹ کے ساتھ ان سے ہم کلام ہوا اور سلام کیا کیونکہ وہ چپ ہی اس لیے
ہوئے تھے کہ انہیں توقع ہی نہ تھی کہ شام ڈھلے ایک بوڑھا شخص بالکل اکیلا اوپر جا رہا ہوگا، اور مسکرا بھی
رہا ہوگا، انہوں نے میرے سلام شوق کا کچھ کا خاص رغبت سے جواب نہ دیا اور پھر سے ایک دوسرے کی
جانب متوجہ ہو کر شام صبح ہی بارے میں کوئی کرتے مجھے نظر انداز کرتے ہوئے ہٹے گئے۔

میرے تن بدن میں ایک گھماؤ سا گھوم گیا تھا۔ ایک چکر آیا۔ ایک گولاسا اٹھا اور آنکھوں کے سامنے دھند یوں پھیلی کہ میں اُس چٹان کو قوراندہ تمام لیتا تو یقیناً گر جاتا۔

یہ کیا ہے؟ میں نے شدید خوفزدگی کا شکار ہو کر اپنے آپ سے پوچھا۔ ایسا پہلے تو کبھی نہ ہوا تھا۔ کسی بھی بلندی پر شدید ناتواں حالت میں بھی میں یوں بے اختیار نہ ہوا تھا۔ یہ کیا ہے؟

بلندی ہے۔ تمہاری عمر ہے اور تمہاری حماقت ہے۔

مجھے واقعی آج تک اس قسم کا بے جان کر دینے والا چکر نہیں آیا تھا۔ بلکہ مجھے تو علم ہی نہ تھا کہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ مجھے چکر آ گیا تو یہ کیسے آتا ہے۔ اس کی کیفیت کیا ہوتی ہے۔

شاید یہ قدرت کی جانب سے ایک وارننگ تھی۔ ایک اشارہ تھا کہ یہ تمہارے بس کی بات نہیں۔ میں بہت دیر تک اُس چٹان کا سہارا لیے کھڑا رہا۔ سنبھل تو میں گیا تھا لیکن کہیں ایسا نہ ہو کہ دو چار قدم کے بعد پھر سے چکر آ جائے اور اُس پاس تمام لینے کو کوئی سہارا نہ ہو۔ نیچے کہیں لشیپ میں جو سلیڈ تھا اور کانٹاں دکھائی دیتی تھیں اُن سے پرے جہاں کار پارک تھا کہیں امانت واپس آ کر وہاں میرا غلط نہ ہو۔ اگر ہے تو یہیں سے لوٹ جاؤں۔ ظاہر ہے وہ وہاں نہیں تھا۔

میں دراصل عمر کے منزل کے تناسب سے ہمت کے گراف کی لکیر کے بہت جیزی سے چلنے کے عمل سے نا آشنا تھا۔ میں لاعلم تھا اس لیے کہ ان حقیقتوں کا علم بھی ہوتا ہے جب آپ اس عمر تک پہنچتے ہیں۔ اور کسی ایسی صورت حال سے دوچار ہوتے ہیں جس کا سامنا آپ نے دو چار ماہ پیشتر آسانی سے کر لیا تھا لیکن اب آپ اُس کے سامنے لاچار ہو جاتے ہیں۔ میں آج سے چھ سات ماہ قبل ہی تو یہاں آیا تھا۔ اگرچہ تب بھی یہ ایک کنھن سفر تھا دشواری بہت تھی لیکن یہ طے ہو گیا تھا۔ اگرچہ اس میں بڑے دائیں ہاتھیں آسے پاس بکریوں کی مانند چڑھتی ترک افغانی اور ایرانی خواتین کا بھی بہت ہاتھ تھا کہ انہیں دیکھ کر انسان شرمندہ ہو جاتا تھا اور اوپر پہنچنے کے لیے جان کو داؤ پر لگا دیتا تھا۔ اور آج اُس اس کوئی بھی نہ تھا۔ میں جبل نور کا تنہا مسافر تھا اور اُس پاس بڑھتے ہوئے سائے تھے۔ اور میں ان چھ سات ماہ میں بڑی تیزی سے جسے انگریزی میں کہتے ہیں کہ پہاڑی کے نیچے لڑھکتے جاتا تو میں اس دوران لڑھک چکا تھا اور احساس ہی نہیں ہوا تھا۔ جو کھٹنایاں میں چھ سات ماہ پیشتر سہہ سکتا تھا آج انہیں نہ بے قابو نہیں رہا تھا۔

میں نے بہت عجیبگی سے بہت شگے دل سے غور کیا کہ اگر بدن کی یہی کیفیت رہی تو کیا لوٹ جانا مناسب نہ ہوگا۔ ابھی تو فرش نگاہ میں تھا اور عرش کہیں بلندی پر فائز تھا۔ میں نے سوچا چند قدم اٹھائی۔ اتنا تر ڈر کے آ جاؤں۔ اتنی تھلا لے کر آ جاؤں ایک دم کا لگا ہے تو فرار کے راستے سوچنے لگا۔

جج کے سفر نامے میں غار حرا کے باب میں میں یہ بیان کر چکا ہوں کہ جبل نور پر چڑھنے کے لیے کوئی واضح اور باقاعدہ راستہ نہیں ہے۔ یا تو آپ دوسرے لوگوں کے قدموں پر قدم دھرتے جاتے ہیں یا پھر اپنی ہمت کے مطابق اپنا راستہ خود بناتے ہیں۔ آپ رگ رگ طریقے کو بھی بروئے کار لا سکتے ہیں اور اگر توانائی وافر ہے تو بڑے بڑے پتھروں پر چڑھ کر سفر کی مدت میں مناسب کمی کر سکتے ہیں۔ البتہ ایک سہولت دور سے نظر آتی ہے۔ خدا کے کسی نیک بندے نے خاصا تر ذکر کے کہیں کہیں پتھروں اور چٹانوں پر تیر کے نشان پینٹ کر دیئے ہیں کہ اب آپ آ ہی گئے ہیں تو براہ کرم ان نشانوں کے مطابق راستہ اختیار کر لیجیے۔ سہولت رہے گی۔

میں انہی نشانوں کو نظر میں رکھتا اُن کی ہدایت پر عمل کرتا اور چارہا تھا۔ اور ہر دو چار قدم کے بعد ٹھہر کر کسی چٹان کا سہارا لے کر نیچے دیکھتا کہ میں کتنی بلندی تک آ چکا ہوں۔ اور اُس سفید مسجد اور آخری مکانوں کے مختصر ہونے سے اندازہ لگاتا کہ کچھ تو بلند ہو چکا ہوں اور پھر جب سر اٹھا کر چوٹی کی جانب دیکھتا تو بس اللہ ہی اللہ۔ رائٹھن نے بھی کہاں جھوک جا آ باد کی ہے کہ اگر ایک دریا کے پار ہوتی تو تیرتے ڈوبتے پہنچ ہی جاتے۔ نہ ہی یہاں سے دکھائی دیتی تھی کہ پوشیدہ تھی ایک غار میں تھی اور نہ اُس سے میں کسی کو پکار سکتا تھا کہ نال میرے کوئی چلے۔ کہ آس پاس کوئی تھا ہی نہیں جسے پکارتا۔ جبل نور دامن سے چوٹی تک ایک تنہا پہاڑ نہیں ہے بلکہ پہاڑیوں کا ایک سلسلہ ہے جس کا بلند ترین حصہ جبل نور کہلاتا ہے۔ حضور کے زمانے میں اسے حرا کہتے تھے اور اس کی چوٹی میں چھپی ہوئی غار کو حرا کی غار کہا جاتا تھا۔ پھر یہ نام حرا کا صرف غار کے لیے مختص ہو گیا اور پہاڑ کو جبل نور کہا جانے لگا۔ دائیں جانب اس سلسلہ کو وہ کی اونچائی کم ہو کر کہیں نیچے آ جاتی تھی۔

تنبقی رُک سیک میں جو دودھ کا پلاسٹک کارٹن تھا اُس کی ٹھنڈک میری کمر پر آئے ہوئے پہلے اور گرمی کے باعث زائل ہو چکی تھی اور اب اُس کے کونے اور اس کا وزن مجھے اذیت دے رہے تھے۔ چلنے سے پلاسٹک کے بھاری کونے مجھے کچھ کے دیتے۔ یہاں تک کہ ایک بار ذہن میں یہ بھی آیا کہ اسے نکال کر جتنا دودھ پی سکتا ہوں پی کر اسے یہیں کہیں لڑھکا دوں اور اس کے تکلیف دہ بوجھ سے ہاتھ

حاصل کر لوں۔ UrduPhoto.com

یکدم مجھے رُکنا پڑا۔

مجموعہ غار حرا۔ UrduPhoto.com

میں نے نزدیک ترین چٹان کی تختی پر اپنی مشقت کی تختی سے نا آشنا اہلیوں کو رکھا اور سنبھلنے کی

UrduPhoto.com

رات وہیں ایک غار میں بسر کرنے کے ارادے سے رہتا ہے۔

وہیں میں چڑھتا تو جاتا تھا لیکن سراسیمگی کے عالم میں پھونک پھونک کر قدم دھرتا تھا کہ کہیں میں عمر کے تابع ہو کر چکرانہ جاؤں۔ لاچار نہ ہو جاؤں۔

اور ہلا خروہ مقام آئی گیا جو جبل نور کے دامن سے یوں دکھائی دیتا ہے جیسے یہی منزل ہو۔ یہی آخری بلندی ہو اور وہاں پہنچ کر کھلتا ہے کہ نہیں۔ ابھی تو منزل مادور است۔ کاروان شوق کے اونٹ کی ٹانگیں سمیٹ کر اس کے پیٹھ جانے اور آپ کے اترنے کا لمحہ ابھی نہیں آیا۔ ابھی تو دائیں جانب اٹھتی ایک اور بلند مسافت درپیش ہے۔

یہاں پہنچ کر البتہ منظر وسیع ہو جاتا ہے۔ جبل نور کی دوسری جانب جو وادیاں ہیں وہ نظر آنے لگتی ہیں۔ چمچر، لکڑی کے ٹوٹے پھوٹے بیج اور سائبان جو دن کے وقت زائرین کو دھوپ سے بچاتے تھے اور ان کے سائے میں وہ مشروبات سے اپنے آپ کو تازہ دم کرتے تھے۔ سب کے سب یکسر ویران پائے گئے۔

نہ دھوپ تھی اور نہ پیا سے زائرین۔ بس ایک چیونٹا تھا۔ اور اس کے تھیلے میں پیاس بجھانے کے اپنے سامان تھے۔ میں نے ایک ٹوٹے ہوئے بیج پر اپنے آپ کو بمشکل قائم رکھ کر دودھ کا ایک اور طویل گھونٹ بھرا۔ جہاں دن کے وقت ایک ہجوم ہوتا تھا وہاں تبہا بیٹھ کر جبل نور کی دوسری جانب جو وادیاں سائے میں جا چکی تھیں اُن پر نظر کی۔ اس مقام سے دائیں ہاتھ پر سلسلہ کوہ میں جو ایک ہموار سطح تھی اسے حیرت سے دیکھا۔ اور پہلی بار پر یقین ہوا کہ میں اوپر پہنچ جاؤں گا۔

اوپر جانے کے لیے کھردری۔ تاہم وار اور مختلف شکلوں کی سیڑھیوں کی آسائش بہر طور موجود تھی۔ ہاتھ پھاڑی راستے کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ اس لیے مجھے یقین ہے کہ اب اوپر پہنچ جانا یقینی ہو چکا ہے۔ دو چار سیڑھیاں اوپر گیا ہوں تو کاریگر حضرات کا دیدار ہو گیا۔ وہ بھی اُس اپانچ گداگر کی مانند ان بھری کمائی سینٹے حساب کتاب کر رہے تھے۔ وہی کاریگر حضرات جو مٹھی بھر سینٹ میں بوری بھریت مار کر صرف ایک مٹی کی سیڑھی تیار کر کے اُس کی گیلی سطح کو پھیلنے لگی برسوں سے ایک تیشی سے تھپکتے چلے آتے ہیں اور صد ادیتے ہیں کہ یا حاجی صدقہ کرو۔ خیرات کرو۔ غار حرا تک جانے والی سیڑھیوں کی تعمیر کے لیے کچھ رقم عنایت کرو۔ جہاڑی رقم سے تعمیر کرو یہ سیڑھی جہیں جنت تک لے جائے گی۔ اور یہ خدا نہیں وہ صرف اردو میں نہیں دیتے بلکہ ملت زہانی کی حد کرتے ہیں اور زائر کی قومیت بھانپ کر ان کی قاری۔ سندھی۔ پشتو اور بلالی میں بھی دیتے ہیں۔

ان کاریگر حضرات نے بھی مجھے ملک کی نظروں سے دیکھا کہ جو اوپر گئے تھے وہ لپے چاہتے

ہوں۔ تو ایک آخری کوشش تو کر دیکھوں۔ جیسے کے ٹوکی چوٹی بالکل قریب پا کر ایک مکمل طور پر اسے چکا کوہ نور ایک اور قدم بہر طور کوشش کر کے اٹھالیتا ہے۔

میں حوصلہ ہارنے کو تھا کہ ایک اپانچ فقیر نے مجھے حوصلہ دے دیا۔ وہ ایک چٹان سے ٹپک لگائے دن بھر کی کمائی ریالوں روپوں اور لیروں میں شمار کر رہا تھا اور جس نے اپنے ناکارہ اعضاء کو سمیٹ رکھا تھا اور اُس نے مجھے اپنے سامنے پایا تو بعد حیرت دیکھا۔ اور پھر فوراً ہی اپنی حیرت پر قابو پا کر کسی ناشناس بوٹی میں صدالگائی اور جب میں نے سر ہلا کر لاطینی کا اظہار کیا تو اُس نے زبان کے ساتھ لہجہ بھی بدل لیا۔ ”میڈھے سائیں۔ صدقہ دو۔ خیرات کرتے جاؤ۔ کچھ دے کر جاؤ سائیں“

یعنی یہ اپانچ فقیر۔ اگرچہ کسی ٹھیکیدار کے کارندے نے اسے کاندھوں پر لا کر صبح سویرے یہاں پہنچایا تھا اور اسے پھر سے تھوڑی دیر میں نیچے مکہ میں لے جایا جائے گا تو بے شک یہ پہنچایا گیا ہے لیکن پہنچ تو گیا ہے۔ تو میرے تو ہاتھ پیر ہیں مجھے تو اوپر پہنچنے پر دو جہان کی بھیک ملے گی تو چلو۔ کچھ ہمت کرو۔

دو چار صدائوں کے بعد اُس نے اپنا وقت مزید ضائع کرنا مناسب نہ جانا اور دن بھر کی دولت شماری میں پھر سے مشغول ہو گیا۔

میں نے رُک سیک میں سے دودھ کی بوتل نکال کر ایک طویل گھونٹ بھرا جو نہایت لذت بخش والا تھا اور چڑھنے لگا۔

سائیں بحال کرتا۔ اپنے آپ کو شاباش شاباش کہتا جبل نور پر چڑھتا گیا۔

جیسا کہ میں نے دیکھا تھا۔ اگر کوئی شخص خانہ کعبہ سے ادھر آنے والی شاہراہ پر کھڑے ہو کر اس کوہ پر نظر کرتا تو اسے اس کی بلند ہوتی تنہائی میں۔ ایک ناقابل یقین اونچائی سے اترتے کچھ چوٹے سے نظر آتے۔ وہ ان سرکتے چیونٹوں پر کچھ دھیان نہ دیتا کہ یہ تو معمول تھا۔ جبل نور سے اس سے بہت سائے بڑھتے جاتے ہیں لوگ اترتے ہی رہتے ہیں۔

اور اہل مکہ اس معمول کے عادی ہو چکے تھے۔

لیکن اس معمول میں ایک شدید خلا فکری و فیزیکی ہو رہی تھی۔ وہ شخص دیکھتا کہ جبل نور کی بلندی پر ایک تنہا چیونٹا ہے جو دھیرے دھیرے سرک رہا ہے اور نیچے نہیں آ رہا بلکہ ہولے ہولے اوپر کی جانب رینگ رہا ہے۔ وہ یقیناً حیرت میں چلا جاتا کہ یہ کس قسم کا چیونٹا ہے جو یہ نہیں جانتا کہ شام اترے کہ ہے۔ وہ تنہا سرکتا جاتا ہے اور اس کے اوپر پہنچنے تک تاریکی چھا جانے کی تو یہ وہاں کیسے آئے گا۔ وہ مزید حیرت میں چلا جاتا کہ اگر اُس کی طرف سے کوئی معلوم ہو جائے کہ یہ وہاں آنے کی تمنا نہیں رکھتا

ہیں یا جا رہے ہیں تو یہ کس حساب میں اوپر چلا جاتا ہے۔ ان میں سے صرف ایک نے مجھے سے دل سے صدالگائی کہ حاجی صدقہ دو۔ اور جب حاجی ہانپتا لرزتا اپنے تہمتی تھیلے کے بوجھ سے جھکا جاتا قلمی متوجہ نہ ہوا تو وہ اپنی دن بھر کی آمدنی شمار کرنے میں محو سا ہو گیا۔

اب تو چڑھائی آسان ہو گئی تھی۔

پاؤں تلے سنگریزے نہ تھے۔ راستے میں پتھر نہ تھے۔ میڑھیاں جیسی بھی تھیں ان پر جوگر پھسلنے نہ تھے۔

جبل نور میٹر ہارن کی سوس چوٹی کی مانند ایک عقاب کی چونچ کی مانند خم کھاتا ہوا اب دھوپ سے یکسر خالی ہو چکا تھا۔ مکمل طور پر سائے میں آچکا تھا اور یہ سائے اس کی بلندی سے اتر کر وادی مکہ کی بستیوں کے پہلے مکانوں اور راستوں پر پھنسنے کو تھے۔

میں ایک موٹر پر دم لینے کے لیے رُکا تو دائیں ہاتھ پر ایک پیالہ نما کھنڈر نظر آنے لگا۔

جبل نور کی ایک گھاٹی میں یہ پہلی باقاعدہ انسانی تعمیر تھی۔ اگرچہ کھنڈر ہو چکی تھی۔

کچھلی بارادھر سے گزرا تو یہی خیال آیا کہ شاید کسی زمانے میں یہاں کوئی سرائے ہو۔ زائرین کے قیام کے لیے کوئی عمارت ہو جو ڈھلے چکی ہے۔ لیکن اس کی شکل ایک متروک شدہ تالاب کی مانند کیوں ہے۔ پاکستان واپسی پر مطالعے میں قدرے وسعت ہوئی تو معلوم ہوا کہ دراصل یہ ”خزانہ“ تھا۔ ترک دور میں جبل نور پر دو ”خزانے“ تعمیر کیے گئے۔ ایک یہ جو میرے دائیں ہاتھ پر کھنڈر ہو رہا تھا اور دوسرا وہ جو چوٹی کی دوسری جانب تقریباً اسی سطح پر تعمیر کیا گیا اور جبل نور پر چڑھتے ہوئے اگر آپ غور سے اُس جانب دیکھیں جہاں پس منظر میں مکہ ہے تو اُس کے آثار بھی دکھائی دے جاتے ہیں۔

خزانے۔ دو تالاب تھے۔

ترکوں نے انہیں زائرین کی سہولت کے لیے تعمیر کیا اور ایسی ساخت میں کہ جب کبھی بارش ہو دھلوانوں پر بہتا پانی ان میں جمع ہو جائے۔ اور غار حرا تک پہنچنے کی جستجو میں تھکے ہارے اور پیاسے لوگ اس سے اپنی پیاس بجھا کر تازہ دم ہو سکیں۔ ہمارے موجودہ معیاروں کے مطابق وہ پانی قدرے گدلا ہوتا ہوگا لیکن اُن زمانوں میں جب گوریلوں کے کارٹن اور منزل و اثر کی بوتلیں ابھی ایجاد نہیں ہوئی تھیں اور مشینوں سے یہاں تک پانی لانا ممکن ہی نہ تھا تو اُن زمانوں میں یہ گدے پانی کیسی بڑی نعمت اور راحت ہوتے ہوں گے۔

ایک ”خزانہ“ تو اس راستے کے قریب تھا جو میں نے اختیار کر رکھا تھا لیکن دوسرا خزانہ بھی

خالق سمت میں پہاڑ کے دوسری جانب کیوں بنایا گیا تھا۔ یقیناً اس لیے کہ ان دنوں ادھر سے بھی ایک راستہ چوٹی تک جاتا ہوگا۔

یہ خزانے اب خشک پڑے تھے اور کھنڈر ہو چکے تھے۔

ویسے تو پانیوں کے ذریعے بڑی آسانی سے اب پانی یہاں تک پہنچایا جاسکتا تھا لیکن اتنا زبردستی کرے۔ اگرچہ حاکم کے دوران زائرین کو تازہ پانی ملنا شروع ہو جائے تو اُن کی تعداد میں اضافے کا غدشہ تھا اور یہ کسی صورت میں قابل قبول نہ تھا۔ جبل نور کو اسی لیے ایک بڑا ڈسٹ بن بنے دیا گیا تھا۔ اس کی صفائی اور ستھرائی کا کوئی انتظام نہ تھا تا کہ زائرین کی حوصلہ شکنی کی جاسکے اور وہ شرک سے آجائیں۔

اس خشک ہو چکے ترک ”خزانے“ کو دیکھ کر میں پھر سے پیاسا ہو گیا حالانکہ دھوپ ڈھل چکی تھی ایک چوڑے پتھر پر بیٹھ کر میں نے منرل واٹر کی بوتل سے منہ لگا کر دو گھونٹ بھرے اور پھر بوتل کے نصف ہو جانے پر کچھ فکر مند ہوا کہ میرے پاس صرف ایک اور بوتل باقی تھی۔ یعنی پانی کی سپلائی کم ”لی جا رہی تھی۔“

نیچے سے ایک شخص شلوار قمیض میں ملبوس خاصا تنومند اپنی پشت پر ایک بہت بڑا کریٹ لٹا کرے جھکا ہوا سینہ جیوں پر چڑھتا آ رہا تھا۔

وہ مجھے دیکھ کر یا سانس درست کرنے کی خاطر میرے قریب آ کر ٹھہر گیا۔ ”صاحب اوپر جا رہے ہو؟“

”جی۔“

”واپسی کے لیے آپ کے پاس ٹارچ ہے؟“

”جی ہاں۔“

”اندھیرے میں اترنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ بوڑھے لوگ گر جاتے ہیں۔ زخمی ہو جاتے ہیں۔ آپ یہاں بیٹھے نہ رہو جلدی سے اوپر پہنچو اور پھر نزل پڑھو اور نیچے آ جاؤ۔ ابھی تھوڑا روشنی ہوگا۔“

”ہاں۔“

میں طویل گفتگو سے اس لیے بھی پرہیز کر رہا تھا کہ میرا سانس ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ اس شخص کا نام اشرف تھا اور وہ جبل نور کی چوٹی پر جو پتھر ہوٹل تھا وہاں تک نبوس اور بوتلوں کا کریٹ لے جا رہا تھا۔ شاید وہ اُس پتھر کے کاروبار میں شریک تھا یا محض مزدوری کر رہا تھا لیکن یہ طے تھا کہ وہ اس مقام

سائرنے کی سکت رکھتا ہوں۔ مجھے پریشانی لاحق تھی۔
آخری کار بگڑ آ گیا۔

زائرین کے مقدس جذبات کو بھڑکا کر انہیں ثواب کے باغ دکھا کر رقم بٹورنے والا آخری لافنگر۔ اس نے اب ریت اور مٹی بھر سینٹ کی اس مدت سے زیر تعمیر سیڑھی پر پانی چھڑکنا اور تھیں اسے تھپکتے جانے کا عمل ترک کر دیا تھا۔ جانے وہ کس کا منتظر تھا۔ شاید اوپر کچھ زائرین ابھی موجود تھے اور اسے جانے والوں کا اور واپس آنے والوں کا پورا پورا حساب تھا تو وہ ان کی واپسی کا منتظر تھا۔ وہ اپنی جگہ سے ہٹ کر ایک پتھر پر براجمان جبل نور پر کم ہوتی روشنی میں نہایت امن اور شائستگی کی کیفیت میں سگریٹ کے سونے لگا رہا تھا۔ میرا سانس درست کرنے کا اگلا وقفہ اس کے قریب آیا۔ جانے کیوں وہ مجھ سے غیر متعلق رہا۔ مجھے دیکھ کر کسی حیرت کا اظہار نہ کیا اور اطمینان سے اپنے سگریٹ سے لطف اندوز ہوا۔ ہاں یہ میرا معمول ہو کہ میں وہاں سے سرشام گزرتا ہی رہتا تھا۔

میں نے سلام دعا کے بعد نہایت معصومیت سے اس کے پیشے کے بارے میں دریافت کرنا شروع کر دیا۔ ”بھائی آپ کب سے یہ سیڑھی بنارہے ہو؟“
”آج سویرے شروع کی تھی۔ بس چند دنوں کی بات ہے اوپر چوٹی تک لے جاؤں گا۔ انشاء اللہ آپ کچھ صدقہ خیرات کرو ثواب ہوگا۔ جنت میں سیڑھی بنے گی اللہ کے فضل سے۔“
”مجھے یاد پڑتا ہے کہ“ اور مجھے واقعی یاد پڑتا تھا ”کہ سات ماہ قبل جب میں حج کے دوران یہاں تک آیا تھا تو آپ اسی سیڑھی کو تھیں سے تھپک رہے تھے۔“
”مسل کش لگا تا سیڑھی والا کار بگڑ چوکنہ ہو گیا“ نہیں صاحب۔“
”ہاں بھئی۔ میں نے تمہیں یہیں دیکھا تھا۔“

اس نے فوراً ہتھیار ڈال دیئے ”مہنگا کام ہے صاحب۔ روزانہ ریت کی بوری اوپر لاتے ہیں پالی اصوات ہیں۔ دھوپ میں بیٹھتے ہیں۔ کیا کریں غریب لوگ ہیں۔ بال بچہ بہت ہے۔“
”اچھا یہ بتاؤ کہ سب سے زیادہ صدقہ خیرات کون لوگ کرتے ہیں؟“
”کیوں پوچھتے ہو؟“

”آپ پرتس آتا ہے کہ اتنی محنت کرتے ہو تو کیا ملتا ہے۔ ویسے ہی پوچھ رہا ہوں۔“
”صاحب پاکستانی لوگ بہت جذبات رکھتا ہے۔ جیب خالی کر دیتا ہے۔ افریقی کچھ نہیں دیتا۔ ترک بھی کچھ نہ کچھ دے جاتا ہے۔ یہ جو ایرانی ہوتا ہے وہ رقم نہیں نکالتا۔ کھانے پینے کا چیز دے گا۔ چینی کو لاءے گا۔ دعاؤں کی کتاب دے گا۔ لیکن کچھ کم دے گا۔“

سے پوری طرح آگاہ ہے۔ اس سے کچھ معلومات حاصل ہو سکتی تھیں۔ میں نے اسے اپنے بارے میں کچھ بتایا۔ بس یہی کہ پاکستانی ہوں پچھلی بار آیا تھا تو غار میں جگہ نہ ملی تھی اب پھر قسمت آزمائے کو ہا رہا ہوں۔

”اب تو وہاں کوئی نہ ہوگا۔ شاید دو چار زائرین ہوں۔ شام کے بعد کوئی نہیں آتا۔“

”اشرف۔ آپ رات اور پراہی گزارتے ہو یا نیچے مکہ میں چلے جاتے ہو۔“

”بس جی گزارہ ہو جاتا ہے۔“ اس نے ایک نیوٹرل سا جواب دیا۔ کچھ اقرار نہ کیا۔ ایسی جگہوں پر پائے جانے والے غیر سعودی ہمیشہ احتیاط کرتے ہیں اقرار نہیں کرتے کہ اکثر غیر قانونی طور پر مقیم ہوتے ہیں۔

”اگر اوپر رات بسر کرنی پڑ جائے تو پھر کیا کرتے ہو۔“

”اڈل تو نیچے چلا جاتا ہوں۔ اگر دیر ہو جائے تو چوٹی سے ذرا پہلے دائیں ہاتھ پر پہاڑ کے کنارے ایک ہموار جگہ ہے تھوڑی سی۔ وہاں رات کو ہوا لگتی ہے تو وہاں سو جاتا ہوں۔“
”کوئی خطرہ تو نہیں ہوتا؟“

”نہیں صاحب۔“ اس نے بدن کو حرکت دے کر اپنے بوجھ کا دباؤ بدلا اور پھر کچھ اور کچھ بغیر سیڑھیوں پر چڑھنے لگا۔

کوئی خطرہ نہیں۔ میں نے خوش ہو کر اپنے آپ سے کہا۔ چلے چلو۔ رات بھی بسر ہو سکتی ہے۔ غار میں نہ سہی۔ جبل نور کی چوٹی کے قریب جو ہموار جگہ ہے وہاں۔ جہاں ہوا بھی لگتی ہے۔ لیکن تنہا نہیں۔ اگر کوئی اور وہاں ہو تو۔ حضور جب غار سے باہر آئے تھے تو انہیں حرا کے پہاڑ کے سامنے جو پہاڑ تھے ان پر ایک شخص نظر آیا تھا جو ان پر محیط تھا جو عرش تک جاتا تھا اور حضور ڈر گئے کہ یہ کون ہے۔ اور وہ اہل رُخ دوسری جانب کرتے تو وہ شخص انہیں وہاں نظر آنے لگتا۔ ورقہ بن نوفل نے انہیں آگاہ کیا کہ وہ جبریل تھے۔ تو ایسے مقام پر جہاں سے وہ پہاڑ نظر آتے ہوں۔ سامنے ہوں جہاں جبریل نمودار ہوتے تھے تو وہاں تنہا تو رات نہیں گزاری جاسکتی۔

میں بھی اٹھا۔ اپنا مختصر بوجھ جو میرے لیے ایک بڑے کریٹ سے کم نہ تھا کمر پر لا دیا اور سیڑھیاں طے کرنے لگا۔

میرے سانس درست کرنے کے وقفوں میں اضافہ ہو رہا تھا۔ تھکاوٹ کے ساتھ کسی حد تک بلندی کا بھی کچھ اثر تھا۔ اور شام ہو رہی تھی۔

میں اس تھکاوٹ کو دیکھ کر فوراً ہی نارنجی کی روشنی میں جبل نور

اب تو اس نے مایوس ہو کر ایک اور سگریٹ سلگایا اور سونے لگانے لگا۔ کہ ان بتلوں میں تیل نہیں... میں اٹھا تو احساس ہوا کہ میں نے ناحق اس سوال جواب میں وقت کا زیاں کیا کہ وہ یہوری تھی... شام ہو رہی تھی... اوپر سے کوئی بھی نیچے نہیں آ رہا تھا... اور مجھے ابھی اوپر پہنچنا تھا... وہ نسل ادا کر کے تاریج کی روشنی میں کچھ بھی پہنچنا تھا...

یہاں سے چند میٹر حیاں ملے کر کے اوپر ہوا، تو اوچھل آسمان میرے برابر میں آ گیا... منظر کھلا اور جبل نور کے دوسری جانب جو ہوا تھی وہ میرے بدن کو مس کرنے لگی... میں ایک ایسے مقام پر آ گیا جہاں میں پہلی بار کھلی فضا میں تھا... چڑھائی کے دوران آپ کی نظروں کے سامنے صرف پہاڑ کی شہادت ہوتی ہے لیکن جب آپ اس کی چوٹی کے قریب پہنچتے ہیں تو منظر کھل جاتا ہے اور ہوا بھی کھل کر بدن کو لپیٹ میں لے لیتی ہے... جبل نور کی دوسری جانب جدھر سے یہ کوہ ایک گھاٹی کی صورت میں نیچے نکل کر رہا ہے وہاں اشیاب میں جو اکاؤڈ کا مکان نظر آتے تھے اُن پر شام مکمل طور پر حاوی ہونے کو تھی اور اُن میں کہیں کہیں روشنیاں جل اٹھی تھیں... دائیں بائیں تو فضا کھلی تھی لیکن ابھی سامنے چند میٹر حیاں اوپر کو چاٹی دکھائی دے رہی تھیں... میں سانس لینے کے لیے دیر تک نہیں رکا... میں جان گیا تھا کہ منزل ما دور ہے... یہاں سے چوٹی... لب بام بس دو چار ہاتھ ہے...

میری کمر پر کھسکتے تھقی رُک سیک میں دودھ کی جو بوتل تھی وہ بھی مجھے کچھ کے دینی تھی کہ بس اب منزل آنے کو ہے...

کچھلی بار آیا تھا تو دوطرفہ انسانی ٹریک جاری تھی... لوگ آ جا رہے تھے اور میں اُن کے اہوم لیں... نیمبر کے پیچھے چلا جاتا تھا لیکن آج اسی راستے پر میں یکسر تنہا تھا اور شام ہو رہی تھی... اس آخری شام میں اور یکسر تنہائی میں بھی ایک عجیب کیف تھا... اس کیف میں اگرچہ ڈر شامل تھا لیکن اس کا لطف جدا تھا... میں پھر سے چلنے لگا...

ایک دماغی طور پر کھسکے ہوئے عمر رسیدہ اونٹ کی مانند ہچکولے لیتا... اپنے خزاں رسیدہ دانت بچھڑا... اپنے آپ کو ڈھارس دیتا تھا کہ اے شوریہ سرشتر بے شک تمہارے پاؤں بوچھل ہو چکے ہیں یہاں تک کہ ان میں جو جو گر ز ہیں وہ بھی جھکن سے چوڑے ہو کر نڈھال ہو رہے ہیں لیکن اے مختصر شوق ابھی چند لمحوں میں تھے اس بے انت صحرا میں ایک نخلستان دکھائی دینے کو ہے... تم کمر پر کھاؤ کے بوجھ کو بھگ دو اور سہارو... اور اس نخلستان میں گجروں کے گھنے جھنڈ میں پوشیدہ گہرے نیلے پانیوں کا ایک جھونسا سا تالاب ہے جہاں تمہارے حضور اپنی پیاس بجھانے آتے تھے اور قیام کرتے تھے... جہاں پہلی بار اہل ایمین اترے تھے کہ اس شخص کی پیاس بجھاؤں جس نے کل کا کھانا کوہ و تارہ کرتا ہے اور کچھ

اب اُس کی جھک ختم ہو گئی تھی اور وہ اپنا ڈکھ درد ہانٹنے میں تامل نہیں کر رہا تھا...
”لیکن بھائی ایک بات بتاؤ... نیچے سے جو لوگ اوپر آتے ہیں تو جو پہلا شخص میز می چھلکا سامنے آتا ہے اُس پر نوٹ نچھاور کر دیتے ہیں... پھر دوسرا نظر آتا ہے تو اُسے بھی کچھ دے دیتے ہیں... لیکن جب وہ یہاں پہنچتے ہیں تو اُن کی جیبیں خالی ہو چکی ہیں اور وہ جنت کے بلند ترین درجہات تک جانے والی میز میوں کے لیے صدقہ و خیرات کر چکے ہوتے ہیں تو تمہارے حصے میں کیا آتا ہے... تم یہ یہاں آخر میں دعویٰ رمائے بیٹھے ہو... نیچے جا کر دھند اکیوں نہیں کرتے؟“

اس سوال پر میز می والے کے دل کے پچھپھولے جل اُٹھے... اُس نے مجھے ایک ہمدرد دوست کی صورت میں دیکھا اور ایک المناک سی شکل بنا کر اپنا دکھ بیان کرنے لگا ”صاحب کیا بتائیں... مجھ پر میز می کی بات ہے... ادھر نیچے پہلے میز می والے کو جتنی آمدنی روزانہ ہوتی ہے ہمیں مہینہ بھر نہیں ہوتی... ہم تک آتے آتے حاجی لوگ ثواب سے بیزار ہو چکے ہوتے ہیں اور اُن میں سے جو بہت نیک لوگ ہوتے ہیں وہ کچھ صدقہ دے جاتے ہیں...“

”تو نیچے جا کر کیوں نہیں بیٹھ جاتے؟“

”نہیں بیٹھ سکتے صاحب... ہم لوگ ہندوستان سے آئے ہیں... نیچے جو لوگ قابض ہیں سندھ پاکستان کے ہیں... اور بڑے لڑاکے ہیں... ہم مسکینوں کو نیچے دھند نہیں کرنے دیتے مار پیٹ پر اتر آتے ہیں... جو اچھا والا پہلا جگہ ہوتا ہے وہاں بیٹھتے ہیں اور اپنا فقیر بھی ادھر لا کر بٹھاتے ہیں... بہت دولت مند لوگ ہیں صاحب ہم اُن کا مقابلہ نہیں کر سکتے...“
”کبھی اوپر غار حرا میں بھی گئے ہو؟“

”گیا تھا صاحب... ادھر حاضری دیا تھا دو تین برس پہلے جب ادھر آیا تھا... ادھر کیا کریں گے... روزی تو ادھر ہے...“

تب اُسے یکدم خیال آیا کہ وہ جذبات کی رو میں بہہ گیا ہے اور اپنے پیشے سے غفلت برت رہا ہے... اُس نے سگریٹ کا آخری کش لگا کر اُسے جبل نور کی گھاٹی میں پھینک دیا اور ہاتھ آگے کر کے بولا ”اب تو کچھ صدقہ خیرات کرتے جاؤ... جنت میں میز می بنے گا...“

چونکہ میں نے ملے کر رکھا تھا کہ جنت میں اگر بنائی میز می ہو گئی تو سبحان اللہ وہ اپنے خرچے سے قطعی طور پر نہیں بنواؤں گا اس لیے میں نے کچھ جواب نہ دیا اور تھقی رُک سیک اپنی پشت پر بجا کر اٹھ کر اُڑا...

میں یوں جنت کے حصول کی خاطر وہاں رہا کہ ابھی اپنی جیب میں سے باہر کرنے سے قاصر

ایسی دن کو مردہ کر دینے والی سراسیمگی گرفت میں لے کر مجھے گھونٹ دیتی تھی۔

چھتر تلے کی اسی تاریکی میں ایک سرسراہٹ سی ہوئی جس نے اونٹ غریب کا رہا سہا خون بھی خشک کر دیا۔

اس سرسراہٹ کے نتیجے میں نیاز نمودار ہوا۔

اُس کی نموداری واضح نہ تھی صرف ایک سایہ سا تھا۔ جس نے تاریکی میں سے جنم لیا تھا۔ نہ میں اُس کی شکل دیکھ سکتا تھا اور نہ ہی وہ یہ جان سکتا تھا کہ اس ڈھل چکی شام میں جبل نور کی چوٹی پر جو بھکتا ہوا اہل اونٹ آن پہنچا ہے یہ کون ہے۔ ہم دونوں واہے اور سائے تھے ایک دوسرے کے لیے۔ شکلیں نہ تھیں ہم یہ لے تھے۔ اُس نے کچھ کہا مجھ سے مخاطب ہو کر۔ اُس نے کیا کہا۔ میری سمجھ میں نہ آیا۔ پھر اُس نے کچھ اور کہا اور پھر کچھ اور۔

اور جب اُس نے کچھ اور کہا تو وہ لفظ آشنا سے لگے کہ یہ فارسی کے تھے۔ اور جب میں نے جواب میں کچھ بھی نہ کہا تو اُس نے جو کچھ کہا وہ بہت ہی آشنا تھا ”بھائی جی۔ کتھوں آئے او۔“

میں خوش ہو گیا۔ ”بھائی آپ پنجابی جانتے ہو؟“ یہ میں نے پنجابی میں ہی دریافت کیا۔

”آہو جی۔“

”تو یہ ابھی ابھی کیا بول رہے تھے؟“

”یہ تو میں فارسی ترکی۔ بنگالی اور انڈویشین وغیرہ بول رہا تھا۔“

”آپ یہ سب زبانیں جانتے ہیں؟“

”گزارے موافق۔ آپ ادھر چھتر تلے کھڑے تھے تو پہچان نہیں ہو رہی تھی کہ کون ہے ایرانی ہے ترک ہے کون ہے۔“

وہ مجھے وہاں اُس اندھیرے میں تنہا پا کر حیران نہیں ہوا تھا۔ اور نہ ہی اُس نے پوچھا کہ یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو۔

مجھے تشویش تھی کہ کہیں وہ مجھے تنہا چھوڑ کر چلا نہ جائے۔ مجھے ہر صورت اُس کے ساتھ دوڑتی کر

لپٹنے کی شد یہ خواہش تھی ”آپ یہاں کیا کرتے ہو؟“

”میں یہاں بہت کچھ کرتا ہوں حاجی صاحب۔“ اُس کے لہجے میں بہت اپنائیت تھی۔ ”دن کے نیم لمبی ادھر دائرین کو جوں اور پالی دیتا ہوں۔ کچھ سے سامان بھی لاتا ہوں۔ میرے پاس پلو اور انڈا

سوالوں کے جواب نہیں مل رہے تو اُسے وہ جواب پڑھاؤں۔ اقراء کا اذن دوں۔

تو اُسے غم رسیدہ۔ حواس باختہ کچھ ناکارہ اور آوارہ شک سے بھرے اونٹ۔ تیری جلد ڈھلک رہی ہے دانت اکھڑ رہے ہیں۔ جیڑا چارہ چبانے سے قاصر ہوتا جاتا ہے۔ اور آنکھیں مدھم مدھم رہی ہیں۔ تو ذرا سی ہمت اور کر لے۔ تو بے شک عیبوں سے بھرا ہے ابھی تک نہیں جانتا کہ تو موسیٰ ہے یا فرعون۔ تو یہ جاننے کے لیے تھوڑی سی ہمت کر جان جائے گا۔

آخری سیر می پر آخری قدم۔ اور میں جبل نور کی چوٹی پر ایستادہ چھتر تلے تھا۔

جونہی چھتر تلے گیا تاریکی بڑھ گئی۔ وہاں گھپ اندھیرا تھا۔ آسمان دکھائی نہ دیتا تھا کہ رات میں چھتر حائل تھا۔

میرے جو گرد تلے خالی ڈبے اور کارٹن دبتے تھے۔ منرل واٹر کی ایک خالی بوتل پاؤں تلے آئی تو اُس کے پلاسٹک کے دبنے سے کڑکڑاہٹ ہوئی جس نے مجھے ایک لمحہ کے لیے ڈرا دیا۔

یہاں کوئی نہ تھا۔ تاریکی میں کچھ کرسیاں۔ ایک کاؤنٹر اور ایک شیلف بچھے ہوئے تھے۔ میں کچھ دیر یہیں تاریکی میں کھڑا رہا۔

ذرا آگے۔ دو چار قدم آگے۔ میں جانتا تھا کہ اگر میں ذرا آگے جاتا ہوں تو ایک مختصر ہموار سطح آئے گی وہ بھی دو چار قدم کی اور پھر چوٹی سے اترتی کچھ تنگ سیڑھیاں ہوں گی۔ ان میں ایک موڑ آئے گا اور کھائی پر معلق یہ سیڑھیاں جب اختتام کو پہنچیں گی تو وہاں دائیں ہاتھ پر ایک تاریک سرنگ ہوگی جس کے پار غار ہے۔ یا رہے۔ اب کیا کروں؟ کب تک کھڑا رہوں۔

تنہا نیچے جانے کا سچی بات ہے مجھ میں حوصلہ نہ تھا۔ اور یہ بھی کہاں ممکن تھا کہ جھڑتے والوں اور ڈھلکتی کھال والا بے ڈھب بابا اونٹ یہ سوگھ لے۔ اُس کے بوڑھے نچھنے ایک ہاس سے آشنا ہو جائیں جو خبر کر دے کہ نخلستان تو آگیا ہے اور اس کے درمیان کیسے ٹھنڈے پانی ہیں جو تنہا ہی اذلی پیاس بجھانے پر قادر ہیں۔ یہ جان لے سوگھ لے اور پھر بھی وہ آگے نہ جائے ناگھیں سمیٹ کر وہیں اچھڑا جائے یہ کہاں ممکن تھا۔

یہ ممکن تو نہ تھا لیکن اس کے باوجود تنہا نیچے جانے کا مجھ میں حوصلہ نہ تھا۔

جب وہاں کی روشنی تھی۔ لوگ تھے۔ ٹیبلر ساتھ تھا تب بھی اُس اندھیری غار میں جالے سے ہول آتا تھا۔ نہیں کیا تھا۔ بھوم میں دم کھٹنے کے خوف سے اور اُس کی تاریکی کے ڈر سے۔ اور اب۔ میں اگلا

تھا۔ تاریکی آ رہی تھی میں اُس غار کے دہانے تک نہ جاتا تھا لیکن اُس کے اندر اترنے کے یہاں سے

وہ چونکہ میرے اقرار کرنے پر کچھ نہ بولا تھا اس لیے میں نے دوبارہ کہا ”ہاں میں وہی تارڑ ہوں۔“

میرے تارڑ ہونے سے وہ کچھ زیادہ متاثر نہ ہوا۔ جانے اس مقام پر کیسے کیسے نامور تارڑ اور اللہ کی قربت والے آتے تھے تو وہ کیسے مجھ ایسے جعلی شہرت کے بھوکے بے وقوف سے متاثر نہ ہوئے۔ وہ راستے کر کسی پتھر کو پہچان لے کر یہ دیکھا ہوا لگتا ہے۔ کسی اونٹ کی تھو تھنی سے اندازہ کر لے گا۔ اسے لکھ دیکھا تھا۔ اور پوچھ لے کہ تم وہی پتھر ہو۔ وہی اونٹ ہو۔ ایسے اُس نے مجھ سے پوچھا تھا کہ تم وہی تارڑ ہو تو جواب اثبات میں پا کر کیسے متاثر ہوتا۔

”آپ نے نیچے غار تک بھی جانا ہوگا۔ تو آ جائیں۔“

”آپ بھی ہوں گے ناں۔“

”آہو جی۔ آ جائیں۔“

میں آ گیا۔

نیاز جبل نور کی چوٹی سے اترتی۔ وادی مکہ کی جانب رخ کرتی گہرائی میں اترتی تھی۔ وہاں چوٹی پر اترنے لگا۔ اور میں اُس کے پیچھے پیچھے۔ اُسے نظر میں رکھتا ہوا کہ وہی میری ڈھارس تھی۔ میرا ہمارا تھا۔

اور یہاں سے سڑھیاں اترتے ہوئے جبل نور کی اعلیٰ ترین اونچائی سے اس کے دامن سے شروع ہو کر جہاں تک نظر میں جانے کی سکت تھی وہاں تک ایک ایسا جادوئی منظر دیکھا۔ ایک بار دیکھا۔ اسی لمحے سے دوسری بار دیکھنے کی ہوس نے سر اٹھایا۔

یہ خالق کی جانب سے ایک آوارہ گرد کی خاطر زمین پر اتارا گیا تھا۔

یہ ایک اور انعام تھا۔ ایک تحفہ تھا۔ جو صرف مجھ ایسے سیاہ کار آوارہ گردوں کے نصیب میں

آتا ہے۔

یوں تو کبھی منظر خالق اُتارتا ہے۔

لیکن ایسے منظر کسی کسی پر اُتارتا ہے۔

اس لیے کہ ایسا تارڑ اور ایسی وادیں بھی تو کسی کسی میں ہوتی ہے۔

میں وادی مکہ کے ارد گرد جتنی بھی بلندیاں ہیں۔ میں اُن میں سے جو بلند ترین اس کی چوٹی پر

آج شب میں ہوں۔ جبل نور کی چوٹی پر ہوں۔

کیمرو ہے جس کے ساتھ حاجیوں کی تصویریں بھی اُتارتا ہوں۔ فوٹو گرافر بھی ہوں۔ آپ کا تصویر اُتاروں؟“

”نہیں شکریہ۔ یہاں تو تاریکی بہت ہے۔“

”قلیش ہے صاحب۔ یادگار بنے گا۔“

”نہیں۔ آپ کا نام کیا ہے؟“

”نیاز۔ آپ پہلی بار آئے ہو؟“

”نہیں۔ پہلے بھی آچکا ہوں۔ تو تم فوٹو گرافر بھی ہو؟“

”ہاں جی۔ دن کے ٹیم یہاں بہت لوگ ہوتے ہیں۔ ہم نے ادھر پتھروں پر ”غار حرا“ لکھا ہے۔

کیا ہوا ہے۔ حاجی لوگ اُن کے سامنے کھڑے ہو کر تصویریں اُترواتے ہیں اور خوش ہو جاتے ہیں۔“

”لیکن غار حرا تو نیچے ہے۔ یہاں تو نہیں ہے۔“

”کیا فرق پڑتا ہے صاحب۔ جبل نور کا ہر پتھر غار حرا ہے۔“

یہاں پتھر تلے تو گھپ اندھیرا تھا۔ گہرا اور ڈھکا ہوا لیکن بقیہ جبل نور ایسی تاریکی میں نہ تھا۔ کہ اس کے دامن میں واقع وادی مکہ کی آبادیوں میں۔ اور شاہراہوں پر جو روشنیاں کہیں جھمکنے میں اور کہیں بکھری ہوئی تھیں اُن کے عکس اس کوہ کو بھی تاریکی میں نہ جانے دیتے تھے۔ وہ تیز روشنیاں اگرچہ اس جبل تک پہنچنے پہنچنے ایک دیے کی لو میں بدل جاتی تھیں لیکن وہ کافی تھیں اس کی ہیئت اور شکل واضح کرنے کے لیے۔ نیاز کی رفاقت سے مجھے حوصلہ ہوا اور میں ذرا آگے ہوا۔ پتھر کی چھت سے اُرا آگے ہوا تو اُس ہلکی مدھم روشنی میں آگیا اور اس کے ساتھ ہی مکہ کی پوری وادی جبل نور کے قدموں میں پچھی روشن نظر آنے لگی۔ میں اس منظر میں مبہوت تھا کہ نیاز کچھ قریب ہوا اور کہنے لگا ”صاحب۔ آپ وہ تو نہیں ہو۔ تارڑ صاحب؟“

”ہاں۔ بالکل وہی ہوں۔“

کام بن گیا تھا۔ میں اس دیار میں ہمیشہ پہچانے جانے سے کتراتا تھا۔ منہ چھپائے پھرتا تھا لیکن یہاں میں پہچانا جاتا تھا۔ بے شک میں تھوڑا سا کمینہ ہو جاتا۔ اپنی بوتھی آگے کر کے دانت نکال کر زبردستی اپنی پہچان کرواتا کہ اس مقام پر میں اپنی شہرت کیش کروانا چاہتا تھا۔ میں نیاز کو باور کروا دیتا تھا کہ اس نے آج تک مجھ ایسا مشہور عالم شخص نہ دیکھا تھا صرف اس لیے کہ۔ کہیں وہ مجھے چھوڑ کر چلا نہ جائے۔ مجھے اُس کی موجودگی کا سہارا اور کار تھا۔ اُس کی رفاقت کی بیساکھیوں کے سہارے میں کم کم اُس کی طرح کے دلکش چہرے کا ہونا چاہتا تھا۔

یہ بنگالی بابا کیسے سامنے آ جاتا ہے میں عرض کرتا ہوں۔

جب آپ جبل نور کی چوٹی سے اتر کر سیرجیوں پر احتیاط سے اترتے جب آخری سیرجی پر اترتے ہیں تو پہاڑ کی ڈھلوان ہے جو اس کے دامن تک گرتی جا رہی ہے۔ اس تقریباً عمودی ڈھلوان سے چمنا ہوا ایک چھتر ہے۔ وہاں چھتر تلے اور چھتر تلے اور کیا ہے۔ ایک بوسیدہ سا بستر بندھا ہوا۔ پانی کی بوتلیں۔ ایک دو چار تختوں کو آپس میں ٹھونک کر بنایا گیا لرزیدہ سا لکڑی کا بیچ جس پر کچھ گندے منگے کھس پڑے ہیں۔ ردی کاغذوں کے پلندے۔ اور چھتر تلے اس سرنگ کا دہانہ ہے اور وہاں ایک چھتر پر آلتی پالتی مارے اپنے ڈھلکتے ہوئے تہبند کو سنبھالتا سفید ریش سنوارتا بڑے تربوز سے سروالا یہ بنگالی بابا ہے۔ جو اس بدھ کا ہم شکل ہے جو اگر بنگال میں پیدا ہوتا تو ہو بہو ایسا ہوتا سوائے سفید داڑھی کے کہ اس کی تو ند چینی جاپانی مہاتما بدھ کے ہم پلہ تھی۔ ہمارے گندھارا کے بدھ تو نہایت سمارٹ متناسب بدن کے اپالود یوتا ایسے ہوتے ہیں۔ تو یہ بنگالی بدھ مہاراج جس سے ہم چھتر تک اتر آئے ہیں تو اپنے سنگھاسن پر براہمان۔ یعنی ایک چھتر پر کچھ گندے سے رکھے اُن پر براہمان ہمیں دیکھ کر اپنا ہاتھ دھاتا ہے جس میں ایک نارنج ہے اور ذرا سا آگے ہو کر دائیں جانب جو کھوہ سی دکھائی دے رہی ہے اس کی تاریکی میں روشنی ڈالتا ہے کہ یہی وہ دشوار تنگ اور چٹانوں کی رکاوٹ والی سرنگ ہے جو غار حرا کے گمن میں جاتی ہے۔

یاد رہے کہ یہ سارا منظر شام کے بعد کا ہے۔ رات کی قربت کا ہے اور تاریکی میں جنم لے رہا ہے۔ اس اندھیرے میں جبل نور کی ایک کھائی کے کنارے چھتر تلے اگر ایک ایسا بابا یکدم میرے سامنے آ جاتا اور نیاز میرے ہمراہ نہ ہوتا تو یقیناً میرا دم نکل جاتا۔

میں نے اسے ایک نہایت خوشامداتہ سا السلام علیکم کہا اور اُس کے قریب بیچ ٹول کر اُس پر ہنسنے لگا اس احتیاط کے ساتھ کہ کہیں میں اس ناتواں اور لرزتے بیچ سمیت کھائی میں نہ لڑھک جاؤں۔ اس نے میرا خیال ہے کہ میرے سلام کو یا تو سنا نہیں اور اگر سنا تو سمجھا نہیں کیونکہ اُس کے جواب میں کچھ نہ کہا اسی حالت میں ادھر ہی کو جھکا رہا اور سرنگ کے اندر روشنی ڈالتا رہا۔ اور پھر نیاز نے نہایت دوستانہ انداز میں اسے کچھ کہا تو وہ نارنج بھا کر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ وہ ناراض سا نظر آتا تھا۔ میں نے اُس کی روشنی کو ضائع کر دیا تھا اور سرنگ کے اندر نہیں گیا تھا۔

ابا بنگالی نے سرنگ میں روشنی ڈال کر دائیں کو راستہ دکھانے کے لیے اپنی زندگی وقف کر رکھی تھی اور ملت میں نہیں کر رہی تھی۔

پہلے دن رات ہماری رہا تھا۔ یعنی اب تک (آخرین) کا آنا مانا لگا رہے۔ وہ جو بھی کسی

اور میرے قدموں میں۔ مکہ ہے۔ نہیں یہ اظہار قلمی طور پر ناواجب ہے۔ مجھے یہ نہیں کہنا چاہیے کہ میرے قدموں میں مکہ ہے۔ میں جہاں ہوں اُس کے گہرے نشیب میں مکہ کی وادی روشنی۔ روشنی۔ جھلملاتی کہیں اور کہیں ٹٹماتی نمایاں اور روشن ہوتی جاتی ہے۔ اور اس دنیا کے عزیز ترین شہر کی روشن بستیوں میں۔ منور آبادیوں میں۔ اُن میں گھرا ہوا رب کا گھر ہے۔ خانہ کعبہ ہے۔

میں بہت بلندی پر ہوں۔ بہت فاصلوں پر ہوں۔ تو یہاں سے وہ مختصر ماڈل کی صورت نظر آتا ہے۔ اتنا مختصر دوریوں میں اتنا دور کہ اُس کے مینار بس اتنے اونچے ہیں جتنی اونچی ایک آدمی ٹنل اور اُن کی جسامت بھی اتنی ہی ہے۔ اور اُن میناروں کے درمیان جو روشنی دکتی سفید سفید ہے اُس کے درمیان میں خانہ کعبہ ہے۔ جسے فاصلے کبھی دکھاتے ہیں اور کبھی روپوش کر دیتے ہیں۔ خانہ کعبہ کبھی دکھائی دینے لگتا ہے اور کبھی نظر کا دھوکا لگتا ہے روشنیوں میں گھل جاتا ہے۔ آنکھیں دھیں ایک نقطے پر جمائے رکھو تو وہ ہے۔ ایک بار آنکھیں جھپک دو تو وہاں نہیں ہے۔

خانہ کعبہ۔

وادی مکہ کی روشنیوں میں آنکھوں کو خیرہ کر دینے والا ایک مختصر سورج۔

ایک چھوٹا سا ماڈل۔

ایک گھر وندا۔

ایک دھنکا ہوا گھر۔ جو ابھی دکھائی دے رہا ہے اور ابھی حرم کے سورج میں گھل جاتا ہے۔

بے شک وہ حقیقت ہے۔ وہاں ہے۔ لیکن یہاں سے اس بلندی سے۔ غار حرا تک اترنے والی سیرجیوں سے وہ ایک خواب لگتا تھا۔

یہ سیرجیاں جبل نور سے چمٹی ہوئی۔ ایک کھائی سے پہلو بچاتی ہوئی۔ یکدم رُخ بدلتی مڑتی ہیں۔ تعداد میں بیس کے لگ بھگ ہوں گی۔ جب یہ اختتام کو پہنچتی ہیں۔ آخری سیرجی آتی ہے تو بنگالی بابا بھی آ جاتا ہے۔

تو ند پھیلائے۔ اُس پر سکڑتی بنیان تھپکتا۔ اپنی سفید ریش سنوارتا۔ ڈھلکتے ہوئے تہبند کو سنبھالتا

بنگالی بابا نور اللہ آ جاتا ہے۔

جبل نور۔ ایک نور اللہ براہمان ہے جو بنگال کا ہے۔

زار کو بے شک دن کی دھوپ میں سیر جیوں سے اترنا دیکھتا تھا تو ایک رو بوت کی مانند نارنج آن کرنا اپنی نشست سے ذرا آگے ہو کر قدرے جھک کر سرنگ میں روشنی بھیجتا تھا تاکہ زار کو آسانی ہو اور وہ سرنگ میں راستہ دیکھ سکے اور پار چلا جائے۔ اگرچہ نارنج کی روشنی بہت دور تک نہیں جاتی تھی نہ قہقہہ کے بعد دم توڑ جاتی تھی۔ اور یہ بھی نہیں کہ وہ زار اس راستہ دکھانے والے بنگالی بدھا کو تھینک یو ہا یا کی کمر ایک مسکراہٹ پر ٹر خا کر اندر چلا جائے۔ پہلے پہل مجھے بھی یہی گمان ہوا کہ کیسی اعلیٰ اور ارفع روح ہے یقیناً کوئی پوشیدہ ولی ہے کہ برسوں سے یہاں اس چھتر سے براجمان نہیں سوتا جاگتا زندگی کرتا ہے محض اس لیے کہ خلق خدا کو حضور کی پتھریلی اور محبوب آماجگاہ تک پہنچنے میں آسانی ہو تو یہ کیسا پتھرا ہوا بزرگ ہے۔

میں اُس کی بے لوث خدمت سے از حد متاثر ہوا کہ یہ اپنا وطن ہال بچے تیاگ کر یہاں آ کر بیٹھا ہے۔ ایک نہایت وقت والی مشکل زندگی گزار رہا ہے۔ اگرچہ وہ ایک عمدہ شاید نیک دل بھی ہو۔ سا بوزھا تھا لیکن وہ ایک واجبی تھینک یو یا سرسری مسکراہٹ پر ہی ٹر خا دیا جانے والا بوڑھا نہیں تھا۔ وہ زبردستی تو نہیں کرتا تھا لیکن اپنی بدنی زبان اور اشاروں کنایوں سے یہ واضح کر دیتا تھا کہ اس سہولت کے لیے جو وہ ایک نارنج روشن کر کے مہیا کرتا تھا زار صدقے کے طور پر کچھ نہ کچھ تو نذر کرے۔ اس بلندی پر نارنج کے سیل آسانی سے نہیں ملتے۔ ویسے میں اُسے دوش نہیں دے سکتا تھا۔ محض عقیدت پر گزارا کرنا ہو سکتا۔ اور اگر زیارت کے آس پاس قیام طویل ہو جائے تو عقیدت مدھم پڑ جاتی ہے اور دل رولی کا حصول زیادہ اہمیت اختیار کر جاتا ہے۔ بہر طور وہ ایک دھیمہ اور کسی حد تک سادہ انسان لگتا تھا۔

ہم تینوں بہت دیر چپ بیٹھے رہے۔ وادی مکہ سے اٹھنے والی روشنیاں بجھتی بجھتی اپنی جگہ پہنچ جاتیں اور کے اس کھائی پر معلق چھتر تک پہنچنے تک کھودیتی تھیں اور ایک ہلکی لودینے لگتی تھیں جو ہمارے چہرے عیاں کرنے کے لیے کافی تھی۔

”کار میں نہیں جائے گا۔“ بابا بنگالی نے مجھے اپنے واحد فرنیچر یعنی لکڑی کے بیچ پر براہِ راست بیکار اور چپ بیٹھے دیکھ کر پوچھا۔

UrduPhoto.com

”ہاں گار میں بابا۔“

UrduPhoto.com

”جائے گا بابا۔ کیوں نہیں جائے گا۔ اسی لیے تو اوپر آیا ہے۔“

UrduPhoto.com

”بابا! ابھی اندر کوئی ہے؟“

”ہاں۔ دو تین ایرانی لوگ ابھی گیا ہے۔ بہت جگہ ہے۔ جاؤ۔“

بابا نے تو ”جاؤ“ کہہ دیا لیکن میں جا نہیں سکتا تھا۔

میں تب اس گھناٹو پاندھیرے والی تنگ سرنگ کے اندر اب بھی نہیں جا سکتا تھا۔

”اگر میں ادھر سے اوپر جا کر صحن میں اتر جاؤں تو ٹھیک ہے۔“

”نہیں صاحب۔“ نیاز بولا ”ایک تو پتھروں پر اس ٹیم چڑھنا خطرناک ہے۔ دوسری جانب

لو کھائی ہے ادھر دھلوان بہت ہے وہاں پھسل جائے گا۔ پتھر غار کی چھت سے نیچے صحن میں بھی آسانی سے گرنے لگا۔ آپ سرنگ کے راستے کیوں نہیں جاتے۔“

”مجھے ڈر لگتا ہے یار۔“

”میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔“ اور میں یہی چاہتا تھا۔

”ٹھیک ہے۔ لیکن میرے ساتھ رہنا۔“

بابا بنگالی نے فوراً ذرا آگے ہو کر نارنج آن کی ”چلو ہم لائٹ کرتا ہے۔“

”نہیں بابا“ میں نے امانت کی خرید کردہ اپنی مختصر سی نارنج جلا کر کہا ”میرے پاس نارنج

ہے۔“

”چھوٹا ہے۔“ اُنے ناگواری سے کہا اور اپنی نارنج بجھا دی۔

واقعی میری نارنج.. چھوٹا تھا۔ عین سامنے جو دو ایک پتھر تھے انہیں تو واضح کرتی تھی لیکن اُن

کے پار جانے سے قاصر تھی۔

میں اب بھی حیران ہوتا ہوں کہ اُس تنگ سرنگ میں سے عام دنوں کی بھیڑ میں جو درجنوں

لوگ آتے اور عورتیں ہوتی ہیں وہ کیسے اس میں سے گزرتے ہیں۔ یہ کوئی ایسی باقاعدہ سرنگ نہ تھی جس کا

ایک طرف لڑائی ہوئی ہے بلکہ لاکھوں برس پیشتر کسی جغرافیائی تبدیلی کے نتیجے میں شاید کسی

لڑنے والے کی وجہ سے بڑے بڑے پتھر اور چٹانیں گریں اس انداز میں کہ اُن میں ایک راستہ بن

گیا۔ سرنگ کے اندر چند چٹانوں کی مہیب رکاوٹ تھی۔ یا تو ان کے درمیان میں سے سکر کر گزرنا جا سکتا

تھا یا انہیں ٹانہ پڑتا تھا۔ ان پر چڑھ کر دوسری جانب اترنا ہوتا تھا۔ اور یہ بھی دھیان رکھنا ہے کہ اوپر جو پتھر

لگے ہوئے ہیں اُن سے سر نہ ٹکرائے۔ اور چٹانوں کی رکاوٹ کے باعث سامنے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ اور وہ

لوگ سرنگ کے آخر میں روشنی والا اگرچہ ہی محاورہ ہے وہ یہاں کا کارہ ہو جاتا تھا۔

میں تو اس سرنگ میں داخل ہی شب کی سیاہی کے سے ہوا تھا لیکن یہاں ان کو بھی تلوک چند

محروم کی آخری آرام گاہ نور جہاں کے مصداق شب کی سیاہی کا سماں ہوتا تھا۔ تاریکی ہوتی تھی۔ تو وہ لاکھوں لوگ کیسے شاندار حوصلے والے تھے جو اس سرنگ کے باہر مجھ ایسے ٹھنڈے کی مانند سمجھتے نہ تھے بے دھڑک اس میں داخل ہو جاتے تھے۔

یہ سرنگ اتنی طویل نہیں جتنا میرا بیان ہو چلا ہے۔ کوئی فیتہ وغیرہ تو ساتھ لے کر نہیں گیا تھا اگرچہ لانا چاہیے تھا کہ ناپ کر اس کی صحیح لمبائی بیان کر سکتا۔ میرا خیال ہے کہ بابا بنگالی کے پتھر سے جو اس کا دہانہ تھا وہاں سے غار حرا کے صحن تک یہ کوئی پانچ چھ میٹر سے زیادہ طوالت کی نہ تھی۔

نیاز میرے آگے تھا۔ اگرچہ نارنج میرے ہاتھ میں تھی لیکن نیاز اس کی روشنی کا محتاج نہ تھا کہ وہ تو مقامی ہاشمہ تھا۔ دن رات آتا جاتا رہتا تھا۔ ایک ایک پتھر سے واقف تھا۔ آنکھیں بند کر کے بھی اس میں سے گزرا سکتا تھا۔

اور میں دور کے شہروں سے آیا تھا۔ ناواقف تھا۔ پہلی بار اس سرنگ میں داخل ہوا تھا۔ ایک چٹان تو ایسی تھی کہ سرنگ کی دیوار اور اس کے درمیان گزر جانے کی جگہ بہت تھی۔ پھر ایک اور تقریباً چھت کو چھوٹی چٹان حائل ہوئی اور یہ آخری چٹان تھی۔ اس پر چڑھ کر دوسری طرف اترنا میرے لیے تو ممکن نہ تھا تو اسے عبور کرنے کے لیے آپ دائیں جانب سرنگ کی دیوار اور اس چٹان کے درمیان جو بہت تنگ سی جگہ ہے اُس مختصر خلا میں سے اپنا پیٹ سکیڑ کر سانس روک کر ہی گزر سکتے ہیں۔

نیاز تو گزر گیا۔ اور میں پھنس گیا۔

جب میں نے اپنا سانس اور پیٹ خوب سکیڑ کر اس خلا میں سے پار ہونے کی سعی کی تو ان چٹانی قریبوں نے مجھے اپنے کلاوے میں جکڑ لیا جیسے ایک ناقواں پہلوان کو گاگا پہلوان اپنے ہاتھ میں جکڑ لیتا تھا کہ بچا اب کہاں جائے گا۔ جو اس حالت میں بھجوری میں۔ بچہ نے۔ یعنی میں نے۔ اپنے حلق سے ایک گھکھائی ہوئی آواز برآمد کی۔

جیسے دادی شیشال کو چاہئے ہوئے ایک جہالت پر خطر بھر بھری رہتی آسمان سے گرتی کہ الی میں بہتے نہ نظر آنے والے دریا میں جا گرتی اطلالوں پر میں ہاتھ سامنے دیکھتا دیکھتا کہ قدم تو چلا گیا تھا۔ جب سب کو یہی خیال تھا کہ وہ کونسا کونسا کونسا ہے۔

مسائلوں کے آخر میں نظر آیا بھی اور اوجھل بھی ہوا تو میرے پاؤں چٹکی کے پاٹ ہو گئے۔ بھٹم گئے۔ میں اپنے خوف کے زخمے میں آیا کہ وہیں بہت بن گیا اور میں نے اپنے گائیڈ رجب شاہ کو جو آگے آگے ایک ٹھہرے مہار کی مانند مست چلا جاتا تھا پکارا۔ اور کس انداز میں پکارا۔ کہ را۔ را۔ راج۔ راج۔ رجب۔

تو یہاں بھی۔ اس سرنگ میں جیسے میرا چھوٹا نارنج کچھ کچھ دکھاتا تھا۔ جہاں اپنے آقا یا جایا کرتے تھے اور یقیناً نہایت ستواں۔ نہایت فٹ اور چھیتے کے پیٹ والے ہوں گے جو ادھر سے آسانی سے گزر جایا کرتے تھے۔ اور میں وہاں پھنس گیا تھا۔ اور اپنے حلق سے ایک گھکھائی ہوئی آواز برآمد کرتا۔ اسی شمشالی انداز میں پکارتا تھا۔ ان۔ ان۔ نیا۔ نیا۔

وہ پار ہو چکا تھا۔ مجھے دیکھ نہ سکتا تھا کہ میں کہاں ہوں۔ ”کیا ہے تارڑ صاحب؟“
”یار میں ادھر پھنس گیا ہوں۔ میری تو دم مزید پیچھے ہونے سے انکاری ہے۔“
وہ بندہ خدا۔ یا بندہ غار حرا۔ پھر سے واپس آ گیا۔ ”آپ ادھر سے پیچھے ہو جاؤ۔“
میں پیچھے ہو گیا۔

اس چٹان کا ایک حصہ تو وہ تھا جہاں ایک مختصر خلا تھا جس میں میں پھنس گیا تھا اور دوسری جانب یہ چٹان سرنگ کی دیوار کے ساتھ جڑی ہوئی تھی۔ اس لیے اس کے پار جانے کے لیے نیاز نے مجھے سہارا دیا اور ایک پتھر پر چڑھا کر دوسری جانب اتار لیا۔

اور میں بہت ہی مشکل سے اس پتھر پر چڑھا اور دوسری جانب اُترا۔ یہاں غار کے آخر میں روشنی ہونے کا محاورہ بیکار نہ ہوا۔ روشن ہو گیا۔ دوسری جانب سرنگ کے اختتام پر ایک ہلکی ملائم روشنی ظاہر ہو رہی تھی۔ جیسے سویر ہونے کو اور دو چار قدموں کے بعد میں اس سویر میں آ گیا۔ اور جب میں اس سویر میں آیا تو گویا آج تک کائنات بھر میں جتنی بھی سویریں آ چکی تھیں ان سب میں سے ممتاز ایک ایسی انوکھی سویر میں آیا کہ میرا اگلا قدم ایک صحن میں تھا۔ جو کہ غار حرا کا صحن تھا۔

یہ ہی صحن تھا۔ غار کے آگے ایک چھوٹی سی صوبار جگہ ہوا کرتی تھی۔ سرنگ میں سے نکلنے ہی سامنے آتی تھی۔ دائیں جانب چٹانیں اٹھتی ہوئی پہلی کی پہلی تک پہنچتی تھیں یعنی تین صوباروں میں گھری ہوئی تھی۔ سرنگ کے آگے غار کے سامنے اور چٹان کی اٹھ میں اور جو چھٹی جانب تھی وہ کھلی تھی اور ادھر سے

اولیٰ ایک شکریں میں تھیں۔

صحن کے اس رخ پر جدھر صلاح الدین ایوبی کا مزار ہے مسجد کی دیوار سے پرے شہر دمشق کے ایک گوشے میں اس رخ پر وہ مقام ہے جہاں کربلا کے بعد یزید نے دربار لگایا تھا اور وہ مقام تھا جہاں حسین کا پریدہ سر رکھا گیا تھا۔

گھر یلو صحن بھی ہوتے تھے جب لوگ کم ہوتے تھے اور خدا کی زمین زیادہ۔

ایک اور میرے من کو لگنے والا صحن نیکسلا میں جولیاں کی خانقاہ کا ہے۔

اور ان سے الگ ایک ایسا صحن جو کہیں نہیں اور پھر بھی ہر حساس انسان کے اندر ہے۔
”مشرق آتش کا صحن جو ”ویہڑے“ کہلاتا ہے۔

”کدی آؤ ویہڑے دے۔ میں لک ٹھپ نیر بہاواں۔“

اس ویہڑے میں شاہ حسین مست ہوئے۔ ہمسے شاہ ناچے۔ اور رانی کے ویہڑے میں

خواجہ فرید پر حال آئے۔

یوں بہت سے صحن ہیں جن کا بیان ہو سکتا ہے اور بہت سے ”ویہڑے“ ہیں جو راہنصحن کے

گیا۔

لیکن۔

غار حرا کے آگے جو چھوٹا سا صحن ہے۔ جس ”ویہڑے“ میں سب کے راہنصحن آیا کرتے تھے

ان تمام صحنوں اور ویہڑوں کی ماں ہے۔

کیسے؟

ایسے کہ کیا میری نانی جان۔ میرے آبائی گھر۔ مسجد قرطبہ۔ مسجد امیہ۔ جولیاں کی خانقاہ اور ہمسے شاہ حسین اور خواجہ فرید کے ”ویہڑے“ ہو سکتے تھے اگر یہ ایک ویہڑہ نہ ہوتا۔ یہ نہ ہوتا تو کچھ بھی نہ ہوتا۔ اور اس ویہڑے کے تو جبرئیل بھی شکر گزار ہوئے ہوں گے کہ راہنصحن یہاں نہ آتا تو وہ کیسے یہاں اپنا جلوہ دکھاتے۔ جمال یار نے اس صحن کو روشن کیا تو جبرئیل کو راستہ دکھائی دیا۔

اور میں۔ اسی صحن میں اسی ویہڑے میں داخل ہوتا تھا۔

داخل ہو چکا تھا اور شام بھی ہو چکی تھی۔ تاریکی ہو چکی تھی۔

میں تنہا نہ تھا۔ دو چار ایرانی زائرین بھی تھے۔ لیکن ان سے کچھ سلام دعا نہ ہوئی وہ جلد از جلد

غار میں نکل ادا کر کے واپس جانے کی فکر میں تھے۔

مجھے چند اہل جلدی نہ تھی۔

جھانکنے تو کھائی گرتی دکھائی تھی۔

ہوتا یہ تھا کہ اکثر سرنگ میں سے زائرین کا ریلہ آتا۔ اس مختصر جگہ پر پہلے سے کچھ لوگ موجود ہوتے اور یہ ریلہ بے اختیار انہیں دھکیلتا تو وہ بے بس ہو کر کنارے تک دھکیلے جاتے جس کے آگے کھائی گرتی تھی اور یوں شاید کچھ حادثات بھی رونما ہوئے چنانچہ زائرین کی حفاظت کے لیے یہاں چند برس پیشتر ایک چار پانچ فٹ کی پتھریلی دیوار تعمیر کر دی گئی اور یہ چھوٹا سا صحن وجود میں آ گیا۔

شاید آٹھ فٹ X چھ فٹ کا۔

وہی مختصر صحن جسے میں نے اور نمبر نے غار کی چھت پر بیٹھے زائرین سے بھرا ہوا دیکھا تھا۔

میں نے اپنی حیات میں اگرچہ ہر شخص کی مانند بہت سے صحن دیکھے تھے لیکن ان میں سے کچھ ایسے ہیں جو میری نفسیات اور تخلیقی سوچ کا ایک حصہ بن چکے ہیں۔

اپنی نانی جان، حاجن فاطمہ۔ بے بے جی کا صحن۔ جس کے ایک کونے میں دھریک کا ایک درخت تھا۔ اتنے پتے گرتے کہ ماچھن خورشیداں کے لیے وبال جان ہو جاتے۔ وہ دن میں دو مرتبہ صحن میں جہاز دھیرتی تو بھی ہر جانب زرد پتے سرکتے رہتے۔ دوسرے کونے میں کوٹھے پر جانے والی ہانگی میز حیاں تھیں جن کے تلے سلگتے ایلوں پر دھری چائی میں دھیرے دھیرے گرم ہوتے دودھ کی سطح پر خزاں رنگ پتوں ایسے تانبے رنگ کی بالائی کی تہہ اتنی گھنی ہوتی کہ انگلی چھو کر اس میں چھید کرنا مشکل ہو جاتا۔

ایک صحن مسجد قرطبہ کا تھا۔ جسے صحن نارنجستان کہتے ہیں کہ وہاں نارنگیوں کے پتے جموتے ہیں اور اس پر سایہ کرتا وہ مینار۔ تیرا منار بلند جلوہ گہ جبرئیل۔

اور میں وہ سرنگ پار کر کے جس صحن میں داخل ہوا تھا یہی تو جلوہ گہ جبرئیل تھا۔ مسجد قرطبہ کے صحن پر فوقیت رکھتا تھا۔

ایک اور صحن جو میرے بدن میں آباد ہے میرے آبائی گھر کا ہے جس کے ایک کونے میں کسی زمانے میں بیری کا ایک تناور درخت ہوا کرتا تھا۔ اور میری دادی جان نے یہ خبر پانے کے بعد کہ ان کے اکلوتے بیٹے کے ہاں اولاد متوقع ہے تو انہوں نے ایک شب خواب میں دیکھا کہ صحن کی بیری کی ہر شاخ پر دیئے جل رہے ہیں۔ اور وہ اگلی سویر بھائی بھائی مولوی نور دین کے پاس گئیں کہ یہ کیسا خواب ہے۔ تو انہوں نے کہا تھا کہ بی بی تیرے ہاں ایک پوتا ہو گا اور اس کے دیئے جلیں گے روشنی کرے گا۔

مسجد امیہ کا بھی ایک صحن تھا۔

مسجد امیہ کے اندر جبرئیل کی علیہ السلام کے پہنچنے کی خبر ہونے کی تاریخوں سے جکاری

میں بے فکر تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ ایرانی کچھ پڑھتے ہوئے سرنگ میں داخل ہوئے اور اُس کے اندر میرے میں تحلیل ہو گئے۔ ہم دونوں اُس صحن میں تنہا باقی رہ گئے۔ میں اور نیاز۔

ہم تنہا ہوئے تو جبل نور کی چٹانوں میں سے جو آسمان جھکتا تھا جس میں ابھی کچھ دیر بعد دسویں کے چاند نے نمودار ہونا تھا کہ یہ ماہ کے چاند کی دسویں تاریخ تھی جب میں اُس صحن میں داخل ہوا تھا۔ تو اُس آسمان سے ایک عجیب سی بے سرو ساماں دہشت اُتری اور میرے قلب کے گرد سیاہ چالے بنے لگی کہ کہیں نیاز مجھے یہاں تنہا چھوڑ کر نہ چلا جائے۔

مجھ میں کچھ تاب نہ تھی اس جبل کی گھاٹی کی گود میں پوشیدہ اس صحن میں تنہا رہنے کی میں یہاں اس مقام پر اکیلا نہیں رہ سکتا تھا۔ جی نہیں سکتا تھا۔ مجھے اتنا خوف آیا یہاں کی تنہائی سے۔

”صاحب۔“ نیاز ایک جانب لاقطع کھڑا تھا۔ اُسے اس مقام میں کچھ زیادہ دلچسپی نہ تھی اور وہ اُس کے اندر کوئی ڈر تھا کہ وہ جانے کب سے جبل نور کا پاسی تھا۔ ”آپ نفل ادا کر لو۔ غار خالی ہے۔“

میں نے ابھی تک غار کی جانب نظر بھر کر نہ دیکھا تھا۔ جان بوجھ کر غافل سارہا تھا۔ مجھے تاریکی میں ایک کھوہ سی نظر آئی اور اُس کے فرش پر سفیدی سی نظر آئی جو سنگ مرمر کی تھیں۔

غار حرا دراصل لغوی معنوں میں ایک غار نہیں ہے۔

غار میں تو ایک خاص ہیئت ایک مخصوص شکل رکھتی ہیں اور مدتوں سے غاروں کے طور پر پہچانی جاتی ہیں۔ جیسے موہرا مراد کی خانقاہ کے کھنڈروں کے عین اوپر پہاڑوں میں ٹیکسلا کی وادی میں ایک واضح غار ہے جس میں ہزاروں چکاوڑیں قیام کرتی ہیں اور وہ غار جانے کہاں اختتام پذیر ہوتی ہے۔ یا فرانس اور چین کی غاریں ہیں جن میں قدیم عہد کے انسان کے مضوری کے نمونے محفوظ ہیں۔

اصحاب کہف کی غار تھی۔

یہ غار ویسی نہ تھی۔

پچھلے زمانوں میں۔ شاید لاکھوں برس پہلے کے زمانوں میں کسی ذلزلے کے نتیجے میں کسی قدرتی آفت کے نفل پھسل کے باعث۔ جیسے یہاں تک آنے والی سرنگ وجود میں آئی تھی تقریباً ایسے چند بہت بڑی بڑی چٹانیں گود میں۔ انہوں نے مقام چھوڑا اور جب وہ ساکت ہوئیں تو ان کے درمیان میں کچھ تک بن گئی۔ ایک کھوہ ہوئی۔ آگئی۔ بہا۔ تھی۔ سے۔ اندر سے۔ سیدھے۔ پڑے۔ پھروں اور۔

چٹانوں میں ایک خلا سا پیدا ہوا۔ چنانچہ حرا کی پہاڑی کی ڈھلوان پر اس کھوہ نے جنم لیا۔ جیسے ایک باقاعدہ غار بن گئی کہا جاسکتا۔

اس کے اندر اتھاہ تاریکی تھی۔

میں اس میں۔ اس کھوہ میں قدرے جھک کر احتیاط سے اندر داخل ہوا کہ جو پتھر اسے ڈھکتا تھا وہ ابھی جھکا ہوا تھا اور اُس کے ساتھ سر ٹکرا سکتا تھا۔

فرش کے کچھ حصے پر سنگ مرمر کی معمولی رسلین نصب تھیں جو تاریکی میں سفید نظر آتی تھیں اور ان پر ایک بوسیدہ مصلیٰ بچھا تھا جو لاکھوں نہیں تو ہزاروں نفل پرست افراد کے گھٹنوں اور سجدوں سے بوسیدہ ہوا تھا۔

میں نے اپنے تہتی رُک سیک میں سے وہ مصلیٰ نکالا جو میری بہو رابعہ نے مجھے عطا کیا تھا اور وہ اسے بہت عزیز اس لیے رکھتی تھی کہ اُس کے والد نے خانہ کعبہ میں بہت ساری راتیں اسی مصلیٰ پر عبادت میں گزاری تھیں۔ اس کی کلر سکیم میں نیلا ہٹ کے مختلف شید ہیں۔ گہرے سمندر نیلے سے آسمانی نیلا ہٹ اور پھر نفل کھلے نیلے تک سب پر تو ہیں۔ اور دونوں جانب سرو کے درختوں کی شاہتیں بلند ہوتی ہیں۔

میں نے اس جائے نماز کو غار حرا کے فرش پر پہلے سے بچھے بوسیدہ مصلیٰ پر بچھایا اور۔ منہ و لہجہ شریف۔ اور اسے اتفاق کہیے یا مشیت کہ کعبہ غار میں کھڑے شخص کے عین سامنے کے رخ پر ہے۔ یہاں یا بائیں جانب بھی ہو سکتا تھا۔ پشت پر بھی ہو سکتا تھا۔ لیکن نہیں ہے۔ سامنے جہاں غار کی تاریکی آگتی ہے اُس جانب ہے۔ میں اقرار کروں کہ نفل ادا کرتے ہوئے غرق نہ ہوا۔ مگر نہ ہوا بلکہ مصلیٰ پر ہونے کے مقام پر نظر رکھنے کی بجائے اس نظر کو بار بار بھونکا کر سامنے غار کے آخر کو غور سے دیکھتا رہا۔ وہاں ایک چھوٹی سی دروازہ تھی جس میں سے رات کی سیاہی میں کچھ روشنیاں تو دکھائی دیتی تھیں لیکن جیسا کہ روایت میں چلا آیا ہے خانہ کعبہ دکھائی نہ دیتا تھا۔ یہ عین ممکن ہے کہ تب دکھائی دیتا ہو اور چودہ سو برس کے دوران چٹانوں اور پتھروں کے کسی قدرتی تغیر کے باعث کھسکنے سے اب وہ دکھائی نہ دیتا ہو۔

نفل ادا کرتے ہوئے مسلسل مسکراہٹ میں تھا۔

نفل نہ تھا مسکرا رہا تھا۔

کیوں؟

اس لیے کہ کہاں وہ امام تھے۔ حج کے دن تھے جب میں اس غار کی صحت پر بیٹھا اُن ہی صحت کی نظر کر رہا تھا مگر میں بھرے پائے تھے اور اُس ایک قدم سے صحت نہ کرنا آتا تھا جو غار کے

گھڑا ہوں۔ جہاں جبریل امیں آتے تھے۔ تو میں کیسے ایک رات یہاں ”سبہ“ سکوں گا۔ میں ایک ارچک فٹس ہوں۔ مجھ میں نہ وہ وابستگی ہے اور نہ اُجالا جس کی روشنی میں مجھے یہاں سب کچھ دکھائی دیتا تھا۔ میں تو اندھیروں میں بھٹکنے والا تھا مجھے یہاں کچھ دکھائی نہ دے گا۔ یہ میرے بس کی بات نہ تھی۔ میں کسی مقام پر۔ بے شک ویران ہوتا رہی میں جا چکا ہو وہاں تھوڑے بہت ڈر اور خدشے کے ساتھ رات گزار سکتا تھا لیکن کسی مقام پر۔ اس مقام پر نہیں۔ یہاں تو میرے ساتھ جانے کیا ہو جائے۔ میرا تو کلیجہ پست ہائے رعب اور دہشت سے۔ چنانچہ میں نے فیصلہ کیا کہ آرزو پوری ہوگی۔ اطمینان سے کچھ وقت غار حرا میں گزارا تو بہتر یہی ہوگا کہ رات گزارنے کا ارادہ ترک کر کے یہاں سے نکل جاؤں۔ تاریکی کی وجہ سے میں کسی نہ کسی طرح ایک ڈیڑھ گھنٹے میں نیچے پہنچ جاؤں گا بلکہ نیاز سے درخواست کروں گا کہ وہ اُسی مہرے ساتھ چلے میرا ہاتھ تھام کر دامن تک پہنچنے میں مددگار ثابت ہو۔ اور ایک مرتبہ نیچے پہنچ جاتا ہوں تو وہاں سے فیکسی کا حصول دشوار نہ ہوگا اور میں مزید ایک گھنٹے کی مسافت کے بعد جدہ پہنچ جاؤں گا۔ اپنے گھر میں۔ جہاں چکن نوڈل کا ڈنر میمونہ رابعا اور سلجوق میرے منتظر ہیں۔

انسان بھی کیسا خود غرض ہوتا ہے کہ حضور کے گھر میں رات بسر کرنے کی بجائے اپنے گھر کو لوٹ دیتا ہے۔

چنانچہ میں نے فیصلہ کر لیا۔ جو گزر پھرن لے۔ مصلے سمیٹ کر پھر سے رُک سیک میں رکھ لیا اور وہاں کے کچھ گھونٹ حلق میں سے اُتار کر صحن میں آ کر اُس کی دیوار کے ساتھ لگ کر جبل نور کے دوسری جانب جو وادیاں اندھیرے میں اُتری ہوئی تھیں۔ اور جہاں اب روشنیاں بڑھتی جاتی تھیں انہیں دیکھنے لگا۔ سامنے جو پہاڑ تھے وہ تاریکی میں زندہ لگتے تھے۔ سانس لیتے ہوئے اور قریب آتے ہوئے محسوس ہونے لگے جیسے غار حرا کے ساتھ اُن کا انسیت کا رشتہ ہو۔ وہ مدتوں سے آشنا ہوں۔ حضور جب غار سے نکل کر یقیناً اسی صحن میں آتے تھے اور ان زمانوں میں اس کی دیوار نہ تھی تو انہوں نے یقیناً یہیں گھڑے ہو کر سامنے انہی پہاڑوں پر ایک ”فٹس“ کو آسمان تک بلند ہوتے دیکھا تھا اور وہ گھبرا کر اپنا اس بات پر لگے تھے تو وہ ”فٹس“ وہیں نظر آنے لگتا تھا۔ اور ورقہ بن نوفل تھے جنہوں نے حضور کی پریشانی دور کی اور بتایا کہ وہ فٹس جبریل تھے۔ اگر یہاں غار حرا نہ ہوتا۔ میرے سامنے صرف یہ پہاڑ ہوتے تب اُسی جگہ سے نہ ہوتی کہ اُن کے سامنے ایک رات بسر کروں۔

منظر صحن میں بہت تاریکی تھی

اہل نور کا وہ رخ جو وادی کعبہ کی جانب تھا اور جدہ صحرانہ کی باہر اُجالا تھا۔ وہ تو وادی میں رہا۔ اُستوں کے ظلیل بلبل کی روشنی میں نہا ہوا تھا۔ چہروں اور چہروں کی پہچان ہو جاتی تھی لیکن ادھر۔

اندر ہاتھ باندھے کھڑا ہوتا تھا اور کہاں یہ شب تھی کہ میں تنہا تھا انجمن میں۔ اور صحن میں صرف نیاز تھا اور اپنی لائق اور خاموشی کی بنا پر نہ ہونے کے برابر تھا اور میں کیسے اطمینان اور سکون سے غار حرا میں اُسی پڑھ رہا تھا۔ اور نہ ہی کوئی اپنی باری کے لیے بے چین منتظر مجھے دھکیلتا تھا۔ بس میں تھا۔

شاید مجھ سے یہ توقع وابستہ کر لی جائے کہ اب میں اُس الٰہی کیفیت کو بیان کروں گا جو مجھ کے مقام اقراء میں جو میرے حضور کا بسیرا تھا۔ آس پاس کے پتھروں میں اُن کے لمس کی حدت تھی وہاں اُن پر طاری ہوئی۔ ایسا ہرگز نہ ہوا اس لیے میں کیسے بیان کروں۔ میں نے وہ دو نفل مسکراتے ہوئے اور پر مسرت کیفیت میں ایسے ادا کیے جیسے میں سنولیک پر ہوں۔ کرومیر جھیل کے کنارے ہوں۔ فٹری میڈ کے جنگل میں ہوں جہاں صرف خوبصورتی ہے اور میں اس خوبصورتی کے سامنے سر جھکا کر اُس کا شکر ادا کرتا ہوں جس نے اُسے میرے لیے تخلیق کیا ہے۔

نہ خیال تھا کسی ثواب کا نہ آخرت میں لیے جانے والے حساب کا۔

بے شک اس میں بہت مبالغہ ہے کہ۔ وہ شمع جس نے اُجالا کیا چالیس برس تک غار حرا میں۔ کہ غار ایک ہی تھی جو یہ غار تھی۔ اور دو چار برس چالیس برس تو ہرگز نہیں۔ شاعر ردیف قالیچ کی قیام میں مجبور حقائق سے۔ تجاوز کر جاتا ہے لیکن نثر نگار کو یہ سہولت حاصل نہیں ہوتی اُس نے تو وہی بیان کرنا ہوتا ہے جو حقیقت اور مشاہدے پر مبنی ہوتا ہے۔ اُس کا انداز بیاں شاعر کی مانند شوخ نہیں ہوتا لیکن دل پر اثر کرنے کی سچائی سے لبریز ہوتا ہے۔

تو میں اُس غار میں تھا جسے ایک شمع نے اُجالا تھا۔

میں شعوری طور پر کوئی بھی کیفیت اپنے آپ پر طاری نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اپنے آپ کو آمادہ نہیں کرنا چاہتا تھا کہ میں۔ کہاں ہوں۔ جو کچھ ہوتا ہے خود ہوا اس میں میرا کچھ عمل دخل نہ ہو۔ جب سلام پھیر کر اٹھا اور مرکز دیکھا تو نیاز کے سوا صحن میں اب بھی کوئی نہ تھا میں نے پھر سے ہاتھ باندھے لیے۔

مزید نوافل کے بعد میں مصلے سمیٹنے کو تھا کہ پھر کچھ خیال آیا پیچھے دیکھا تو صحن ابھی تک ویران۔ کوئی بھی میرے غار سے نکلنے کا منتظر نہ تھا۔ میں نے پھر سے نیت کر لی۔ یعنی جب تک سورج چمکتا ہے اتنی دیر تو اپنی نگاہیں کھلا کر۔

میں اگرچہ ایک حالت سکون میں تھا۔ گھرے اطمینان میں تھا اور مسکراہٹ ابھی تک میرے لبوں سے رخصت نہ ہوئی تھی لیکن یہ سب کچھ غرضی ثابت ہوا۔ یکدم مجھے اس ویران اور تاریک پناہی آمادہ کے اندر پوری رات بسر کرنے کے خیال سے دہشت ہونے لگی۔ میں پھر سے خوف کا شکار ہونے لگا۔ اور پھر مجھے اندھیرے میں گزارنے کا کہ اس مقام پر۔ جہاں حضور کھڑے ہوا کرتے تھے میں

”ٹھیک ہے صاحب۔“ وہ پھر چٹان کے ساتھ ٹیک لگا کر اُس کا ایک حصہ بن گیا۔
 جو نبی نیاز نے مجھے نیچے لے جانے پر رضامندی کا اظہار کیا میں ایک عجیب افسردگی میں چلا
 گیا۔ ابھی چند لمبے جھڑپوں میں اپنی آرزو کی تکمیل پر مسکراتا خوش تھا۔ اور ابھی ایسا آرزو ہوا جیسے اس
 جہان میں میرا کوئی نہ ہو۔ ایسی آرزو کی میں جتنا ہو گیا۔

جیسے فیضی میڈو کے جنگل میں کھلنے والے سڑاہیری کے پہلے سفید پھول کو دیکھتے آپ نہیں
 تھکتے اور اُس سے پھڑپھڑا نہیں چاہتے۔

جیسے سنولیک کی رات میں اُس پر سفید فوس تیرتے ہیں تو آپ نے اس منظر سے جانا ہوتا ہے
 لیکن جانا نہیں چاہتے۔

”نیاز آپ تو برسوں سے ادھر ہو، تو یہاں غار حرا میں لوگ پوری رات بھی بسر کرتے
 ہیں؟“ میں نے نہایت لائقیت سے دریافت کیا۔

”نہیں صاحب۔ فجر کے وقت آ جاتے ہیں۔ کبھی مغرب تک ٹھہر کر چلے جاتے ہیں۔ کبھی ایسا
 بھی ہوتا ہے کہ ساری رات آنا جانا لگتا رہتا ہے لیکن ادھر رات بھر کے لیے کوئی نہیں ٹھہرتا۔ یہاں کیا
 کرے گا پوری رات ٹھہر کر۔“

”ہاں نیاز۔ نفل ادا کر لیے۔ زیارت کر لی۔ چند پتھروں کو چوم لیا تو پھر اس کے بعد یہاں
 رات بسر کرنے سے کیا فائدہ۔“ میں اپنے فیصلے کو خود ہی تقویت دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ ”تو یہاں آج
 تک۔۔۔ جب سے تم یہاں ہو کسی نے رات بسر نہیں کی؟“

”دو سوچ میں پڑ گیا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے تاریکی میں گم تھے اس لیے میں اُس
 کے پاس سے یہ اندازہ نہیں لگا رہا تھا کہ وہ سوچ میں ہے بلکہ اُس کی جانب سے جو خاموشی تھی وہ مجھے
 اطلاع کرتی تھی کہ وہ کچھ حساب کتاب میں مصروف ہے۔“

”ہاں۔۔۔ دو لوگ آئے تھے وہ یہاں ٹھہرے تھے۔“

”کہاں سے آئے تھے۔“

”پاکستان کے تھے۔ بہاولپور سے آئے تھے۔ وہ یہاں دو تین دن ٹھہرے تھے۔ دن کے
 وقت چمکے۔ یہاں بہت لوگ ہوتے ہیں اس لیے وہ ادھر پھرتے سوتے رہتے۔ اور رات کے نیم ادھر
 آ جاتے اور پوری رات عبادت میں گزارتے۔ کوئی چھ سات سال پہلے کی بات ہے۔ اُن کے بعد ادھر
 کوئی نہیں ٹھہرا۔“

”کیا میں۔۔۔ یہاں رات بسر کر سکتا ہوں؟“

جدھر غار حرا واقع تھی جبل کا یہ رخ پورے کا پورا تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔

یکدم خیال آیا کہ بھائی یہ تم کیا کر رہے ہو۔ بیکار کھڑے انگلیاں مٹھا کر رہے ہو۔ غار حرا خالی
 ہے اور تم اُس کی جانب پشت کیے لا پرواہی برتتے ادھر اُن پہاڑوں کو تکتے جاتے ہو جن پر جبریل آئے
 تھے اور جن کے لیے آئے تھے ان کے گھر سے غفلت برتتے ہو چنانچہ میں شرمندہ سا ہو کر پھر غار میں گیا
 اور اُسی بوسیدہ جائے نماز پر کھڑے ہو کر منہ دل کعبے شریف۔

غار کے آخر میں کہ یہ تنگ ہوتا چلا جاتا تھا جو شکاف تھا اُس میں سے دکھائی دینے والی
 روشنیوں میں اب زیادہ روشنی تھی کہ تاریکی کے بڑھنے سے اُن کی لوتیز ہو رہی تھی۔
 میرا تپتی تھیلیا گھن میں پڑا تھا۔

نیاز چٹان کے ساتھ ٹیک لگائے خاموش بیٹھا تھا۔

وہ کیوں میرا ساتھ دے رہا ہے۔ اُسے مجھ سے کیا ہمدردی ہو سکتی ہے۔ یہاں ہزاروں ہر
 روز آتے جاتے ہیں میں اُن میں سے ایک تھا۔ کیا اُسے مجھ سے کچھ غرض تھی۔ اُس نے یونہی تو اپنے
 آپ کو میرے لیے وقف نہیں کر دیا تھا۔ ایسے مقامات پر انسان کتنی دیر بے غرض رہ سکتا ہے۔ لیکن مجھے
 وہ غرض والا لگتا نہ تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ وہ بنیادی طور پر ایک ہمدرد اور ملنسار شخص ہے۔ اُس کے دل میں مجھ
 سے کچھ حاصل کرنے کا کچھ لالچ نہ تھا۔

”نیاز۔“

”جی صاحب۔“ وہ ذرا قریب ہو گیا۔

”چلیں؟“

”اگر ٹھہرنا ہے تو ابھی ٹھہرو۔ آپ کی مرضی ہے۔“

”نہیں چلنا چاہیے۔“

”تو چلیں۔“

”نیاز۔ کیا آپ مجھے نیچے تک لے جاؤ گے۔“ کہنا تو میں یہ چاہتا تھا کہ اگر آپ مجھے نیچے

تک لے جاؤ گے تو میری جیب میں کچھ ریال ہیں لیکن میں کہہ نہ سکا۔

”کیوں نہیں تارڑ صاحب۔ میں ساتھ چلوں گا آپ کے۔ اس نیم نیچے جانا ذرا مشکل ہے۔“

”ہم تو آئے جاتے رہے ہیں۔ یوں بھی ٹھوڑی دیر میں مجھے ویسے بھی نیچے جانا ہے کھانا کھانے کے

لیے۔ نکالی بابا کا بھی کھانا اور لانا ہے تو آپ کو بھی ساتھ لے جاؤں گا۔ چلیں۔“

”ابھی کچھ دیر ٹھہرے ہیں۔ پھر چلتے ہیں۔“

”نیچے نہیں جائیں گے؟“

”وہ تو جاؤں گا۔ یونہی پوچھ رہا ہوں کہ اگر میں ٹھہر جاؤں تو کوئی خطرہ تو نہیں۔ کوئی پابندی تو

نہیں؟“

”نہیں جی۔“

”پولیس وغیرہ تو تنگ نہیں کرتی؟“

”کبھی کبھی کرتی ہے صاحب۔ ادھر جو لوگ ہیں وہ تقریباً سب کے سب غیر قانونی ہیں تو

پولیس ہمارے کو پکڑنے کے لیے جب اوپر آتی ہے۔ اور اوپر آنا کوئی آسان تو نہیں تو کم ہی آتی

ہے۔ اگر آجائے تو ہمیں پہلے سے خبر ہو جاتی ہے تو ہم ادھر ادھر ہو جاتے ہیں۔ کچھ غار میں چھپ جاتے

ہیں۔“

”غار حرا میں؟“

”نہیں جی سب سے پہلے تو اسی کی تلاشی ہوتی ہے یہاں کون چھپ سکتا ہے۔ ادھر اسی جانب

جبل نور کی ڈھلوان میں ایک اور غار ہے جس کا صرف ہمیں پتہ ہے۔ وہاں!“

”یعنی کوئی خاص خطرہ نہیں۔ پابندی نہیں حکومت کی جانب سے۔ یعنی اگر میں جاؤں تو

رات یہاں بسر کر سکتا ہوں؟“

”آپ یہاں رہنا چاہتے ہو۔ نیچے نہیں جاؤ گے۔“

”نیچے جاؤں گا۔ لیکن یونہی معلومات حاصل کر رہا ہوں۔“

”تو رہ جاؤ۔ کوئی مسئلہ نہیں۔ لیکن یہاں کرو گے کیا۔ نفل پڑھ لیے ہیں تو رات رہ کر کیا

کرو گے۔“

نیاز جو ایک عرصے سے یہاں آتا جاتا تھا اس کے لیے یہ محض چند پتھر تھے۔

روزی کا وسیلہ تھے۔

اور ہاں غار حرا کو ڈھکتے۔ اس کو دیوار کرتے جو بڑے بڑے چار پانچ پتھر تھے ان سب

اقدیت دی گئی تھی۔ ان پر بہت بھدے انداز میں ”غار حرا“ پینٹ کیا گیا تھا۔ اتنے بڑے پینٹ سے کہ اگر

وہ پتھر بول سکتے تو ضرور احتجاج کرتے کہ ہم پر تم لوگوں نے کیا بیانی سرخ اور ہنر رنگ میں جو ہم سب

پتھر سے ہیں ہمیں آلودہ کیا ہے تو کیا تم نہیں جانتے کہ پینٹ سے تم نے ہمارے دو مسام بھی بھریے

ہیں جن میں ہم نے حضور کے سانس پر مسام بھی سنہال رکھے تھے۔ ہم پر جہاں جہاں ان کا لمس

مکھوالات عام نے اس لمس پر ہنس بکھریا۔ کھن ان کی اسیاں بہت تھیں اور تم نے ان کو مٹا دی۔ ملیا بہت

کر دیا۔ کیسے لوگ ہو۔ دن کے وقت تو یہ آلودگی بہت ڈکھ دیتی تھی۔ واضح اور عیاں ہوتی تھی البتہ رات

میں وہ تاریکی میں کم ہوتی تھی اور صرف پتھروں کے بیولے نظر آتے تھے۔

اگر نیاز یہ دریافت کرتا تھا کہ ان پتھروں میں رات رہ کر کرو گے کیا تو میں اسے مورد الزام

لوں ملہا سکتا تھا۔

وہ ایک مدت سے یہاں رہتا تھا۔

یہ پتھر اس جیسے لوگوں کا روزگار تھے۔

اور یوں بھی طویل قربت عقیدت کو ختم کر دیتی ہے۔

پر وہ اٹھ جائے تو جنوں کم ہو جاتا ہے۔

دوری ہی اس طلسم کو تخلیق کرتی ہے جس کا میں شکار تھا۔

تا آسودگی ہی عشق آتش کو مزید بھڑکاتی ہے۔

وصل میں طوالت گرمی جذبات کو سرد کر دیتی ہے۔

فرض کیجیے اگر میں بھی جبل نور کا باسی ہوتا۔ برس برس سے اپنے ہال بچوں کا پیٹ پالنے کی

خاطر اوپر آنے والے زائرین کے صدقہ خیرات کا طالب ہوتا۔ صرف پانی پینے کی خاطر مجھے اس کوہ کے

دامن تک اترنا پڑتا۔ کھانا بھی وہیں سے میسر ہوتا۔ دن بھر تیز دھوپ میں بھاگ دوڑ کرتا اور رات کے

وقت گھلے آسمان تلے پتھروں پر نیند میں جانے کی سعی کرتا تو۔ میرے لیے بھی یہ محض پتھر ہو جاتے۔ تو نیاز

کو ہوجیرت ہوئی تھی کہ یہاں رات رہ کر کیا کرو گے تو اس حیرت کا سبب تھا۔

”کرنا کیا ہے نیاز۔ میں تو صرف یہ سوچ رہا ہوں کہ اگر اس وقت نیچے چلا جاؤں تو کیا پتہ

کوئی ٹیلی میسر ہو یا نہ ہو۔ اگر مل بھی جائے تو بہت دیر میں جدہ پہنچوں گا اور خواہ مخواہ بہورانی کو ڈسٹرب

کروں گا۔ تو صرف اس لیے سوچ رہا ہوں کہ بیٹیں سو جاؤں۔ اور پھر صبح سویرے نکل جاؤں۔ کیا خیال

ہے۔“

”رہنا چاہتے ہو تو رہ جاؤ۔“

نیاز ایک دبلا چٹا ایک نیاز مند اور مددگار خصلت والا نوجوان تھا۔

”لیکن تم یہ بتاؤ کہ رات کے وقت تم کہاں سوتے ہو؟“

”کبھی نیچے بھی چلا جاتا ہوں۔ چوٹی سے ادھر ذرا نیچے۔ جہاں بیڑھیوں کا اختتام ہوتا ہے

وہاں چوٹی ہی ہمارے جگہ ہے اور کلی لٹا میں ہے کبھی وہاں سو جاتا ہوں۔ دو تین اور لوگ بھی ہوتے ہیں۔“

”ادھر اس مگن میں نہیں سوتے؟“

”پھر بھی۔“

نیاز کچھ بولا نہیں۔ اُس کی کچھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہاں خوف کھانے کی یا ڈرنے کی کیا بات ہے۔ کچھ پتھر ہیں آڑے ترچھے۔ جن کے اندر کھوہ ہے۔ پھر اُس نے ایک معصوم بچے کی مانند ہنستے ہوئے کہا ”لھیک ہے صاحب۔ آپ مہمان ہیں۔ میں ادھر آ جاؤں گا۔ ادھر سو جاؤں گا۔ زمین پر ہی سونا ہے تو ادھر کیا اور ادھر کیا۔ لیکن گرمی ہوگا۔“

میرا خیال ہے کہ میں بھی ایک معصوم بچے کی مانند ہی مسکرایا۔ میرے سینے پر جو بوجھ تھا۔ غار حرا کے ہماری پتھروں کا وہ ہٹ گیا۔ ایک چھوٹا سا دیا جلا جس کی مٹی سی لونے میرے من مندر کو روشن کر دیا۔ میں یہاں تسلیم کرنا چاہتا ہوں کہ میں اُس لمحے تک حالت انکار میں تھا۔ اور یہ صرف نیاز تھا جس کے جاوہ ہرے تسلی بھرے لفظ مجھے اقرار تک لے آئے ورنہ میں تو فرار ہونے کو تھا۔ بھگور اہو جانے کو تھا۔ اگر وہ۔ ادھر سو جاؤں گا۔ نہ کہتا تو میں کچھ دیر بعد یقیناً جبل نور سے اُتر آتا۔

”تمہیں تکلیف تو ہوگی نیاز۔“ میں کبھی کسی شخص کا اتنا شکر گزار نہیں ہوا جتنا کہ اُس لمحے ہو رہا تھا اور میں اظہار نہیں کر پا رہا تھا۔ ”در اصل میں یہاں آیا ہی اس نیت سے تھا۔ اس تپتی جھیلے میں رات گزارنے کا سامان لایا تھا۔ بہت بہت شکریہ۔“

جب یہ فیصلہ ہو گیا بوجھ اُتر گیا۔ میں آج کی رات یہیں بسر کروں گا اور نیاز اپنا بوریا ستر یہاں لے آئے گا اس صحن میں تو۔ میں جھیل سرال کی سطح پر ہلکورے لیتا ایک پتھر تھا۔ کسی راج ہنس کا۔ پالوں کی خندک پر تیرتے امن میں تھا شافقی میں تھا۔ غلام میں ڈولتے ایک خلا باز کی مانند بے وزن تھا اور اپنی بے وزنی سے عجیب کیف حاصل کر رہا تھا۔

میرا تپتی جھیل صحن کے ایک کونے میں پڑا تھا۔ کیا اسے اٹھا کر ابھی سے غار کے اندر رکھ دوں یا کچھ صبر کروں۔ غار کا گھر خالی پڑا ہے تو ابھی اس میں آباد ہو جاؤں یا۔ کچھ صبر کروں۔ جب آپ کسی جھٹ کدہ منظر میں سے گزرتے ہیں۔ کسی پہاڑی مسافت کے دوران تو آپ اُسے کسی اور نظر سے دیکھتے ہیں اور جب وہی منظر آپ کی شب کی قیام گاہ ہو۔ آپ نے رات بھر وہاں ٹھہرنا ہو۔ اُس پر معلق آسمانی گنبد کو اسی رات میں دیکھتے رہنا ہو۔ اگر ستارے نمودار ہوں تو اُنہیں اور ماہتاب اُبھرے تو آسے اور طلوع کے رنگوں میں آنکھیں کھولی ہوں تو پھر اسی منظر کو آپ کسی اور اپنا نیت اور قیام کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ابھی کچھ دیر پہلے یہی امکان تھا کہ میں سرسری گزرنے والوں میں سے تھا اس لیے غار حرا کو اس کے گھن کو اور طرح سے نظر میں لے رہا تھا اور اب یہاں رہائش کی صورت اُٹھ آئی تھی تو یہ

تاریکی میں بھی اُس کی مسکراہٹ عیاں ہونے لگی ”ادھر تو بند جگہ ہے۔ کھلی نہیں۔ ادھر تو صاحب بہت گرمی ہوتی ہے۔ اوپر وہاں ہوا لگتی ہے۔ آرام سے نیند آ جاتی ہے۔“

”ادھر کبھی نہیں سوئے۔ کوئی نہیں سوتا۔“

”نہیں۔ ادھر ہوا نہیں۔“

”اچھا۔“ میں نے صرف اتنا کہا۔

وہ اگرچہ نیاز مند خصلت کا تھا لیکن مجھے محسوس ہوا کہ وہ کچھ بیزار تو نہیں بے چین ہو رہا ہے ”صاحب آپ اس ٹیم نیچے نہیں جانا چاہتا تو بے شک نہ جاؤ۔ ادھر سو جاؤ۔ میں آپ کو ادھر جو ہموار اور کھلی جگہ ہے وہاں لے چلوں گا ادھر آرام سے سو جاؤ۔ ادھر تو نیند نہیں آئے گا۔ گرمی بہت ہے۔“

میں اُسے سمجھا نہیں سکتا تھا۔ اور اُس کی نا سمجھی میری سمجھ میں آتی تھی کہ میں محض رات گزارنے کی خاطر ادھر نہیں ٹھہرنا چاہتا تھا۔ غار حرا سے الگ ہو کر جبل نور کی کسی گھاٹی میں جو ہموار اور کھلی جگہ ہے وہاں ایک نسبتاً آرام دہ ہوا لگتی رات نہیں گزارنا چاہتا تھا۔

یہاں اس مقام پر۔ اس کھوہ کے اندر جہاں ہوا کا ایک جھونکا بھی نہیں آتا۔ جہاں شاید کیڑے مکوڑے اور بچھو بھی ریگتے ہوں یہاں رات گزارنا چاہتا تھا۔

چاہتا تو یہی تھا لیکن دہشت میرا دامن نہ چھوڑتی تھی۔ مجھے ایک سہارے کی ایک موجودگی کی تلاش تھی جو مجھے ہمت دے اور وہ صرف نیاز مہیا کر سکتا تھا۔

”یار نیاز۔ میں یہاں رہنا چاہتا ہوں۔ یہاں۔ اگر آپ یہ مہربانی کرو کہ آج کی رات یہیں اس صحن میں سو جاؤ گے تو میں رہ جاتا ہوں ورنہ چلا جاتا ہوں۔“

”ادھر تو بہت گرمی ہوگی۔ ہوا بالکل نہیں ہوگی۔“

”بے شک نہیں ہوگی۔ لیکن میں ادھر ہی سونا چاہتا ہوں۔ اگر تم میرا ساتھ نہیں دو گے تو پھر نہیں۔ پھر مجھے نیچے جانا پڑے گا۔“

ایک۔ ”یہاں ہی کیوں سونا چاہتے ہو۔“ اُس کے لبوں پر آتا آتا رہ گیا۔ شاید وہ میرے بارے میں کچھ تشویش میں بھی مبتلا ہوا کہ یہ کیسا شخص ہے۔ کہیں کوئی سر پھر تو نہیں۔ ”اکیلا کیوں نہیں سو سکتا اگر ادھر ہی سونا ہے۔“

”میرا اصل مجھے یہاں رات گزارنے کے خیال سے خوف آتا ہے۔ میں ڈرتا ہوں۔“

”ڈر کیسا صاحب۔ وہاں اوپر ہم لوگ ہوں گے اور ادھر کوئی خطرہ نہیں میں نے آپ کو

اٹھا کر نیچے کھائی میں کود جاتے ہیں۔ تو یہاں جو زائرین آتے ہیں ہم اُن کو خبردار کر دیتے ہیں، کہ سامان گھنوں اور رکھ دو اس پتھر پر نہ رکھنا۔“

”واقعی؟“ یہ ایک سراسر اچھوتی اور دلچسپ دریافت تھی۔ یقین نہیں آتا تھا۔ میں نے پھر دیوار پر سے جھانک کر نیچے دیکھا تو دو چار بندر اٹھیلیاں کرتے خاصے اوپر آ چکے تھے۔ شاید انہوں نے مجھے جھانکتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ وہ خاصے قریب ہو کر ایک چٹان پر براجمان ہو کر یہ ظاہر کرنے لگے کہ وہ مجھ سے غافل ہو چکے ہیں اور وادی مکہ میں پھیلی روشنیوں کو نہایت اطمینان سے دیکھنے لگے۔

یعنی یہ غار حرا کے آس پاس کی واکلڈائف تھی۔ جنگلی حیات تھی۔ اس سے پیشتر میں نے سمجھا کہ یہاں بھی دیکھی تھیں جو غار حرا کے سین اوپر چٹانوں پر چڑھتی اور میاتی پھرتی تھیں۔ کبھی کسی پتھر پر چڑھ کر بالکل ساکت ہو جاتیں۔ جانے یہ پالتو تھیں یا بندروں کی مانند آزاد رو جس تھیں۔

طائف کے بندروں اور بہت پلے ہوئے بندروں کو دیکھ کر میں نے سوچا تھا کہ یہ ہنومان مہاراج یہاں کیسے آ گئے۔ جہاں وہ دیوتا تھے اُس دھرتی کو چھوڑ کر یہاں کیسے آ گئے جہاں وہ محض بندر تھے تو غار حرا کے صحن کی دیوار سے نیچے نظر آنے والے بندروں کو دیکھ کر بھی یہی خیال آیا کہ ہنومان مہاراج ہم تو ایک مدت سے آپ کو تیاگ چکے۔ مسلمان جیسے کیسے بھی ہیں ہو چکے تو آپ ہمارا پیچھا کیوں نہیں چھوڑتے بھائی۔

ہمارے تعاقب میں یہاں تک چلے آئے ہو غار حرا تک شاید تمہیں ہمارے شک شبہ کا علم ہو گیا ہے۔ تمہیں کچھ آس ہے کہ ہم تمہیں پھر سے دیوتا مان لیں گے اس لیے پیچھے پیچھے چلے آئے ہو۔ یہاں تو ممکن نہیں۔ کہیں اور ملاقات ہوتی تو شاید کچھ امکان بھی ہوتا۔ اس مقام پر تو نہیں۔

ان بندروں کو کوئی شک نہیں کرتا۔ کوئی نہیں مارتا۔

بلکہ بقول نیازان کی خدمت خاطر کی جاتی ہے۔

محض اس لیے کہ جبل نور حرم کی حدوں میں واقع ہے اور ان حدود کے اندر کسی بھی جانور کو لٹک کر یا کاڑھا لٹاک کرنا ممنوع ہے تو ہنومان مہاراج اس سہولت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے۔ جبل نور پر حملے کرتے ہیں۔ راج کرتے ہیں بلکہ ہزاروں برسوں سے کر رہے ہیں۔

یقیناً حضورؐ نے بھی جو یہاں آتے جاتے رہتے تھے۔ بطول مدتوں تک اس غار میں قیام پذیر رہتے تھے تو انہوں نے بھی ان کو دیکھا ہوگا اور یہ بندر جو میں اب دیکھ رہا ہوں انہی بندروں کی نسل تھیں۔ ان کے جنمیں حضورؐ نے دیکھا ہوگا تو اس زمانے سے یہ بندر بھی میرے لیے قہوڑے سے مہاراج ہو گئے۔ میری نظر میں بنے ہوئے ہو گئے۔ انہوں نے یقیناً ان کے لعل اور کھاندہ سے جانوروں کو بھی

ایک گھر لگنے لگا تھا۔

میں صحن کی واحد دیوار کے پتھروں پر گھنٹیاں جمائے کبھی سامنے کے پہاڑوں پر نظر کرتا تھا اور کبھی کھائی میں جھانکتا تھا۔

ادھر سے جبل نور کے اس رخ سے۔ اس کھائی کی جانب سے کوئی شخص اوپر نہیں آ سکتا تھا۔ جب تک کہ وہ چٹانوں پر چڑھنے کے آلات سے لیس نہ ہو اور ان زمانوں میں تو یہ ایسا بے اندازہ تھا۔ انحصار ہمت اور قدموں کی استقامت پر ہوتا تھا۔ یوں بھی اگر دوسری جانب وادی مکہ کی جانب سے یہاں تک آنا ممکن تھا تو کوئی شخص ادھر سے کیوں آئے گا۔ میں کوہ پیما کے یہی حساب کتاب کر رہا تھا اندازے لگا رہا تھا جب یوں جھانکتے ہوئے نیچے چٹانی ڈھلوان پر نیم تاریکی میں دو چار لمبی دم والے میرے ہم شکل جانور نظر آئے۔ جو کبھی اس پتھر پر اور کبھی اُس چٹان پر کودتے پھلاکتے نظر آتے اور وہ نظر تو بندر ہی آتے تھے۔

لیکن یہ کیسے ممکن تھا کہ وہاں بندر ہوتے۔

جبل نور کی گھاٹیوں میں اور پتھروں پر اچھلتے کودتے۔ وہاں بندر کیسے ہو سکتے تھے۔ اگر ہوتے تو کوئی نہ کوئی تو اُن کا ذکر کرتا۔ تو اُن کا ذکر کیوں نہیں آیا۔ پھر مجھے رچر ڈ برٹن کا حوالہ یاد آیا کہ حضورؐ کے زمانے میں وادی مکہ کی گھاٹیوں میں نہ صرف بندر ہوتے تھے بلکہ بڑے بڑے بن مانس یا گوریل بھی پائے جاتے تھے۔ جب مجھے یہ حوالہ بہت عجیب سا اور کسی قدر ناقابل یقین لگا تھا لیکن اب میں انہی بندروں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا کہ میں وادی مکہ کی ایک کھائی کے اوپر ہی تو یہ نظارہ کر رہا تھا۔

جانے کسی بھی زائر نے۔ کسی حاجی بابا نے ان کا تذکرہ کیوں نہیں کیا۔ اُن میں سے کچھ لے لو انہیں دیکھا ہوگا۔ شاید اس لیے کہ بندروں کا اس مقام پر ہونا اُن کے عقیدت سے سرشار بدن کو اور روحانی جذبات کو مجروح کرتا تھا اور نہ اُن کا تذکرہ کرنے میں کیا مضائقہ تھا۔

میں نے مڑ کر نیاز سے رجوع کیا ”یہ نیچے بندر ہیں ناں؟“

”ہاں صاحب۔“ اُس نے وہیں کھڑے کھڑے جواب دیا۔

”ادھر جبل نور پر رہتے ہیں؟“

”جی۔ ادھر ہی ہوتے ہیں۔ سب لوگ ان سے بڑے عاجز ہیں صاحب۔ سامنے رکھا کھا“

”اٹھا کر لے جاتے ہیں اور ہم انہیں کھاتا کھاتی نہیں سکتے۔ حرم کے علاقے میں رہنے والے بندر“

”صاحب یہ جو غار حرا کے داخلے کے برابر میں جو دیوار پتھر ہے لوگ نفل ادا کرنے سے پہلے اس پر ہاتھ“

”کا سامان اور کھانا رکھتے ہیں تو پھر ہاتھ دھو لیتا ہوا کہ یہ بندر وہ سامان اور خالص طور پر کھائے“

کہا "اوائے بھو.. ادھر دیکھو یہ ونی ہیں.. ان کو پہچانا؟ تمہارے چاچا جی ہیں.. پتہ نہیں یہ کیسے آگئے ہیں..
کیسے آگئے ہیں تارڑ صاحب؟.. اوائے ان کے ساتھ تصویریں کھنچو اور غارجا کے سامنے.."
تو میں بے پایاں خوشی کا اظہار کرتا.. ایک جعلی اور عاجزانہ مسکراہٹ لبوں پر نمودار کیے متعدد
لوگ کے ساتھ متعدد تصویریں کھنچواتا ہوں اور فلیش کی روشنی صحن کے درود یوار اور غارجا کے پتھروں کا
کچھ لحاظ نہیں کرتی.. کیمرا اور فلیش دونوں یقیناً جاپانی تھے وہ کیا لحاظ کرتے اور مسلمانوں نے چونک کر پھل
کلی سو برسوں سے ایک نیل کٹر بھی ایجاد نہ کیا تھا اگر ایک کیمرا اور فلیش ہی ایجاد کر لیتے تو وہ کچھ لحاظ
کرتے..

اس فوٹو سیشن کے دوران میں نے نوٹ کیا کہ وہ صاحب جو کیمرا بردار تھے ایک عدد ہیل فون
بھی رکھتے تھے اور ہر دو چار منٹ کے بعد کسی نہ کسی رشتے دار یا کاروباری رابطے کو اطلاع بھی کرتے کہ
میں اس لمحے غارجا کے صحن میں ہوں اور اطلاع کم کرتے تھے اور "ہیلو ہیٹو" زیادہ کرتے تھے تو یکدم مجھے
خیال آیا کہ اس فوٹو سیشن کے عوض کیوں نہ ان کا موبائل استعمال میں لایا جائے..

"آپ کے سیل فون سے جدہ میں بات ہو سکتی ہے؟"

"جدہ تو ادھر پاس ہے تارڑ صاحب.. آپ بے شک پاکستان بات کہیں.. وہ جو بھی تھا ایک
لباس دل فتنس تھا.."

اب تاریکی میں سلجوق کے گھر کا نمبر نہیں مل رہا.. میں تفتی رُک سیک کو اوندھا کر کے اس میں
چلتے بھی کاغذ ہیں انہیں پڑھنے کی کوشش کرتا ہوں کہ نمبر کہاں لکھا تھا اور وہ نہیں مل رہا..

ہلا خرد و تین را نگ نمبر دہانے کے بعد ادھر سے سلجوق کی آواز آگئی "ہیلو" اور میری جہاں
میں جان آگئی..

"سلجوق بیٹے.. میں اب بول رہا ہوں.."

ادھر سلجوق میری آواز سن کر یکدم نروس ہو گیا کہ اگر اس وقت اباجی فون کر رہے ہیں تو یقیناً
پولیس کسٹڈی میں ہیں.. حوالات میں بند ہیں.. غارجا کے شوق میں پکڑے گئے ہیں اور اب میری جہاں میں فون

کر رہے ہیں.. آپ.. کہاں ہیں ابو.. ٹھیک تو ہیں.."

"میں بالکل خوش و خرم ہوں بیٹے.."

"بول کہاں سے رہے ہیں؟"

"میں غارجا کے صحن میں ہوں بیٹے.."

"لیکن وہاں فون کہاں سے آگیا.. ابو آپ کا کیا تائیں آپ کہاں ہیں؟"

محبت کی نگاہ سے دیکھا ہوگا کہ وہ ایسے ہی تھے.. جانوروں پر جبر کرنے والوں اور انہیں اذیت دینے
والوں کو سرزنش کرتے تھے کہ بے شک تم نے عرفات پہنچنا ہے لیکن اپنے اونٹوں کو تیز رفتار کرنے کی غرض
سے انہیں چھڑیاں مت مارو.. تم جو انہیں خوبصورت بنانے کے لیے ان کی لمبی گردنوں میں تنگ طوق
چڑھاتے ہو ان کو اتار دو.. انہیں اذیت ہوتی ہے.. اور ایک بار انہوں نے دیکھا کہ ان کے سیاہ کمل پہ
کالی کملی پر ایک بلی سوئی ہوئی ہے تو اسے اٹھایا نہیں.. اس کی نیند میں خلل نہیں ڈالا.. پاس بیٹھے رہے..
انہوں نے یقیناً ان بندروں کو بھی الفت کی نگاہ سے دیکھا ہوگا..

البتہ ہماری اتنی دیر کی تنہائی میں خلل آ گیا

سُریگ کے اندر سے کچھ ملی جلی آوازیں.. بچوں کی.. بڑوں کی.. خواتین کی آنے لگیں.. کچھ لوگ
آ رہے تھے..

یہ ایک پاکستانی کنبہ تھا.. اس سے عام طور پر کوئی نہ آتا تھا لیکن یہ آگئے تھے.. باتیں کرے
شور کرتے.. جیسے ایک پکنک پر آئے ہوں.. سُریگ میں سے نکل کر صحن میں وارد ہو گئے..

انہوں نے پہلے تو نہایت خشوع و خضوع کے ساتھ غارجا میں باری باری نوافل ادا کیے اور پھر
یادگار کے طور پر ایک کیمرے کے مسلسل اور اس تاریکی میں چند حیا دینے والے فلیش سے پتھروں کے
آرام کو مجروح کرتے ہوئے تصویریں اتارنے لگے.. میری اجازت کے بغیر میری آج کی شب کی قیام
گاہ کی تصویریں اتارنے لگے..

میں نیاز کے برابر میں چٹان کے ساتھ ٹیک لگائے اُن کی رخصتی کا منتظر تھا اور دہکا کھڑا تھا
جب ایک فلیش کی بے رحم چند حیا ہٹ نے مجھے عریاں کر دیا اور اس کے ساتھ ہی کیمرے کے عقب
سے ایک آواز آئی "اوہو.. آپ تارڑ صاحب تو نہیں.."

میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ حج کے دوران میرے لیے یہ ایک صعوبت تھی.. جیسے ایک
کوڑھ کا مارا ہوا مریض اپنے آپ کو لوگوں کی نظروں سے چھپاتا پھرتا ہے.. ظاہر نہیں ہونا چاہتا.. یہی میرا
حال تھا.. کہ میں پہچانا نہیں جانا چاہتا تھا.. ایک دو بار جب میں نے ناگواری کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یہی
میں وہ نہیں ہوں تو کیمیر نے مجھے ڈانٹ دیا کہ اب کیا کرتے ہو.. حج کے دوران جھوٹ بولتے ہو تو پھر میں

احتیاط کر سکتا تھا..

اس لیے میں نے یہاں بھی فوری اقرار کر لیا کہ جی.. میں ہوں..

میں تو کچھ نہیں سنا تھا.. اور جو صاحب مجھے دیکھ سکتے تھے انہوں نے نہایت ہنسرت انداز میں

غارجہ بھی ہو سکتی ہے۔ پورے پہاڑ اور غارجہ کو گھلنے والی چند چٹانوں کی رنگت بھی یکساں ہے۔
 "نیاز، اوپر چوٹی پر۔ اس مہن میں اور غارجہ میں اور اس کی چھت پر روزانہ اتنی طغلت آتی ہے تو
 اس کی آمد سے جو کوڑا کرکٹ جنم لیتا ہے۔ وہی پلاسٹک کی بوتلیں۔ خالی پیکٹ اور کارٹن کاغذ اور سگریٹ
 کی لٹیاں وغیرہ تو اس کی صفائی کے لیے حکومت کچھ کرتی ہے؟"
 "نہیں صاحب۔ حکومت کو اس غارجہ سے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ تو چاہتی ہی نہیں کہ یہاں کوئی
 آئے۔ اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ اس کی صفائی ہم لوگ مل جل کر کرتے ہیں۔ آپ جب
 آئے ہو تو میں اس وقت یہاں جھاڑو دے رہا تھا۔ کوڑا کرکٹ جمع کر کے ہم نیچے لے جاتے
 ہیں۔ پاک جگہ ہے اور پھر ہمارا رزق بھی اسی سے وابستہ ہے۔ گھر بھی یہی جگہ ہے یہاں رہتے ہیں تو
 ہمارا ارض بھی بنتا ہے کدے صاف رکھیں۔"

تاریکی اتنی گہری ہو چلی تھی کہ ہم دونوں ایک دوسرے کی موجودگی کا اندازہ آواز کے زور
 سے لگاتے تھے۔ کچھ نظر نہ آتا تھا۔ اور میں غارجہ کی جانب نظر کرتا تھا تو وہاں مزید اندھیرا سیاہ ہوتا تھا۔
 اس مہن میں کھڑے ہوئے کسی بھی شخص کا واحد مشغلہ بس یہی ہو سکتا تھا کہ وہ دیر وار پر ہاتھ رکھ
 کر ٹیپ میں واقع اس وسیع وادی کو تکتا رہے جس میں جا بجا پہاڑیاں ابھرتی تھیں۔ جبل نور سے کہیں کم
 بلندی کی تھیں اور ہموار زمینوں پر کہیں کہیں اکا دکا عمارتیں تھیں جن میں سے کچھ روشن تھیں ورنہ پورے
 منظر پر رات حاوی تھی۔
 میں نے نیاز کی اس یقین دہانی کے بعد کہ وہ ادھر آ کر سوئے گا اپنا اتنی تھکا ہونے کے دہانے
 کے قریب جو ایک ہموار پتھر تھا اس پر رکھ دیا تھا اور ابھی تک اسے کھولا نہیں تھا۔

اوپر چوٹی سے کسی نے پکارا۔
 یہاں مہن میں کھڑے ہو کر میں اوپر کی جانب دیکھے تو چوٹی کا کچھ حصہ اور وہاں سے نیچے
 آنے والی ایک دو سیڑھیاں دکھائی دیتی تھیں۔ ان سیڑھیوں پر ایک سایہ تھا جس نے پکارا تھا۔
 جانے کون سی زبان میں پکارا تھا اور نیاز نے بھی اسی زبان میں جواب دیا اور پھر مجھ سے
 مخاطب ہو کر پچھا "آپ کے لیے رات کا کچھ کھانا وغیرہ لے آؤں؟"
 "کہاں سے؟"
 "نیچے سے۔ ادھر تو پتھر لہا وغیرہ ہمارے کی اجازت نہیں۔"
 "نہیں گھر سے۔ پھر سے پاس بندہ لے رہا ہے۔"

میں نے اپنے محسن کی جانب تشکر آمیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اسے بتایا کہ فون کہاں سے
 آ گیا۔
 "کیا واقعی؟" وہ یکدم بحال ہو گیا "غارجہ کے مہن سے بات کر رہے ہیں؟"
 "ہاں۔ واقعی۔"
 "کمال ہے۔"
 اور سوچا جائے تو یہ واقعی ایک کمال کی بات ہے کہ آپ کے گھر فون کی گھنٹی بجے اور وہ فون
 براہ راست غارجہ کے مہن سے آ رہا ہو۔
 "تو پھر ابو۔"

"بیٹے یہاں تو بہت رونق ہے۔ یہاں تک کہ موبائل کی سہولت بھی میسر ہے تم بالکل فکر مند نہ
 ہونا۔ میں آج کی رات یہیں گزار رہا ہوں۔ بہت رونق ہے میرا خیال ہے ساری رات آنا جانا لگا رہتا
 ہے۔ میلہ لگا رہتا ہے۔ کوئی پابندی نہیں کوئی خطرہ نہیں تم بالکل بے فکر ہو جاؤ۔ اور ہاں امی کا کیا حال ہے؟"
 "ٹھیک ہے۔ اپنی بہو سے لاڈ کر رہی ہیں اور کہہ رہی ہیں کہ تمہارے ابا کا کچھ نہیں ہو سکتا
 اسے اس کے حال پر چھوڑ دو۔"

"ہاں کچھ نہیں ہو سکتا۔" مجھے تسلی ہوئی "میں صبح آ جاؤں گا انشاء اللہ۔"
 وہ مطمئن ہو گیا۔ اور یہی میں چاہتا تھا کہ وہ میرے لیے فکر مند نہ ہو۔
 وہ پاکستانی خاندان جو سعودیہ میں ہی مقیم تھا شتابی سے فارغ ہو کر اسی طور شور مچاتا پکک سے
 لطف اندوز ہوتا ایک ایک کر کے سرنگ میں غائب ہو گیا اور ہم دونوں پھر سے تنہائی میں چلے گئے۔

حرا کی غارجہ کمال کی پوشیدگی تھی۔
 حضور کے زمانوں سے بھی پہلے جو "حنیف" تھے۔ جو تلاش میں تھے۔ جستجو میں تھے۔ معاشرتی
 اور مروج مذہبی اقدار سے مطمئن نہ تھے ایک بڑے آدرش کے تمنائی تھے تو وہ سب سے الگ ہو کر غور و فکر
 کی دنیا میں غرق ہونے کے لیے اگر اس بلند مقام میں پہنچا لیتے تھے تو یہ قابل فہم تھا۔ جبل نور کی چوٹی سے
 ذرا نیچے ایک عمیق ڈھلوان میں تھوڑی سی جگہ ہموار اور چند آڑی ترچھی چٹانیں منہدم حالت میں ایک
 دوسرے کے ساتھ قائم اور ان میں ایک کھوکھلی میں صرف اتنی گنجائش کہ ایک شخص اطمینان سے
 لیٹ سکے۔ بیٹھ سکے۔ یا عبادت کر سکے۔ پہاڑ کے دامن میں کھڑا کوئی شخص اگر اوپر دیکھے تو قطعی قیاس نہ
 لے سکتا کہ وہ ایک چٹان کے بل پر لیٹا ہے یا ایک کھوکھلی میں لیٹا ہے۔ اسی طرح اگر وہاں کسی ایک

یہ کہہ کر کہ صاحب فکر نہ کرو میں ابھی آتا ہوں۔ بیڑیاں چڑھتا چوٹی کے پتھر تلے معدوم ہو گیا۔
میں اسی لڑکھڑاتے بابا بنگالی ساختہ لکڑی کے بیچ پر کھجی گدڑی پر جتنی تھیلیا گود میں لے کر بیٹھ گیا۔ اب میں تھا جبل نور پر اور بنگالی بابا تھا اور وہ ہلکی روشنی تھی جو ہم دونوں کے چہروں پر پھیلتی تھی۔
بابا بنگالی گفتگو سے پرہیز کرتا تھا۔ مجھے بالکل نظر انداز کیے اسی بدھا حالت میں بیٹھا رہا اور
تو اند اور داڑھی کو بیک وقت کھاتا اور سنوارتا رہا۔

جہاں میں بیٹھا تھا۔ اور جہاں میرے پاؤں دھرے تھے اُن سے آگے بمشکل ایک قدم کا
لاصل تھا اور اُس کے بعد وہ کھائی تھی جو کرتی تھی تو دامن تک سانس نہ لیتی تھی اس لیے ذرا سنبھل کر بیٹھا
پڑتا تھا۔ اس بیچ سے دائیں ہاتھ پر پتھر کی حدود میں کھائی کے کنارے تھوڑی سی ہموار جگہ تھی۔ میں کچھ
حساب کتاب کرتا رہا۔ نیاز کی محن میں موجودگی کے باوجود غار کے اندر تو میں تنہا ہوں گا۔ اور اگر وہ بیٹھے
ہاں ہے اور جیسا کہ اُس نے بتایا تھا کہ وہ کبھی نیچے بھی رو جاتا ہے تو اگر وہ رہ گیا تو میں اس سے تو واپس
ہالے سے رہا۔ میں نے بنگالی بابا کو گفتگو پر مائل کرنے کی نہایت عاجزانہ کوشش کی کہ میں نیاز کے بعد
اُس کے رحم و کرم پر تھا لیکن اُس نے ”ہوں۔ ہاں۔“ کے سوا کچھ نہ کہا۔ وہ مجھے پسند نہ کرتا تھا۔ میری خواہ
خواہ کی وہاں موجودگی اُسے ناگوار گزر رہی تھی۔ میں اُس کی پرائیویسی میں خلل ڈال رہا تھا۔ اُسے عادت
تھی کہ اوپر بیڑھیوں سے کوئی ڈانڈا اترے۔ وہ اُسے نارنج کی روشنی میں سرنگ کا راستہ دکھائے اور پھر چند
لمحوں بعد وہ غار حرا میں لٹل پڑھ کر برآمد ہوا اور چلا جائے۔ اُسے یہ عادت نہ تھی کہ ایک ڈانڈا آئے اور وہ
اپنی اپنا چھوٹا بیڑی کے ساتھ خود کفیل ہو کر۔ سرنگ میں جا کر واپس آئے تو میں نہیں ٹھہر جائے۔ اُس کے
الٹی لٹ پر چپک جائے اور جانے کا نام نہ لے۔

”بابا۔“ میں نے نہایت فقیرانہ انداز میں کہا۔

”ہوں۔“ اُس نے تو نہ کھائی موقوف کی لیکن داڑھی بدستور سنوارتا رہا۔

”میں اگر اس ہموار سطح پر آپ کے پتھر تلے اپنا مصلیٰ بچھا کر ادھر رات کو سو جاؤں تو آپ کو

کوئی اعتراض تو نہ ہوگا۔ سو سکتا ہوں؟“

”ہاں سو جاؤ۔“ یعنی جہاں میں آئے کرو۔ میرا دماغ نہ کھاد۔

”فکر یہ ہا ہا ہا۔“ یہ میرا علاقائی کارڈ ہے اگر کبھی پاکستان آئیں تو ملاقات کا شرف

”اچھا۔“ کچھ رنگ کی فردوس مارکیٹ میں کسی بھی دکاندار سے میرا پچھلے ہیں اُن سے میرا ادھار چلتا ہے

اس لیے جانتے ہیں کہ میں کہاں رہتا ہوں۔“ میں نے بیچ سے اٹھ کر اپنا کارڈ لایا کو پیش کیا۔ اُس نے

دھول لیا اور اپنی گدڑی تلے کھینچ دیا۔ ”ادھر بہت لوگ آتا ہے۔ کارڈ لایا ہے۔“ مرا کوکا۔ شام کا عصر

”تو آپ بیٹھے میں نیچے جا رہا ہوں کھانا کھانے کے لیے۔“ وہ جانے کے لیے سرنگ میں
داخل ہونے کو تھا کہ میں نے اُسے روک لیا۔ ”نیاز آپ نیچے جاؤ گے کھانا کھانے کے لیے۔“ میرا خیال تھا
ابھی ادھر ہی رہو گے۔“
”صاحب کھانا تو کھاتا ہے۔ اور وہ نیچے ملتا ہے۔“ میرا خیال ہے کہ وہ مسکرا رہا تھا۔ میری چٹا
کو سمجھ رہا تھا۔

”تو ٹھیک ہے۔ کتنے بجے واپس آؤ گے۔“ میں خاصا خوفزدہ ہو گیا۔

”تین گھنٹے تو لگ ہی جائیں گے۔ نیچے اترتے اور پھر اوپر آتے۔“

ابھی آٹھ بجے تھے۔ تو اُس نے گیارہ بجے کے قریب لوٹنا تھا۔

وہ چلا تو میں بھی اپنا تھیلیا اٹھا کر ساتھ ہی چلا۔ میں تو اُس کے بغیر اس تاریکی میں غار کے
قریب تنہا نہیں رہ سکتا تھا۔ تو یہ۔ مجھ میں اتنی برداشت نہ تھی۔ ”میں بھی باہر چلتا ہوں۔“ بنگالی بابا کے پاس
بیٹھ کر تمہاری واپسی کا انتظار کروں گا۔“

”یہاں کیوں نہیں ٹھہرتے۔ کوئی بھی نہیں۔“

”اسی لیے تو نہیں ٹھہر سکتا کہ کوئی بھی نہیں۔“

”غار ایسے خالی کم ملتا ہے کچھ پڑھ لو۔“

”میں نے جتنا پڑھنا تھا پڑھ لیا۔ چلو۔“

وہ پھر مسکرایا ہوگا کہ اُس نے اتنا ڈر پوک ڈانڈا پہلے کہاں دیکھا ہوگا۔

سرنگ میں داخل ہوئے تو وہاں ظاہر ہے تاریکی کی تہہ مزید دبیز ہو گئی۔ اور نارنج کی روشنی
اُسے روشن نہیں کرتی تھی بس دھندلا دیتی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ سرنگ میں سے واپس جانا نہایت
آسان ہے۔

دوسری جانب برآمد ہوئے تو وہاں بنگالی بدھا بیک وقت ایک ہاتھ سے تو نہ کھاتا تھا اور
دوسرے ہاتھ سے داڑھی سنوارتا تھا۔ اور دوسری جانب محن کی نسبت تاریکی بہت مدھم تھی۔ وہی ہلکی سی
لوچی جو شہر مکہ کی خانہ کعبہ تک جاتی گھنی آبادیوں کی لاکھوں ٹٹمائی روشنیوں میں سے اُٹھ کر بمشکل یہاں
تک پہنچتی تھی۔

جبل نور کا ایک پاسا جہر بنگالی بابا کا پتھر تھا۔ رے روشنی میں تھا اور دوسرا پاسا جہر
غار حرا تھا تاریکی میں کھویا ہوا تھا۔

جہاں سے بنگالی بابا کے ساتھ بدھا آگیا وہاں سے جو شاہ کھالے کے پاس میں تھے اور پھر مجھے

اور چین کا تو ہم کدھران کے پاس جاتا ہے۔ ادھر کیوں سوتا ہے۔ تم کو اوپر لے جائے گا ادھر لگتا ہے۔ ادھر سو جاؤ۔

”آپ ادھر سوئے گا۔“

”ہاں ادھر سوئے گا۔ یا کیا پتہ ادھر سوئے گا۔ آج شاید ادھر سوئے گا۔“

”کب سوئے گا بابا؟“

”ابھی غسل کرے گا۔“

”کیا کرے گا؟“

”گسل۔ پانی کے ساتھ۔“

”اچھا۔ غسل کرے گا۔ تو بابا جی ادھر کوئی نلکا وغیرہ ہے مکہ کا رپوریشن کا۔ جدھر غسل کرے گا۔“

”نہیں بابا۔“ یہ بابا ذرا پگھلا۔ قدرے فریڈی ہوا۔ وہ مجھ میں کوئی خاص دلچسپی نہیں رکھتا تھا۔

وہ میرے جیسے بے وجہ سوال جواب کرنے والے زائرین کا عادی تھا۔ اُس کا رویہ غیر جانب دار تھا کہ میں اگر وہاں بیٹھا رہتا ہوں اور مصلیٰ بچھا کر سو بھی جاتا ہوں تو اُسے کچھ پروا نہ تھی اور اگر رخصت ہو جاتا ہوں تو بھی اُس کی زندگی میں کچھ فرق نہ پڑتا تھا۔ تو پہلی بار میرے یہ پوچھنے پر کہ بابا جی ادھر کوئی نلکا وغیرہ ہے وہ ذرا پگھلا ”نلکا کہاں ہوگا بابا۔ نیچے سے بوتل منگوایا ہے“ اُس نے منرل واٹر کی ایک بوتل گڈڑی تلے سے برآمد کر کے اُس کی نمائش کی ”اس سے غسل کرے گا۔“

”اس سے۔ اس ایک بوتل پانی سے آپ سارے کا سارا نہائے گا؟“

”روح روج نہاتا ہے۔“

میں نے جان لیا کہ وہ روز روز نہاتا ہے اور اپنے بارے میں کچھ بتایا کہ میں کون ہوں۔ کہاں سے آیا ہوں کیا کرتا ہوں۔ اور کچھ بڑھا چڑھا کر بتایا۔ لیکن میرا خیال ہے کہ وہ کچھ سن نہیں رہا تھا۔ اپنے قدموں تلے پھیلی وادی مکہ کی رات میں گم رہا۔ وہ مجھے توجہ کے لائق نہیں سمجھتا تھا۔ لیکن اُس کی توجہ حاصل کرنا میری مجبوری تھی۔ اُس کے ساتھ خوشگوار تعلقات استوار کرنا۔ اُسے خوشامد اور چالوسی سے خوش کرنا

میری خواہش تھی کہ اس لمحے پورے جبل نور پر شاید میرے اور اُس کے سوا اور کوئی ذی روح نہ تھا۔ اور اُسے دوست بنا لینے میں میری ایک غرض تھی۔ کہ رات کے کسی لمحے۔ نیاز کی صحن میں موجودگی کے

ہاں جو غار حرا میں مجھ پر خوف طاری ہو گیا ہے۔ میں لا رہا ہوں۔ یا نہیں بچ کے قریب زمین پر مصلیٰ بچھا کر سو جاتا ہوں اور رات کے کسی پہرہشت میں آ جاتا ہوں تو یہی ایک شخص تھا جسے میں مدد کے

ڈر جانے میں کوئی شرمندگی تھی۔

وہ غارتو ایسی تھی کہ میرے بابا بھی ڈر جایا کرتے تھے۔ اسی لیے تو ہماری ماں خدیجہ اُن کی احاسر بندھانے کی خاطر اسی کھائی کے دامن میں جو میرے قدموں سے شروع ہوتی تھی خیمہ زن ہوتی تھی۔

چنانچہ اس بنگالی بابا کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر میں زندگی بھر کا چالوسی اور خوشامد کا تجربہ کرنے کا رولانے لگا۔ مجھے ایک اور غرض بھی تھی۔ یہ ایک نہایت انوکھا اور یکتا کردار تھا اور میں اُس کی زندگی کے بارے میں کچھ جاننے کا متمنی تھا۔

آپ ہی فیصلہ کیجیے کہ ایک شخص ہے جس کا کام صرف یہ ہے کہ وہ ذرا آگے ہو کر ایک تاریک کمرے میں نارنج سے روشنی کرتا ہے تاکہ زائروں کو آسانی ہو۔ اور وہ سرنگ غار حرا کو جاتی ہے۔ یہ شخص اور کچھ نہیں کرتا۔ برسوں سے ایک بے آباد پہاڑ پر رہتا ہے جہاں پینے کے لیے بھی پانی نہیں ہے اور کھانا بھی ایڑھ کھنے کی اُترائی کے بعد کہیں دامن میں ملتا ہے۔ اور یہ شخص عام طور پر حرا کے قدیم پہاڑ پر تہا سوتا ہے۔ تو کیا اس سے انوکھا اور الگ کردار آپ کے تصور میں آ سکتا ہے؟

یہاں ایک وضاحت گوش گزار کروں۔ بابا بنگالی کی جو گفتگو میں درج کر رہا ہوں جو مکالے میں لکھ رہا ہوں وہ قطعی طور پر اتنے واضح اور آسانی سے سمجھ آ جانے والے لہجے میں نہیں تھے۔ اُسے اردو کے معدودے چند الفاظ ہی آتے تھے اور وہ بھی ٹھیکہ بنگالی لہجے میں ادا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ ٹھیکہ کالی میں ہی بولتا چلا جاتا تھا۔ میں بہت ٹانک ٹوئیاں مارتا کہ بابا کیا کہہ رہا ہے۔ نہایت غور سے ایک ایک لفظ اپنے اندر اُتارتا۔ کبھی کچھ مفہوم پتے پڑ جاتا اور اکثر مکمل طور پر بے خبر رہتا۔ اور جو تھوڑا بہت سمجھ میں آتا وہ بھی مرحوم شرقی پاکستان کے ساتھ جو عارضی وابستگی نصیب رہی تھی اُس کا مرہون منت تھا۔ تو کالی بابا کی جو بول چال میں لکھ رہا ہوں اُس کی ادائیگی ہو بہو یوں نہ تھی۔ محض میری سمجھ میں جو آتا تھا اسی کا بیان ہے۔

”بابا آپ کا پورا نام کیا ہے؟“

”نور اللہ۔“ اُس نے اللہ کو درست عربی مخرج میں ادا کیا ”رہتا بھی جبل نور پر ہے تو نور اللہ۔ میرا بھائی ہے ہدایت اللہ۔ ایک اور بھائی ہے شفاء اللہ۔ اور بھی بھائی ہے۔ اُن کا نام بھی ایسا

ہے۔“

”میں یہاں سگریٹ پی لوں۔“

”ہاں پی لو۔ سب بتاتا ہے۔“

”وہ ٹائلٹ.. پیشاب وغیرہ..“

نور اللہ ذرا سا اپنے سنگھاسن سے ڈولا تھوڑا آگے ہوا اور نارنج روشنی کر کے میرے قدموں کے قریب اس کی روشنی مرکوز کی.. ”ادھر سے نیچے اترتا ہے.. راستہ بنا لیا ہے.. بس دس بارہ قدم نیچے ہوتا ہے تو ادھر بندوبست ہے.. جائے گا؟“

”نہیں ابھی نہیں..“

”تو ہم جاتا ہے.. پہلے نیچے جائے گا بندوبست کے پاس.. پھر آئے گا..“ اس نے پلاسٹک کی ہول سنہالی اور ہولے ہولے اندھیرے میں چلا گیا..

میں تنہا رہ گیا..

ایک ڈولتے ہوئے بچ پر گود میں تپتی تھیلارکھے.. جبل نور کی چوٹی کے عین نیچے ایک کھائی کے کنارے.. ہلکی روشنی میں.. میں تنہا رہ گیا.. وہ ہلکی روشنی میرے چہرے پر سفید پھوار کی مانند چھوٹی محسوس ہوتی تھی.. میرے قدموں تلے.. معاف کیجیے گا کہنا میں یہ چاہتا ہوں کہ نیچے دامن میں مکہ کا شہر تھا.. پھیلا ہوا.. اور اس سے پرے ایک ہیوٹی سا تھا ایک پہاڑ کا جس کے اندر غار ٹوڑ تھا.. جس کے اندر یار تھا اور بار بار تھا..

میں نے سوچا کہ اگر نیاز کے ساتھ کوئی مسئلہ ہو جاتا ہے تو یہیں بچ کے قریب مصلیٰ بچھا کر پڑا رہوں گا اگر چہ احتیاط کرنی ہوگی.. کروٹ بدلنے سے کھائی میں گرنے کا احتمال تھا..

لیکن صرف اس صورت میں اگر بابا بھی یہیں سو جائے.. اگر وہ اوپر جا کر سوتا ہے جہاں ہوا چلتا ہے تو میں بھی ادھر چلا جاؤں گا.. تنہا یہاں بھی سونا مشکل تھا..

یقین کیجیے کہ وہ لمبے عجب جمال کے تھے جب میں یکسر اکیلا وہاں بیٹھا ہوا تھا اور وادی مکہ نیچے بھی ہوئی روشن تھی.. اپنی روشنیاں اوپر میرے چہرے کے لیے بستی تھی.. ان کی لو سے میں محسوس کر سکتا تھا کہ وہ میرے رخساروں کے مساموں میں جذب ہو رہی ہیں.. ذرا بھی سراسر رخصت ہو گیا اور میرا پرادھن حلقوں سے بے نیاز ہوا.. راج فیس کے ایک بڑے کی مانند ہکا پھکا ہو گیا.. کھل گیا..

جبل نور پر اس مکمل تنہائی میں ایک رات میں.. بیٹی ہوئی یہ چند ساتیں ایک پوری زندگی

میں..

ایک ایک لمحہ.. بلکہ اس لمحے کا سواں حصہ بھی اس قابل تھا کہ اسے تفصیل سے بیان کیا

جاسکے.. میرے اس پاس اترنے والی ماٹ.. ہر پھر.. ایک گھبراہٹ ہو چکی تھی..

”تو آپ کتنے عرصے سے.. اپنے بنگال کو تیاگ کر.. بلکہ دنیا چھوڑ کر ادھر بیٹھا ہوا ہے..“

”بہت برس ہو گیا.. میرا خیال ہے چھ سات برس ہو گیا.. یا شاید آٹھ برس ہو گیا.. کچھ

نہیں..“

”بنگال میں بال بچہ ہے؟“

”ہاں ہے..“

”کتنا ہے..“

”بہت ہے.. بڑا بڑا ہے..“

”کبھی اُن سے ملتا نہیں؟“

”کیوں نہیں ملتا.. ایک سال وہ ادھر آ جاتا ہے مجھ سے ملنے کے لیے.. ایک سال ہم چلا جاتا ہے.. یعنی بابا جی مسلسل قیام میں نہ رہتے تھے..“

”آپ کا بچہ.. جو بڑا بڑا ہے وہ آپ کو یاد نہیں کرتا کہ بابا ہمارے پاس کیوں نہیں رہتا..“

”یاد کرتا ہے.. اُن کو پیسہ بھیجتا ہے اس لیے بھی یاد کرتا ہے..“

”آپ کبھی خانہ کعبہ نہیں جاتا؟“

”جاتا ہے.. جمعہ کا روز نیچے اترتا ہے.. نیچے اترنا مشکل کام ہے بوڑھا لوگ کے لیے.. ویکن

میں بیٹھ کر کعبہ جاتا ہے اور ادھر جمعہ کا نماز پڑھ کر شام کو واپس آ جاتا ہے.. ہر جمعہ نہیں.. کبھی کبھی کا جمعہ..“

”یہ چچتر آپ نے خود بنایا ہے جس کے نیچے رہتا ہے؟“

”نہیں خود کیسے بناتا.. پاکستانی لوگوں نے جو کچھ ادھر ادھر سے ملا اس سے بنایا.. نیچے سے

کچھ نہیں لایا.. بس یہ دو ہانس ہے.. اوپر کچھ پرانا کپڑا ہے اور پلاسٹک کا موٹا والا شیٹ ہے..“

”بارش ہوتی ہے تو کیا کرتا ہے..“

”گار کے اندر چلا جاتا ہے.. ادھر سو جاتا ہے پر اندر گرمی بہت ہوتا ہے..“

”ویسے آپ ادھر بالکل کھائی کے کنارے رہتا ہے.. چلتا پھرتا ہے رات کے وقت بھی تو ہے

وہیانی میں کبھی گرتا نہیں؟“

”نہیں یہ ہمارا گھر کے موافق ہے اس میں نہیں گرتا..“

”اب میں نے ایک تنہائی ٹاؤن گزیر سوال کیا جو بہت دیر سے میرے ذہن میں

کلبا رہا تھا.. بابا ادھر حوائج ضرور یہ کیسے کرتا ہے..“

”کیا کرتا ہے..“

اپنے اداہور کے گھر میں صوفے پر ناگلیں سمیٹ کر پکڑا مار کر ٹیلی ویژن دیکھنے کی عادی تھی لیکن یہاں احتیاط کرتی تھی کہ ایسا کرنے سے کہیں ان صوفوں کی سفیدی پر کوئی نشان نہ ابھر آئے اور بہورانی یہ نہ سمجھ لے کہ ساس صاحبہ تو بالکل پینڈ وہیں جو اس انداز میں بیٹھتی ہیں۔

اور بہت دور... شہر مکہ سے شہر لاہور تک جتنے فاصلے ہیں اُن کے پار سمیرا اس لمحے جانے کہاں مصروف ہوگا۔ کسی نئے ریسٹوران میں قہقہے لگاتا یا اپنے کمرے میں ڈرائنگ کرتا۔

اور وہ سب یہ کیسے جان سکتے تھے کہ میں اس لمحے کہاں ہوں۔

جبل نور پر تنہا ہوں۔

تجتنی رُک سیک گود میں رکھے اُس رات کے انتظار میں ہوں جو میں نے غار حرا میں بسر کرنی

وہ سب یہ کیسے جان سکتے تھے۔

ایک سربراہٹ سی ہوئی۔

جیسے میرے آس پاس سے کچھ گزر گیا ہو۔

میرے پاؤں کے قریب سے کسی شے کا گزر ہوا ہو۔

میرا بدن جو ڈر سے خالی ہو چکا تھا اس سربراہٹ نے اُسے پھر سے بھر دیا۔

کچھ تھا۔ لیکن پتہ نہیں کیا تھا۔

اور کچھ نہیں بہت کچھ تھا۔ سربراہٹ ایک نہ تھی۔

میں نے چوکنے ہو کر نہایت غور سے آس پاس نگاہ کی۔ غور کرنے سے وہ کچھ نظر آنے لگا۔

تارکی میں سرسراتے... چٹانوں سے اترتے... میرے ارد گرد منڈلاتے... میری موجودگی کو

خاطر میں نہ لاتے کچھ سستی سے ٹپکتے اور کچھ بھاگ دوڑ کرتے چوہا نما کچھ بڑے بڑے سے جانور تھے۔

وہ ہماری ناگاہک بات درخت خراب اور دیو سائی میدان میں پائے جانے والے مار موٹ سے تھے۔ لیکن

اسے خطرہ نہ تھا اور کیوں نہ تھے۔ اُن جیسے تھے۔

میں نے ایسی فعل کے جانور پہلے کبھی نہ دیکھے تھے۔

وہ خاصے فریڈی تھے۔ میرے پاؤں کے آس پاس بے خطر گھومتے تھے۔ یکدم ہی نمودار

ہو گئے تھے۔ کبھی کسی پتھر پر چڑھتے اور کبھی اترائی میں کود جاتے۔

میں دم رو کے بیٹھا ہوا کہ ہالے کیا چیزیں ہیں کہیں میرے ہلنے پھلنے سے مجھ پر حملہ ہی نہ

سیڑھیاں... چھتر... وادی مکہ کی بستیوں میں جو لاکھوں روشنیاں تھیں ہر ایک روشنی... یہاں تک کہ ہاپے کی میلی گچلی گدڑیوں میں سے آتی ہوئی کچھ بو بھی... اور خاص طور پر وہ لو جو جبل نور میں ٹکس ہوتی اُسے واقعی نور کا پہاڑ بنا رہی تھی۔ اور یہ مکمل تنہائی... اس لائق تھے کہ ان کی ایک ایک تفصیل ذہن میں اتاری جائے۔

اسے زندگی بھر یاد کیا جائے۔ میرے پاؤں تلے... جو گزرتے جو سنگریزے تھے اُن میں سے ہر ایک سنگریزے کا لمس بھی بیان کیا جائے۔ اُس ہلکی روشنی میں... مدھم لو میں میرا پورا وجود یوں دکھائی دے رہا تھا جیسے صحرا کی سردرات میں سلگتے الاؤ کے قریب بیٹھے ہوئے ایک مسافر کا چہرہ دور سے دکھائی دیتا ہے۔

جس منظر میں میں تھا۔ اور جو منظر میرے آس پاس اور نشیب میں پھیلا ہوا تھا جو مجھے دکھائی دے رہا تھا اُسے میں کیسے بیان کروں کہ وہ آپ کو بھی ویسا ہی دکھائی دے۔

شاید ایک روایت کام آجائے۔

غزوہ خیبر کے بعد حضرت جویریہ جو ایک یہودی سردار کی بیٹی تھیں اور جن کا خاوند مارا جانا چکا تھا وہ... حضور کی خدمت میں حاضر ہونے کے لیے جا رہی ہیں۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ اُنہیں جاتے ہوئے دیکھ کر حسد کا شکار ہوتی ہیں اور کہتی ہیں... بُرا ہو تیرا! تو جیسے مجھے دکھائی دے رہی ہے۔ تو ایسے ہی رسول اللہؐ کو دکھائی دے گی۔ کہ حضرت جویریہ بے حد خوش شکل تھیں۔

تو جیسے یہ منظر مجھے دکھائی دے رہا تھا۔ کیسے بیان کروں کہ وہ آپ کو ویسا ہی دکھائی دے۔ اور میں اُس منظر کے اندر اُس کو دیکھتا ہوا مسلسل مسرت سے بھیگتا اُس کے کیف کو بدن میں سموتا ایک معصوم بچے کی مانند مسکراتا جا رہا تھا اور تب اُس لمحے میں نے اپنے آپ سے یہ سوال کیا کہ... اے تار تم کہاں بیٹھے ہوئے ہو۔

اور جب یہ سوال میرے ذہن میں آیا اور اس کا جواب آیا کہ جبل نور پر... غار حرا میں اترنے والی سُرنگ کے دہانے پر... ایک رات میں... بالکل تنہا... یہ میں ہوں تو میرے جتنے میں ایک جہر بھری سی آگنی کہ میں کہاں بیٹھا ہوا ہوں۔

اور اُس لمحے جب صرف ایک گھنٹے کی مسافت پر واقع اماں حوآ کے شہر جدہ کے ایک گھاؤ میں... اُس سوئمنگ پول کے کنارے ایک چھوٹے سے ولا میں... جس پول کے پانیوں میں شاید اس لمحے وہ متناسب بدن کی رُوی عورت مسلسل اور بے آواز تیر رہی ہوگی اور ولا کی پہلی منزل پر میری بہو داخل سر جری کی دیوہکتاؤں پر اپنی سربراہتیں لکھنے لگے اُن میں غرق ہوگی اور نیچے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر نہایت مودب بیٹھی شاید ٹیلی ویژن دیکھ رہی ہو... شاید کھانا بنا رہی ہو کہ لیکن لاوارث اُس کی تسلی نہ ہوئی اور وہ وہاں سے اُس کے لیے لکھنے والی ماحول میں ٹپکتے ہوئے مسافر کے چہرے کے تھے اور وہ

کرویں... پتہ نہیں کیا ہیں... کیا پتہ آ سبب ہیں...

اس ذرا آلود کیفیت میں دم رو کے بیٹھا ہوں تو کیا دیکھتا ہوں کہ چوٹی سے اترنے والی سیرجیوں سے ایک لہادے لہراتا جوڑا دھیرے دھیرے اتر رہا ہے... ایک دراز قامت اگرچہ فرہہ سعودی نوجوان اور اس کی فی الحال ایک اہلیہ... وہ اتر کر جب مجھ تک... میرے چچتر تک... کہ یہ چچتر فی الحال میری عارضی ملکیت میں ہی تھا... وہ پہنچے تو میں نے بلا سوچے سمجھے بابا رنگالی کا فریضہ سرانجام دیتے ہوئے اپنی چھوٹی ٹارچ روشن کر کے اُن کے لیے ننگ سرنگ کی اندھی تاریکی میں راستہ بنایا... نوجوان نے عربی میں کچھ کہا... شاید میرا شکریہ ادا کیا یہ سمجھتے ہوئے کہ میں ازل سے ادھر ہوں اور یہی میرا پیشہ ہے... وہ دونوں آپس میں کھسر پھسر کرتے سرنگ میں چلے گئے...

اتنی دیر میں بابا رنگالی نہایت فراغت سے توند کھجاتا فارغ ہو کر اوپر آ گیا... اُس کی منرل والر کی بوتل کا کچھ پانی صرف ہو چکا تھا...

وہ میرے پاس بیٹھا نہیں... اپنی گدڑیوں میں سے ایک لنگوٹ سا برآمد کر کے اُسے سونگھتا اور جانے لگا تو میں نے پوچھا "نور اللہ اب کدھر جاتے ہو؟" "اب ہم غسل کرے گا... اوپر جا کر... بہت پانی ہے... بوتل چھلکا کر اُس نے بہت پانی کا مظاہرہ کیا اور اوپر جاتی سیرجیوں کی جانب چلا گیا..."

اب میں پھر غار حرا تک جانے والی سرنگ کا اکلوتا نگہبان تھا... اکلوتا رکھوالا تھا...

پہلے پنج پر بیٹھا ہے دھیان تکتا جاتا تھا بچوں کی مانند مسکراتا جاتا تھا لیکن سعودی جوڑے کو راہ دکھانے کے بعد میں بابا رنگالی کی گدڑیوں پر ہی براجمان رہا... خوش نصیبی کی جو بادشاہی مجھے حاصل ہو گئی تھی اُس سے روح کو بھگوتا رہا اور لطف اندوز ہوتا رہا... ہر دو چار لمحوں کے بعد اپنے آپ سے سوال کرتا کہ اے تارڑ کہاں ہو اور میں اپنے آپ سے پاسے نظر ڈال کر خود سے کہتا کہ یہاں...

طائف میں مسجد عداس کے گھن کے ایک حصے کی جانب اشارہ کر کے مجھے بتایا گیا کہ حضور اُس جگہ بیٹھے تھے تو مجھے یہ کسی گزری تھی کہ نظر اس حصے سے ہٹتی نہ تھی اور میری پیشانی مجھ سے بغاوت کرتی تھی کہ مجھے اس حصے کو چھو لینے دو... وہاں تو حضور پاکہ دم کے لیے ٹھہرے تھے جنہوں نے اُن کے بدن کو ٹون آ اور کب پانچواں ان کے لیے بھی دعا کرتے تھے... ان کی حالت اپنے آپ سے کہتے تھے... عداس کے پیش

کردہ انگور کے دانے پیاسے طلق میں اُتارے تھے اور چل دیئے تھے... اور یہاں... کوئی ایک حصہ تھا کوئی ایک جگہ تھی... کہاں کہاں اُن کے نقش پانہ تھے ہتھیلیوں کے نشان ثبت نہ تھے... اگر یہ نقش اور نشان لہا پاں ہونے کا قصد کر لیں تو جبل نور کا ہر پتھر ہر سنگریزہ دکنے لگے... ہر جانب پاؤں کے نشان اور ہتھیلیوں کی شاہنشاہیوں روشن ہو جائیں کہ اُن کے عکس میرے بدن کے پنے پنے پر ٹھہر جائیں... دور سے مجھے کوئی اچکھے تو حیرت میں چلا جائے کہ یہ شخص پاؤں کے نشانوں اور ہتھیلیوں کی شاہنشاہیوں سے بنا ہوا ہے... اس کے بدن کا کوئی حصہ کالک میں نہیں سارے کا سارا روشن ہے... اور میں دم رو کے ساکت اسی حالت میں توند بیٹھا رہتا... میں بہت احتیاط سے ذرا پہلو بدلتا... ذرا سا حرکت کرتا اور یوں وہ پاؤں اور ہتھیلیوں کے عکس بھی میرے بدن پر اپنی جگہ بدلتے... میرے حرکت کرنے سے وہ ذرا آگے پیچھے ہوتے... تو مجھے لگتا کہ حضور میرے وجود پر چلتے ہیں... اُن کے پاؤں میرے بدن پر چلتے ہیں... اُن کی ہتھیلیاں حرکت کرتی ہیں اور مجھے ڈھارس دیتی ہیں... خاص طور پر وہ ہتھیلی جس کا عکس میرے ماتھے پر پڑتا ہے اور سر پر لہا پاں ہوتا ہے... تو حضور میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہیں کہ تم نے غم نہیں کرنا حوصلہ رکھنا ہے اس حیات میں... میں تمہارے ساتھ ہوں... جیسے اباجی میرے سر پر ہتھیلی رکھ کر پیار دیتے تھے ایسے حضور اپنی ہتھیلی میرے سر پر رکھ کر مجھے پیار دیتے ہیں... کندھوں پر جو ہتھیلی عکس ہوتی ہے وہ مجھے تھکتی ہے... میں بہت آہستگی سے میرا دایاں ہاتھ جہاں بھی ہے اُس کی ہتھیلی کو کھوتا ہوں جیسے وہ کانچ کی ہتھیلی ہو اتنی احتیاط سے کھوتا ہوں اور وہاں وہی ہے جو میرے من کی مراد ہے... میری ہتھیلی پر بھی اُن کی ہتھیلی کا ایک حصہ عکس ہو رہا ہے... اب میں دم روک لیتا ہوں... اس عکس کو بُت کی مانند ساکت ہو کر وہیں رکھتا ہوں... کیونکہ سانس لیتا ہوں تو بھی غدش ہے کہ وہ ذرا آگے پیچھے نہ ہو جائے... میں بہت آہستگی سے ہتھیلی بند کرتا ہوں تو وہ مٹتی پر عکس ہوتی ہے لیکن اُس کا بہت تھوڑا سا حصہ تو میں فوراً مٹھی کھول کر ہتھیلی پر پھیلا دیتا ہوں... بہت غور سے دیکھتا ہوں کہ حضور مٹی کی ہتھیلی کا جو عکس ہے کیا اُس میں اُن کی انگلیاں بھی الگ الگ نظر آتی ہیں اور اگر آتی ہیں تو کیا وہ مصری انگلیوں پر بھی سایہ کرتی ہیں... اور وہ کرتی ہیں... اُن انگلیوں پر جن میں قلم تمام کر لکھتا ہوں... خاص طور پر شہادت کی اُس انگلی پر جس کے پنجے کا ماس... مسلسل قلم کو گرفت میں لینے سے... لکھنے سے غلط ہو کر مردہ ہو چکا ہے... تو وہ پنج ٹائی اُٹھتا ہے... زندہ ہو جاتا ہے... مجھے تائید حاصل ہو جاتی ہے...

انہوں نے میرا ہاتھ تمام لیا ہے...

یہ نہیں کہ میں حضور کی ہتھیلیوں کے عکس کا ہی شیدائی بنا رہتا ہوں... مجھے اُن سے کہیں بڑھ کر اُن کے پاؤں کے نقش کی چاہت ہے... میں اپنے آپ کو دیکھ کر کہتا کہ وہ کہاں کہاں میرے بدن پر ہیں کوئی اور مجھے دیکھے تو بتائے کہ کہاں کہاں مجھ پر اُن کے نقش پڑے ہیں لیکن اس کے باوجود میں یہ

پہنیں کہ میں خوش نصیبی کی بادشاہت سے لطف اندوز ہوتا ہوا صرف انہی دنیا لوں میں کھویا رہا نہیں۔ میں ہمیشہ کی طرح اس جبل کی اونچائی اور دشواری اور اس کی چوٹی تک پہنچنے والے نکلے راستوں کے بارے میں اپنی کوہ نور دی کے تجربوں کو بروئے کار لا کر بہت حساب کتاب کرتا رہا۔

حضورؐ یہاں تک کیسے پہنچتے تھے؟

غار حرا کی جانب۔ جبل نور کے دوسرے رخ پر تو ایک عقیق کھائی ہے وہاں سے اوپر چڑھنا ناممکن تو نہیں لیکن مشکل اور پرخطر تھا تو ادھر سے نہیں۔ صرف ادھر سے۔ وادی مکہ کی جانب سے۔ اُس دامن سے جسے میں دیکھ سکتا تھا کہ وہاں کچھ رہنمایاں تھیں۔

تقریباً اسی راستے پر جواب بھی مستعمل ہے۔

پہاڑی راستوں کی خاصیت ہے کہ وہ مقامی لوگوں کے صدیوں کے تجربے سے وجود میں آتے ہیں۔ ہمیشہ ایک طے شدہ نسبتاً آسان اور کم پرخطر راستہ وجود میں آتا ہے۔ ایک انہی ان راستوں سے ہٹ کر کوئی مختصر راستہ اپنالے تب اسے احساس ہوتا ہے کہ نہیں۔ مجھے اسی مستعمل راستے سے آنا چاہیے تھا۔

تو حضورؐ وادی مکہ سے چل کر اس دامن تک پہنچتے ہوں گے اور اسی راستے کو اختیار کرتے ہوں گے جسے زائرین آج بھی اختیار کرتے ہیں۔

لیکن میرے اندازے کے مطابق۔ ایک فرق کے ساتھ۔

زائر تو درمیان میں پہنچ کر دائیں جانب مڑ کر اس کھلی جگہ پر پہنچتے ہیں جہاں سے جبل نور کے پار کی وادی نظر آتی ہے اور پھر بائیں ہاتھ پر چڑھتے ہوئے چوٹی تک پہنچتے ہیں۔

حضورؐ کو چوٹی پر نہیں۔ غار حرا تک پہنچنا ہوتا تھا۔ اس لیے غالب امکان یہی ہے کہ وہ اس مقام سے جہاں سے زائر دائیں جانب مڑتے ہیں وہ وہاں سے سیدھے بلندی کی جانب چڑھتے جاتے ہوں گے اور صحن اس مقام پر جہاں میں بیٹھا تھا۔ اس ٹک سرنگ کے دہانے پر آ جاتے ہوں گے۔ چوٹی سے اٹھیں کچھ غرض نہ تھی۔

پہلے حساب کتاب ہے کہ کوہ نور دی کے حساب سے۔ شاید یہ سراسر لفظ ہو اور وہ کسی اور رخ سے آتے ہوں۔ لیکن سب اشارے سب گمان یہی گواہی دیتے ہیں کہ ادھر سے ہی آتے تھے اور اس سرنگ تک پہنچ کر جان لینے تھے کہ غار اس کے اوپر ہے۔ یہاں پہنچ کر وہ اپنا سانس بھی درست کرتے

محسوس کر چکا ہوں کہ جہاں میں چاہتا تھا کہ وہاں ہوں تو وہ وہاں ہیں۔ میرے چہرے پر۔ میرے ہونٹوں پر۔ وہ مثبت ہیں ہونٹوں پر اور میرے رخساروں پر۔ اور میری آنکھوں میں اور جب میں ہلکیں جھپکتا ہوں تو میرے پونوں پر۔ اور نہ صرف میں اُن کے کوئل پاؤں اپنے چہرے پر محسوس کرتا ہوں بلکہ اُن پاؤں میں جو چپل ہے اور اُسے جہاں جہاں سے حضورؐ نے اپنے ہاتھوں سے گانٹھا ہے۔ تروپے لگائے ہیں۔ اُس دھاگے کی ہر گانٹھ اور تروپے کو میں اپنے رخساروں میں ثبت ہوتے محسوس کرتا ہوں۔ اگر جبل نور کا ہر پتھر اور ہر سنگریزہ حضورؐ کے نقش اور نشان نمایاں کرنے کا قصد کر لے تو ایسا ہی ہو۔

بے شک اس سے غار حرا کے واحد رکھوالے کے طور پر۔ جبل نور کی چوٹی کے نیچے بابا بنگالی کی گدڑیوں پر براجمان جب میں اُس پہاڑ پر نظر کرتا تھا تو وہ نیم تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اور جو کوئی بھی اُسے دیکھتا اُسے یہی نیم تاریکی نظر آتی لیکن میں اُس ایک نظر کے بعد جب دوسری نظر کرتا تھا تو مجھے اُس کے ہر پتھر پر سنگریزے پر حضورؐ کے نقش پا اور ہتھیلیوں کے نشان نمایاں ہوتے دکھائی دیتے تھے۔ بے شک یہ میرے تصور میں دیکھتے تھے لیکن تصوراتی نہ تھے۔ میں اگر یہاں تک اتنا ترڈو کر کے آیا تھا تو صرف اُن کے حوالوں سے آیا تھا۔ اگر اُن کے حوالے نہ ہوتے تو میں کیوں اتنی مشقت اور جان ماری کر کے یہاں تک پہنچتا۔ اگر ہمارے عقیدے میں بھی کوئی کوہ طور ہوتا۔ چلے یہ جبل نور ہی کوہ طور ہوتا اور اس کی بلندی پر وہ جلتی ہوئی جھاڑی ہوتی جس کی پوشیدگی میں سے یہ آواز آتی کہ تم ایک مقدس مقام پر ہو اپنے جوتے اتارو اور پھر اس احکام نازل ہوتے۔ تو کیا پھر بھی میں یہاں تک پہنچنے کے لیے اتنا ترڈو کرتا نہیں۔ میں اتنے رعب میں ہوتا اُس کی ذات کا دباؤ اتنا ہوتا کہ میں سہہ نہ سکتا۔ بے شک اُس کا رحیم اور کریم ہونا میری ہمت بندھا لیکن میں اُس کے جبر اور قہر کی تاب نہ لا سکتا۔ کبھی ادھر کا رخ نہ کرتا۔ یہ میرے تصور میں نہ آتا تھا۔ مجھ سے ماوراء بہت بلند ہر سو چھایا ہوا تھا۔ اُس کے سامنے میں ایک بے حیثیت ذرہ ہو جاتا تھا اور نہیں جانتا تھا کہ وہ اس ذرے پر کبھی نظر کرتا بھی ہے یا نہیں۔ میں نے ادھر کا رخ اس لیے کیا تھا کہ جو یہاں آیا کرتا تھا وہ کہتا تھا کہ وہ مجھ جیسا ہے کہ میں تم جیسا ہی ایک انسان ہوں سوائے اس کے کہ مجھ پر وحی اُترتی ہے۔ اور میں اُس کے سامنے جاتا تھا تو ایک ذرہ نہیں رہتا تھا۔ مجھے وہ آفتاب کر دیتا تھا۔ وہ دوست تھا اور یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں اُس دوست کی نشانیاں جبل نور کے ہر پتھر پر ہر سنگریزے پر نہ دیکھ سکتا۔ اُس کے بارے میں کسی شک شبہ کی گنجائش نہیں کہ وہ تھا۔ اور اُس کے بارے میں شک کرنا اگرچہ کفر ہے اور کفر ہی لیے ہے کہ شک سراٹھاتا ہے۔ وہاں تک میری پہنچ نہیں ہو سکتی۔

اور آنکھوں سے زوہبی کے آثار نمایاں نظر آتے ہیں۔۔
پلکیں لمبی اور سیاہ ہیں اور آنکھوں کی جھلیوں پر سیاہ تھلیوں کی مانند تیرتی ہیں۔ کبھی پرسمیٹھی ہیں
کبھی کھول دیتی ہیں۔۔

ناگ ستواں اور سیدھی ہے۔۔
میں اُس کے دانت جب نمایاں ہوتے دیکھتا ہوں جب ایک گہرا سانس لینے کی خاطر وہ اپنا
دھن وا کرتا ہے اور دیکھتا ہوں کہ دانتوں میں ریکیں ہیں جیسے باریک خط کھینچ دیا گیا ہو۔۔
واڑھی خوب گھنی ہے۔۔

مگر وہ لمبی ہے مگر خوبصورت ہے۔۔۔
 سینہ کشادہ۔ اور بدن کی رنگت کھلی ہوئی جس پر پسینے کے قطرے موتیوں کی مانند پھسلتے ہیں۔۔۔
 ہتھیلیاں نرم و گداز ہیں اور چپلیں میں کسے پاؤں بھی نازک لگتے ہیں۔۔۔
 بدن ذرا آگے جھکا ہوا۔ بے شک ایک جبل پر چڑھتے ہوئے ہر شخص ذرا آگے جھکا ہوتا ہے
 لیکن یہ شخص جب کھڑا ہوتا ہے تب بھی اُس کا بدن آگے جھکا ہوا لگتا ہے!۔۔۔

اور رفتار میں تیزی ہے مگر ہر قدم اپنی جگہ پر جم جاتا ہے۔۔
چہرے پر گہرے تفکر کی علامتیں دکھائی دے رہی ہیں۔۔
ایسا جاذب اور خوش چہرہ کوہِ پیا میں نے پہلے تو کبھی نہیں دیکھا تھا جو مضبوط بھی ہے اور اُس کا
سراپا کول بھی دکھائی دیتا ہے۔۔

وہ کوہ پیما سین میرے سامنے چڑھائی کے آخری پتھر کو تمام کراؤ پر پہنچ جاتا ہے۔۔
یہ تو میرے حضور ہیں۔۔
میرے سامنے کھڑے ہیں۔۔

میں منہ کھولے ایک فائر اعقل بچے کی مانند مسکراتا ہوا اُنہیں تکتا رہتا.. آنکھیں نہ جھپکتا.. میرا پتہ سارا آنکھیں ہوتا تو بھی میں کوئی ایک آنکھ بھی نہ بکتا.. ساری کھلی رکھتا.. اور جتنی لاکھ ہزاروں آنکھیں میری ہوتیں اُن میں اُن کا نور بھرتا جاتا اور میں بھی روشن ہو جاتا..

تو کیا اتنی روشنی کے باوجود بھی میں اپنی چھوٹی ٹارچ جلا کر اُن کے لیے اس سرنگ کے اندھیرے کو کم کرتا۔ بے شک اُن دنوں تو یہ ٹارچ ابھی ایسا دھبہ نہیں ہوئی تھی اور نہ اس کی کچھ حاجت تھی کہ ہاں کائنات بدن وجود سا روشنی تھا۔ میں اُنہیں کیا راستہ دکھاتا راستہ تو اُنہوں نے مجھے دکھانا تھا۔ اور اگر میں ٹارچ جلا کر سرنگ کے اندھیرے میں کچھ روشنی کرتا تو کیا وہ بھی میرے وجود سے

ہوں گے۔ فوری طور پر سرنگ میں داخل نہیں ہو جاتے ہوں گے۔
اور سانس درست کرنے کے لیے بھی یہی جگہ تھی۔ کھائی کے کنارے۔ جہاں بابا بنگالی کا چمپتر
تھا اور میں تھا۔

تو ان زمانوں میں نہ یہ چمپہر تھا اور نہ میں تھا..
اگر میں ہوتا.. تو کیا ہوتا..
اگر چہ میں کیسے ہو سکتا تھا.. لیکن ہوتا تو کیا ہوتا..

میں یہاں اس سرنگ کے دہانے پر راکھی کرتا دیکھتا.. دیکھتا کہ دامن میں سے ایک مضبوط بدن کا کوہ پیما ہمت والا.. اپنے کاندھوں پر کھانے پینے کا کچھ سامان اٹھائے ایک تھیلے میں.. اور اس تھیلے کے نیچے اُس کے شانے ہیں اور ایک مہر ہے.. وہ چڑھتا چلا آتا ہے اور بہت کم سانس درست کرنے کے لیے رکتا ہے.. اگر رکتا ہے تو پیچھے مڑ کر جبل کے دامن کو دیکھتا ہے جہاں ایک تنہا خیمہ ہے.. اور اُس خیمے کے باہر اُس سے لاڈ کرنے والی اُس کی بیوی خدیجہ فکر مندی میں مبتلا کھڑی اوپر دیکھتی ہے.. شاید اُن کی سب سے چھوٹی بچی فاطمہ بھی اپنی اماں کے برابر میں اُن کا لبادہ تھامے اپنے بابا کو اُس بلندی پر چڑھتے دیکھتی ہے اور اُس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ بابا اوپر کیا کرنے جاتے ہیں..

اور جب وہ مضبوط بدن چوڑے شانوں والا کوہِ پیا جبل پر چڑھتا.. میرے قریب آ جاتا ہے وہ اپنے دھیان میں چڑھتا آ رہا ہے اس لیے ابھی میں اُس کی نگاہ میں نہیں آیا لیکن میری نگاہ میں تو اُس کے سوا اور کچھ نہیں.. میں اس کے سراپے نین نقش اور قد بُت کو نحویت سے دیکھ رہا ہوں اور اوپر اپنی جانب آتے دیکھ رہا ہوں کہ وہ مضبوط کوہِ پیا کھدر کے کرتے اور تہبند میں بلبوس ہے اور اونٹ کے سخت چمڑے سے بنی ہوئی چپلیں پیوند زدہ ہیں اور گانٹھی گئی ہیں..

خوب رو محض ہے..
بوٹا ساقہ ہے جو کہ پیانکی کے لیے انتہائی موزوں ہے..

اُس کے بڑے سر پر سیاہ گھنگھریالے بال ہیں جن میں پسینے کی نمی ہے اور کچھ بال کشادہ جیوں پر بکھرے ہوئے ہیں۔
 جنوئیں تنیدہ ہیں اور بالوں سے بھری ہوئی ہیں۔

اور دونوں بھتیوں کے اندرونی کہنا سنا ایک دوسرے سے بدست ہیں۔
اور کسی سحر کر دینے والی سیاہ اور بڑی بڑی آنکھیں ہیں جن کی سیاہی کے بعد لہجہ تکلی ہوئی
تغییری اور غیری کا سحر سحر کا سحر ہے۔

جہیں پہلے بھی نہیں دیکھا۔ میں جہیں پہچان نہیں پا رہا۔ کون ہو؟
میں اپنی چھوٹی تاریخ گرفت میں لیے۔ ان سے چھپائے شرمندہ سا کھڑا رہتا۔ اور ہر کچھ نہ
سوچتا تو کہتا۔ آپ کیسے مجھے پہچان سکتے ہیں بابا۔ آپ نے کبھی مجھے دیکھا ہی نہیں۔ بابا آپ کی ڈاچی
قصوی جو میرے وجود کی گلیوں میں چمن چمن کرتی گزرتی ہے میں اس کے پیچھے چلنے والا اس کی جینگلیاں
سیٹنے والا ہوں۔ آپ نے مڑ کر کبھی دیکھا ہی نہیں اس لیے آپ پہچان نہیں رہے۔ میرے اس تپتی تھیلے
میں منسل وائر کی بوتلیں ہیں۔ کھجوریں اور سینڈویچ ہیں۔ دودھ ہے۔ اور ایک سیب بھی ہے۔ تو میں نے
سوچا کہ آپ کو تو بھوک پیاس کا دھیان ہی نہیں رہتا۔ میں ذرا دھیان رکھوں۔ کچھ ٹیش کروں۔
تو شاید وہ کہتے۔ ذرا نیچے جبل نور کے دامن میں دیکھو وہاں اونٹ کے سیاہ بالوں سے بنا ہوا
بوسہ نظر آ رہا ہے اس میں تمہاری ماں خدیجہ مقیم ہیں۔

ہاں سر۔ میں نے انہیں دیکھا تھا۔ وہ خیمے سے باہر فکر مندی اور تشویش کی حالت میں آپ کو
دیکھ رہے تھے۔ اچھا دیکھ رہی تھیں۔ جوئی آپ یہاں پہنچے ہیں تو وہ خیمے کے اندر چلی گئی ہیں۔ میں دیکھ رہا تھا۔
لیکن بابا یہ تھوڑی سی خوراک تو آپ رکھ لیں۔
تم پوری بات نہیں سنتے۔ وہ خفا نہیں ہوتے میری سادگی پر مسکراتے ہیں۔ خدیجہ کے ہمراہ
میری مضمیٰ بی بی فاطمہ بھی ہے۔ اُسے مکہ میں کس کے پاس چھوڑ کر آتے وہ بھی اپنی ماں کے ساتھ چلی
آئی ہے۔ تو کبھی کوئی خادم میرے لیے کھانے پینے کا سامان لے کر ادھر آتا ہے اور غار کے باہر رکھ جاتا
ہے۔ اور کبھی فاطمہ اصرار کرتی ہے کہ بابا کا کھانا میں لے کر جاؤں گی۔

اس پر میں بہت حیرت کا اظہار کرتا ہوں۔ بی بی فاطمہ تو بس بالڑی سی ہیں۔ چھوٹی سی ہیں تو
مطہرہ کیسے کھانا اٹھا کر اپنے کول ملوک اکبر سے ناقواں جتنے کے ساتھ اس بلندی تک آتی ہوں گی۔
اس لیے کہ وہ کائنات بھر میں سب سے زیادہ مجھ سے پیار کرتی ہے۔ وہ کہتے۔
اسی لیے تو آئندہ برسوں میں جب میں اسے ایک خبر سناؤں گا تو وہ رووے گی اور جب ایک
اور لوہو دوں گا تو وہ ہنسنے لگے گی۔ خبر اپنے رخصت ہو جانے کی اور نوید یہ کہ فاطمہ سب سے پہلے تم میرے
باس آؤ گی۔ بابا یہی کہتے۔

تو میں بی بی فاطمہ کے سامنے کہاں ٹھہر سکتا تھا۔

لیکن پھر بھی روہ نہ سکا۔ اپنی مخلوط الحواسی کا بہاد کرتا ان سے کہتا۔ بابا نہ میں مومن ہوں
نہیں میں اور نہ میں کافر ہوں مگر میں تمہیں جانتا کہ میں کون ہوں۔ یہ جانتا ہوں کہ آپ
کی اپنی قصوی کی جینگلیاں سیٹنے والا ہوں۔ آپ نے مڑ کر کبھی دیکھا ہی نہیں تو سیٹنے سے باز آ لے

غافل اس سعودی جوڑے کی مانند میرا شکریہ ادا کر کے مجھ سے کچھ کہے بغیر اندر چلے جاتے۔
اگر ان زمانوں میں۔ میں یہاں اسی مقام پر بیٹھا ہوتا تو کیا ہوتا۔

وہ قدرے حیران تو ہو جاتے کہ یہ کون ہے۔ اس حرا کے گھر کے باہر اس بلند تہائی پر جہاں
میرے شب و روز گزرتے ہیں جہاں میں کائنات کے نقشے اور نظام اپنے ذہن میں اتار کر اپنے دھیان
میں گم کچھ سمجھنے اور سلجھانے کی سعی کرتا ہوں۔ سوال کرتا ہوں اور جواب کا منتظر ہوں تو یہاں اس سرنگ
کے داخلے پر یہ کون ہے۔ کہاں سے آ گیا ہے۔ پہلے تو یہاں کوئی نفس نہ تھا۔ یہ کون ہے جو دور کے شہروں
سے آیا لگتا ہے۔ ایک رنگ برنگ تھیلا گود میں رکھے۔ چھدرے سفید ہو چکے بالوں چوڑے ماتھے اور نیم
سرخ میں ڈوبی ہوئی آنکھوں والا بھٹا سا بوڑھا حواس باختہ مسکراتا مجھے تنکنا کہاں سے آ گیا ہے۔
وہ ضرور حیران ہوتے۔

رُک جاتے۔ کچھ دیر ٹھہر جاتے۔ میرے قریب کھڑے ہو جاتے۔

اور اگر وہ ٹھہرتے۔ اور کھڑے ہوتے تو میں یونہی بابا بنگالی کے چھتر تلے گدڑیوں پر بیٹھا تھوڑا
رہتا۔ کھڑا ہو جاتا۔ اگر چہ ان کا قد تقریباً میرے جتنا ہی ہے لیکن وہ مجھ سے کہیں دراز قامت لگتے۔ اور میں
مسرت اور سنائے کے اُسی اظہار میں منجھد منہ کھولے مسکراتا۔ منہ اٹھا کر انہیں دیکھتا۔ کہ وہ مجھ سے کہیں
بلند قامت والے ہوتے۔ میں سر اٹھائے اپنے اوپر ایک سائبان کی صورت دیکھتا اور میرے بدن کو بہت
آرام ملتا۔

وہ میرا حال جان جاتے۔ میرے حال کے محرم جو تھے۔ جان جاتے کہ یہ بندہ مجھے دیکھ کر
حواس کھو بیٹھا ہے اگر چہ سیر کا رہے لیکن مجذب ہو چکا ہے۔ مجھے دیکھ کر۔ اگر میں نے اس سے بات نہ کی
تو یہ قیامت تک یونہی منہ کھولے مسکراتا رہے گا۔

تو وہ کھڑے ہو جاتے اور میرا حال احوال دریافت کرتے۔

وہ اگر چہ میرا حال بھی جانتے تھے اور احوال سے بھی خوب ہی واقف تھے لیکن بھولے بن کر
پوچھتے کہ کیسے ہو۔ بچوں کا کیا حال ہے اور خاص طور پر بیٹی کا پوچھتے کہ وہ کیسی ہے۔ طواف کے دوران وہ
باد آگئی تھی تو اتنا کیوں روئے تھے۔ میں اگر کچھ کہتا تو بھی کہتا کہ بابا بیٹیوں سے لڑ پیار کرنے کی ریت
بھی تو آپ ہی نے ڈالی ہے۔ بی بی فاطمہ سے کیوں اتنا پیار کیا تھا۔ لیکن میں چپ رہتا۔ وہ کہتے رہے

اور پھر یقیناً پوچھتے کہ تم کب سے اس سرنگ کے رکھوالے ہوئے ہو۔

میں اگرچہ ہندو تھا تو میں کیا جواب دے سکتا تھا۔

ایک گھونٹ بھرا تھا۔

اور جیسا کہ ایک بار بابا نے دودھ کے ایک پیالے میں سے ایک گھونٹ بھرا تھا اور ان کے بعد سب صحابہؓ نے اسی پیالے سے سیر ہو کر اپنی بھوک بجھائی تھی اور پھر بھی وہ پیالہ لبریز رہا۔ اسی طور اُس شب میری بوتل کا دودھ بار بار گھونٹ بھرنے سے بھی ختم نہ ہوا۔ اور اُس نے سپیدہ سحر تک میرا ساتھ دیا اور آخری قطرے ابو ہریرہ کی ایک بلی کے کام آئے۔

مجھے ان زمانوں سے واپس لے آئیں وہ کھٹی گھٹی آوازیں اور ان کی گونج جو سرنگ کے اندر طر کرتی تاریکی میں مجھ تک آنے لگیں۔ وہ سعودی نوجوان جو کچھ دیر پہلے اپنی بیوی کے ہمراہ اندر گیا تھا اور اتنی دیر میں میں نے زمانوں کی سیر کر لی تھی سنبھلتا۔ احتیاط کرتا پہلے باہر آیا اور میں نے اس دوران اپنی اہلی سراجام دی اور نارنج کی روشنی اُس کے لیے مہیا کی۔ وہ دراز قامت تھا اور مجھ سے بھی کتلیا لڑپٹا تھا تو اسے سرنگ کے پتھروں میں سے گزرتے ہوئے یقیناً دشواری ہوئی ہوگی اور باہر آتے ہی اُس نے الطینان کا ایک گہرا سانس بھرا۔ اور فوراً ہی اُس کی سیاہ پوش پردہ پوش بیوی بھی برآمد ہوگئی۔

نوجوان میرے قریب رُکا اور میں اندازہ کر سکتا تھا کہ وہ میری خدمت کے عوضانے کے طور پر کچھ عیش کرنے کو ہے۔ اور پھر شاید اس نے میرے چہرے پر صدقہ اور خیرات وصول کرنے والوں کی کلیتہً نہ دیکھی تو مجھ سے باتیں کرنے لگا۔

میں نے کچھ اپنے بارے میں بتایا اور یہ بھی بتایا کہ سرنگ کا اصلی رکھوالا غسل کرنے گیا ہے اور میں اُس کی جگہ ڈیوٹی دے رہا ہوں۔ ویسے بعد میں مجھے خیال آیا کہ اگر وہ مجھے کچھ رقم عطا کر دیتا تو اچھا ہوتا۔ کیسی زبردست کمائی ہوتی۔ حضورؐ کے گھر کا راستہ دکھانے کا جو معاوضہ ملتا ویسا معاوضہ کبھی کسی کو ملا؟

اُس سعودی کی انگریزی اتنی ہی رواں اور زبردست تھی جتنی کہ میری عربی اور اس کے ہاؤس جو ہم نے کچھ گفتگو کر لی۔ اس دوران وہ بڑے بڑے براؤن یا سیاہ رنگ کے مار موٹ یا نیولے جو کچھ بھی مجھے گھائی میں سے اوپر آ کر میرے قدموں کے قریب ہے خطرہ لٹنیاں لگانے لگے۔ تو میں نے سعودی سے اُن کے بارے میں پوچھا کہ کیا جانور ہیں۔ اُس نے عربی میں جو نام بتایا میں نے اُسے بار بار دہرا کر اپنے تئیں یاد کرایا کہ ان کا حوالہ دوں گا لیکن وہاں سے اتر گیا ہے۔ البتہ یہ یاد ہے کہ اُس مرد عرب نے اُن کا نام لہانتِ رطبت سے لیا اور پھر کہنے لگا۔ حرام۔ حرام۔

ظاہر ہے کہ اُسے اساتذہ سے جو کچھ بھی تھا اسے کرپا نظر نہ آئے تو حلال کیسے ہو سکتے تھے

والا نہیں۔ نہ ہی میں یہ کام کسی غرض سے کرتا ہوں۔ تو آپ کچھ تو کرم کیجیے اور میرے تھیلے میں سے کچھ لے لیں۔ یہ میں نے کھمنڈو کے تھمل بازار سے خریدا تھا ایک تھنی حسینہ کی دکان سے اور اس میں ایک پیپسی بھی ہے۔ شاید آپ پسند فرمائیں۔ سگریٹ تو آپ نہیں پیٹے ہوں گے۔ ویسے وہ بھی لایا ہوں۔ اور جناب کھجوریں بھی ہیں۔ اُن میں سے ایک تو کچھ لیجیے پلیز۔

یہ اجوی ہے جو میرے منہ میں کھلی جاتی ہے؟ وہ قبول کر لیتے۔

تو میں کہتا۔ پتہ نہیں سرکار میری بہو نے جدہ کی ایک سپر مارکیٹ سے یہ کھجوریں خریدیں

تھیں۔

خوش قسمت ہو کہ تمہاری بہو بھی ہے۔ میرے قاسم طیب اور طاہر تو جو آئے اور ابراہیم جنہوں نے ابھی آنا ہے انہوں نے مجھ سے کچھڑ جانا ہے۔ وہ زندہ رہتے تو کبھی نہ کبھی میرے حجرے میں بھی ایک بہو کے قدم آتے۔ وہ رنجیدہ ہو جاتے ہیں۔

اور میں موضوع بدلنے کی خاطر کہتا ہوں۔ جناب کھجور کے بعد دودھ کا ایک گھونٹ بھرنا تو لطف دیتا ہے۔ یہ دیکھئے امریکی کمپنی کا پیک شدہ خالص دودھ ہے۔ جیل نور کے دامن میں جو سنور ہے وہاں سے خریدا تھا تو بہت سرد تھا لیکن اب نیم گرم سا ہو گیا ہے۔

تو وہ میرا دل رکھنے کی خاطر ایک گھونٹ تو بھر ہی لیتے۔

اگر میں اُن زمانوں میں ہوتا۔

تو اپنے بابا کو اس تنہائی میں سامنے پا کر جو کچھ میں کہتا اور سنتا۔ اُس کی تفصیل بیان کرنے پر آ جاؤں تو جب تک سانس ختم نہ جائے اور جب تک کہ دنیا بھر کے سمندروں کی روشنائی کا آخری قطرہ میرے قلم میں قیام کرے۔ میں بیان کرتا چلا جاؤں۔

میں اُن زمانوں میں نہیں تھا۔ لیکن تھا۔ بابا کی موجودگی زمان و مکاں کی قیود سے ماوراء عشق کے محلوں میں ہمہ وقت ہے۔ یہ محض تصور کی کرشمہ سازیاں نہیں۔ انسان اگر عشق کے اُن محلوں میں داخل ہونے کا صدق دل سے آرزو مند ہو تو سب در کھلے ہیں۔ لیکن ان کے اندر عبادت کے تکبر والے اور گھٹن میں پابند لوگ نہیں جاسکتے۔ صرف اُن کے لیے در کھلے ہیں جو نہیں جانتے کہ وہ مومن ہیں یا کافر۔ شرط یہ ہے کہ قصویٰ کے پیچھے پیچھے چلنے والوں میں سے ہوں۔

یہ بے شک ایک واقعہ ہو سکتا ہے اور اس کا جواز آسانی سے تلاش کیا جاسکتا ہے لیکن اس رات جب بھی میں نے دودھ کی اس بوتل کو منہ لگایا۔ اُس پر اپنے لب جمائے تو میرے لب جیسے سن ہو گئے ہوں۔ اُن میں جان کر رہی ہو کہ مجھے یہ احساس ہو گیا تھا کہ ابھی کچھ دیر پہلے اُن نے اسی بوتل سے

”اُن کو مارتا نہیں صرف پکڑتا ہے.. ادھر سے زندہ لے کر جاتا ہے اور عرب ادھر نہیں لھاتا.. طائف اور جدہ میں جا کر ذبح کرتا ہے.. ان کو پکاتا ہے تو بہت بُوا کرتا ہے.. صرف ہم کو بُوا کرتا ہے عرب کو نہیں آتا..“

بابا بنگالی اپنی متعدد نارچوں کے سِل چیک کرنے لگا.. جن کے سِل کمزور پڑتے محسوس ہوتے ان میں سے سِل ڈال کر نارچ کو روشن کر کے سرنگ کے اندر روشنی ڈالتا.. میں خاموش بیٹھا رہا.. شہروں کی ماں مکہ سے اوپر آنے والی روشنی میں چہرہ روشن کیے.. فروغ سے سے نہیں فروغ کعبہ سے روشن کیے..

بابا اپنی بیٹری چینگ سے فارغ ہوا تو کہنے لگا ”گار میں نہیں جائے گا.. ابھی تو ادھر ہالکل کھالی پڑا ہے.. کوئی نہیں.. جائے گا..“
 ”نہیں نہیں جائے گا..“
 ”کچھ پڑھے گا نہیں..“
 ”نہیں..“

بابا میرے یوں منکر ہونے پر کچھ حیران ہوا..
 ”لوگ ادھر پڑھنے آتا ہے گار فُل ہوتا ہے.. گار خالی ہے تو تم کیوں نہیں پڑھتا..“
 ”جو یاد تھا پڑھ لیا.. اور کچھ یاد نہیں..“
 ”تو ہار بار پڑھ لو.. کیوں نہیں پڑھتا..“
 میں نے سوچا اب انکار کیا تو شاید بابا ناراض ہو جائے اور مجھے اپنے مچھر سے بے دخل کر دے چنانچہ میں نے اُسے دل کی بات بتادی ”بابا مجھے اکیلے اندر جاتے ہوئے ڈراتا ہے..“
 ”ڈرتا ہے..؟“

”ہاں.. جان لگتی ہے ادھر تنہا جانے سے..“
 ”دیکھو ڈر کا کوئی بات نہیں.. ادھر ہمارا گھار ہے.. ادھر ہم بہت سالوں سے رہتا ہے اور ادھر کوئی خطرہ نہیں.. میرا بڑا والا نارچ لے جاؤ رات کو دن کرے گا..“
 ”ہاں بابا جی.. ڈر پاک مانو ہوں بابا.. ادھر گار میں کوئی نہیں.. صحن میں اندھیرا ہے تو.. ادھر جہاں اہل اترتے تھے.. میرے حضور بیٹھتے تھے.. میں اتنی رات میں اکیلا کیسے ادھر جاؤں.. آپ میرے ساتھ چلو صرف تھوڑی دیر کے لیے.. میں دو لعل پڑھ لوں گا.. پھر دونوں واپس آ جائیں گے..“
 بابا نور اللہ نے ہاں ناں میں کچھ جواب نہ دیا.. اس کے لیے اس سرنگ کے آخر میں محض

لیکن اُس نے فوراً ہی ایک اضافہ کیا.. ”یہ.. ادھر مکہ میں حرام.. مگر جدہ.. طائف.. ریاض میں حلال حلال..“

یہ منطق میری سمجھ میں نہ آئی.. جانور یا تو حرام ہوگا یا حلال.. یہ تو نہیں لاہور میں حرام ہے اور پشاور میں حلال ہے.. پھر اُس نے جو توجیہ دی اُس سے کھلا کہ ایسا ہی ہے.. اگرچہ اس کے لیے شہر سعودی عرب کے درکار ہیں پاکستان کے نہیں.. جو کچھ اس نے اشاروں.. انگریزی.. عربی کی ٹوٹ پھوٹ میں کہا اس کا سلیس متن یہ تھا کہ یہ بڑا چوہا نیولا یا مار موٹ جو ہے ادھر مکہ میں اور اس کے نواح میں حرام ہے کیونکہ یہ حرم کا علاقہ ہے اور یہاں کسی جاندار کی جان نہیں لی جاسکتی.. ورنہ ہے یہ حلال اور کھایا جاسکتا ہے..

میں اگر بھوک کی وجہ سے مرنے کو ہوتا تو شاید پھر بھی ایک گدھا وغیرہ تو مجبوراً کھا جاتا لیکن اس نیولے کو ہرگز نہ کھاتا.. مر جاتا لیکن نہ کھاتا لیکن عرب کھاتے ہیں اور چٹخارے لے کر کھاتے ہیں امر عرب نے بھی چٹخارہ لے کر ہی اظہار کیا کہ کیا بتاؤں کیسا لذیذ ہوتا ہے.. اُس نے ”لذیذ“ کا لفظ بہت بار دوہرایا.. اور اس دُکھ کا بھی اظہار کیا کہ شوق سے کھاتا ہوں لیکن یہ کہاں روز روز نصیب ہوتا ہے.. وہ جوڑا رخصت ہو گیا..

اب میں پھر تنہا تھا.. لیکن اس تنہائی کی مدت طویل نہ تھی بابا نور اللہ سیر حیوں سے اُترتا ہشاش بشاش کچھ پڑھتا ہوا یا گنگناتا ہوا نیچے میرے پاس آ گیا.. اور اُس کی واپسی سے مجھے سٹے کی ایک دن کی بادشاہت کا اختتام ہو گیا..
 ”گسل کر آیا بابا.. میں نے پوچھا..“
 ”ہاں بچا آ گیا..“
 ”پانی کافی تھا؟“

”ہاں پون بول تھا.. اُس میں سے بھی تھوڑا بچا کر لایا ہے.. خوب غسل کیا..“
 بابا بنگالی سے بھی میں نے اُن بڑے چوہوں کے بارے میں استفسار کیا تو وہ کہنے لگا ”ہم تو نہیں کھاتے.. عرب بہت کھاتا.. ادھر کا کچھ لوگ ان کو پکڑتا ہے اور عرب لوگ کو بیچتا ہے.. پندرہ بیس ریال میں ایک چوہا بیچتا ہے..“

ایک گارتھی وہاں کون اترتا تھا کون بیٹھا کرتا تھا اسے اس سے کچھ سروکار نہ تھا۔ یہ روزگار کا ایک وسیلہ تھا۔ اور طویل قربت عقیدت کو مٹا بھی دیتی ہے۔

میں نے ایک اور کوشش کی ”بابا! آپ میرے ساتھ چلو۔ مہربانی۔“

”چلے گا۔ ابھی نہیں پھر چلے گا۔“ اس نے مجھے ٹر خا دیا۔

نیا زکو گئے ہوئے بہت دیر ہو گئی تھی۔

”بابا یہ نیاز اور نہیں آیا اب تک۔“

”آجائے گا۔ نہیں آئے گا تو سو جائے گا نیچے کہیں۔“

یہ میرے لیے بہت بری خبر تھی۔

”وہ آپ کا کھانا بھی تولائے گا۔“

”نہیں لائے گا تو ہم بھی سو جائے گا۔ کل کھائے گا۔“

چنانچہ یہ ارادہ مصمم کر لیا کہ اگر نیاز نہیں لوٹتا تو میں اکیلا تو گار میں جانے کا نہیں۔ بابا بنگالی

سے چپکار ہوں گا۔ جہاں یہ جائے گا ہم بھی ساتھ ساتھ جائے گا۔

اتنی دیر میں شہر مکہ سے صدائیں آنے لگیں۔ ایک دل کو چھو لینے والا ترنم بلند ہونے لگا۔
اللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔ یہ صدائیں اس نو میں لپٹی ہوئی ہم تک آنے لگیں جو ہمارے چہروں پر تھی۔ یہ اذان خانہ کعبہ کی تو نہیں تھی۔ شہر مکہ کی سینکڑوں دیگر مساجد سے اٹھنے والی اذانوں کی مشترکہ سمفنی تھی۔

”نماز پڑھے گا۔“

”ہاں جی۔“

”گار میں پڑھے گا۔“ یہ اس نے صرف مجھے چھیڑنے کی غرض سے کہا۔

”نہیں جی۔“ میں مسکرانے لگا۔

”تو اوپر آ جاؤ۔ اوپر ہوا ہے۔“

بابا بنگالی کے پیچھے سے اٹھ کر اپنا جتنی تھیلا سینے سے لگائے میں اس بابا کے پیچھے پیچھے بیڑیاں چڑھتا جبل نور کے بلند ترین مقام پر آ گیا۔

چوٹی پر ایسا وہ مجھ پر اب بھی دیران پڑا تھا۔

صرف ہم دونوں تھے۔

چوٹی پر ایسا وہ مجھ پر اب بھی دیران پڑا تھا۔

سینٹ کا بنا ہوا ایک چوکور تھڑا تھا۔ 10X10 کے قریب۔ یہ تھڑا اس مختصر مسجد کے فرش کی یادگار تھا جو ترکوں نے اس مقام پر تعمیر کی تھی اور جسے ڈھا دیا گیا تھا۔ درود یوازہ کا نشان نہ تھا۔ فرش ہنوز باقی تھا۔ جیسے امارے پرانے مکانوں کے سیاہ ہو چکے پکے سینٹ کے فرش ہوا کرتے تھے۔ چوکور تھڑا ایسا تھا۔

مختلف مساجد سے بلند ہونے والی اذانوں میں تھوڑا بہت وقت تھا اس لیے یہ صدائیں اب اکٹھے بلند ہوتی ہم دونوں جبل نور کے تنہا کینوں تک مسلسل آ رہی تھیں۔

چونکہ اتنی باقاعدگی سے مسلسل نمازیں ادا کرنے کا کبھی اتفاق ہی نہیں ہوا تھا اس لیے لعل لالہ اور سنت فرض کے حساب کچھ آگے پیچھے ہو جاتے تھے تو میں نے نور اللہ سے پوچھا ”بابا عشاء کی نماز میں کتنے فرض ہیں؟“

”نہیں جانتا۔“ وہ اپنی بنیان میں ہاتھ ڈال کر نہایت سرشاری سے توند کھار ہا تھا۔

”نہیں جانتا۔“

”وہ فرض ہے اور بس۔“

”بابا مجھے تو کچھ یاد آتا ہے کہ چار فرض ہیں۔“

”ہاں چار ہے۔ پر تم سفر میں ہوں تو قصر ہے۔ اس لیے دو فرض ہے۔“

”میں تو سفر میں نہیں ہوں۔ جدہ سے آیا ہوں۔“

”جبل نور چڑھ کر ادھر آیا ہے نا تو اس سے بڑا کیا سفر ہوگا۔ دو فرض۔“

”میں اگر چار پڑھ لوں تو کوئی حرج ہے۔“

”نہیں۔“ وہ پہلی بار کچھ غصے میں آ کر بولا ”قصر ہے۔ صرف دو پڑھ۔“

میں ابھی اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ بابا نور اللہ نے ترکوں کی مہار شدہ مسجد کے فرش پر کھڑے ہو کر نماز پڑھی۔ فارغ ہوتے ہی فرش کے جس کنارے سے گھائی گرتی تھی وہاں لیٹ کر چند لمحوں میں اسی سہ سادہ ہوا اور خراٹے لینے لگا۔

اب اس منظر کی ایک مختصر تصویر بنانے کی اجازت ہو تو یہ تصویر کچھ یوں بنتی ہے کہ وادی مکہ کی بلند ترین چوٹی جبل نور پر ہم دونوں۔ میں اور بابا نور۔ نہ صرف چوٹی پر بلکہ اس پہاڑ کے پورے وجود پر صرف ہم دونوں فرد ہیں۔ اور یہاں بھی اس مقام پر بھی مکہ کی روشنیاں ہمارے چہروں پر چراغاں کرتی ہیں۔ اور بابا نور غسل کے مڑے لوٹ کر نماز عشاء ادا کر کے اس تھوڑے کے عین کنارے جہاں سے گھائی اُروج ہوتی ہے وہاں سہ سادہ تختہ میں گم ہے بلکہ خراٹے بھی لے رہا ہے۔

تو میں کم از کم جاگنے والوں میں تھا ہوں۔

اُس پکے 10X10 فٹ کے چوکور تھڑے پر کھڑا ہوتا ہوں۔

میرا خیال ہے کہ میرا وضو اب تک قائم ہے مگر کچھ پتہ نہیں۔ زیادہ کھوج بھی نہیں کی کہ پانی کیا اب تھا اور تیمم کا کچھ تجربہ نہ تھا کہ کیسے کیا جاتا ہے۔

کھڑے ہو کر میں کانوں کو چھوتا ہوں۔ ہاتھ باندھتا ہوں۔ نیت کرتا ہوں کہ منہ دل کعبہ شریف۔

اور کعبہ شریف میرے سامنے ہے۔

بالکل سامنے تو نہیں۔ کہیں نیچے۔ اور جبل نور سے دور شہر کی روشنیوں میں ایک کھلونا۔ ایک ماڈل۔ ایک مٹی ایچر تصویر۔ ایک جادوگری کوہ قاف کے دامن میں واقع ایک ناقابل یقین سحر کی صورت نظر آ رہا ہے۔ آنکھ کا دھوکا۔ ابھی ہے ابھی آنکھ جھپکو تو پھر نہ ہوگا۔

اور کیا واقعی منہ دل کعبہ شریف ہے؟ نہیں۔ ہرگز نہیں۔ زندگی میں پہلی بار نہیں کہ سامنے دیکھتا ہوں تو سیاہ آسمان ہے۔ جس پہاڑ میں غار ثور ہے رات کی سیاہی میں اُس کا ایک موہوم سا وجود نظر آتا ہے۔ کعبہ تو بہت نیچے ہے۔ سامنے نہیں ہے۔ میری نگاہ سینٹ کے فرش پر پڑتی ہے اور ہاں سے نیچے گرتی واوی مکہ کی روشنیوں کے درمیان خانہ کعبہ کے حرکت کرتی ہے۔ وہ سامنے نہیں۔ بہت نیچے ہے۔ تو اس تصویر میں۔ جبل نور کے کل وجود پر صرف میں ایک تنہا شخص ہوں جو ہاتھ باندھے کھڑا ہوں۔

نہ مجھ پر رقت طاری ہوئی کہ کہاں یہ مقام اور کہاں میں اللہ اللہ۔ نہ آنسو ہے۔ نہ اپنی خوش بختی پر نازاں ہوا اور نہ ہی گناہوں کے دھلنے کا کچھ احساس ہوا۔ البتہ اُس رات کی بلند تہائی میں یہ جی چاہا کہ یونہی اس منظر میں کھڑا رہوں۔ یہ فرض کبھی اختتام کو نہ پہنچیں۔ ابد تک کھڑا رہوں۔ اس کیفیت کا لطف لیتا رہوں۔ لیکن کہاں تک طول دیتا؟ بالآخر سلام پھیرا اور پھر کھڑا ہو گیا۔ مبہوت اس منظر کو اپنے اندر اتار رہا۔ کہ مجھے عمر خضر ملنے کا امکان تو ہو سکتا تھا ایسی تہائی اور یہ منظر دوبارہ ملنے کا امکان نہیں ہو سکتا تھا۔

اسے جی بھر کے بھی نہیں دیکھا جاسکتا تھا۔

جی کیسے بھر سکتا تھا۔

میں نے پہلی بار محسوس کیا کہ میری پٹلیاں اور شانے احتجاج کر رہے ہیں۔ بے چینی سے پٹلیاں کڑوٹ لیتی ہیں اور شانے درد کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کھلے مانس کھلے آکر یہاں کھٹے سے تم لے آؤ۔ لیکن کہاں میں جلا کر کھا ہے۔ دامن سے چوٹی تک جبل نور کی ٹھن چڑھائی ہم سے کراہی پھر

گھن میں کھڑے رہے۔ کبھی سرنگ کی چوکیداری کروائی گئیں ہاں قاعدہ سستانے کا موقع ہی نہیں دیا۔ واقعی کھاد کے بارے میں سوچنے کا موقع ہی نہ ملا تھا اور اب جا کر جو احساس ہوا تو بدن پتھر کا لگنے لگا ہوا چرنا مناسب یہی جانا کہ کچھ دیر کے لیے استراحت فرمائی جائے۔

میں نے بابا بنگالی کے تتبع میں اُسی تھڑے کی دوسری جانب۔ یعنی بابا تو کھائی کے کنارے نیند کرتا تھا اور میں تھڑے کی دوسری جانب جس کے برابر سے راستہ نیچے جاتا تھا وہاں اپنا تہتی تھیلا سر کے نیچے رکھنے کے طور پر جما کر لیٹ گیا۔ سینٹ میں ہلکی سی ٹھنڈک تھی۔ اور ایسے رخ پر لینا جہاں سے کعبہ کا ردھل کھلونا روپ آنکھوں کے سامنے موجود رہتا تھا۔ اب آنکھیں بند کون کرے۔ سوچا کھلی آنکھوں کے ساتھ بھی تو استراحت فرمائی جاسکتی ہے۔

لیکن اب یہ تھا کہ وہ چوہے یا مار موٹ مجھے استراحت فرمانے نہ دیتے تھے۔ کبھی میرے پاؤں کو چھوتے۔ انہیں سو گھٹے کھسر پھسر کرتے گزر جاتے۔ اور کبھی اُس چٹان پر گھٹے جو غار حرا کے صحن سے نظر آتی ہے۔ اور کبھی میرے اور بابا جی کے درمیان تھڑے پر قلابازیاں لگنے لگتے۔

یوں لینے سے ایک اور مسئلہ بھی درپیش ہوا۔ عام زندگی میں تو اتنا خیال کبھی نہیں رکھا لیکن اب نانی جان حیات تھیں تو خیال رکھنا پڑتا تھا کہ وہ ڈانٹ دیتی تھیں کہ ہائے ہائے قبلے کی جانب پاؤں نہ لپیٹے ہو۔ کچھ شرم حیا ہے تم میں کہ نہیں۔ دن میں کئی بار شامت آ جاتی تھی۔ وہ رخصت ہوئیں تو ہم بھی بے احتیاط ہونے لگے۔ اور یہاں مسئلہ یہ درپیش تھا کہ قبلہ کو نظر انداز کر دینا ممکن نہ تھا وہ تو سامنے بلکہ الٹا ہی میں روشن تھا۔ اور میں جان بوجھ کر اُسے نظر کے سامنے رکھ کر لینا تھا۔ اگر یوں لینا تھا تو پاؤں اُس کی جانب ہو گئے تھے۔ شرمندگی ہوئی کہ محض منظر کے چاؤ میں کھلے عام بے ادبی ہو رہی ہے۔ چنانچہ اپنا تھیلا اٹھایا دوسری جانب ہو کر سر کعبے کی جانب اور بدن جبل نور کی چوٹی کی طرف۔ اب صرف چوٹی کا پتھر نظر آتا تھا۔ یہاں بھی مسئلہ درپیش رہا کہ میرے سر کے اُس حصے میں جہاں بال کم ہو رہے ہیں وہاں مجھے محسوس ہوتا تھا کہ کعبہ وہاں مسلسل دستک دیتا ہے کہ میں یہاں ہوں اور تم منہ موڑے بے زنی برستے ہو۔ ایسا بلند روشن اور یکساں دیدار کہ صرف تم وہاں سے مجھے دیکھو۔ میرے ٹہنی کے پہاڑ پر اس لمحے تہا تم ہو تو مجھ کو کھوپڑی آنکھوں میں زندگی بھر کے لیے اس دیدار کو بھراؤ کہ پھر یہ دیکھنے کو نہیں ملے گا۔ بے شک ہم نے جہیں پھر سے ہالیا۔ ایک انعام کا بہانہ بنا کر ہالیا اور بے شک تم یہاں پہنچتے ہی پھر سے بلاوے کی عرضیاں ڈالنے لگے۔ اگر کوئی عرضی منظور ہو جاتی ہے تو تیرا ذرا آئندہ بھی تم پہاڑ ہو سکتا ہے لیکن ایسا کبھی نہیں ہونے کا جواب اور رہا ہے۔ تم کبھی یوں اس بلند مقام سے۔ اس رات میں جب کہ تم ایسے سیاہ

گافل تھا۔ گافل سوتا تھا۔

دیدار بے شک جیسا بھی بے مثل ہوا نکلیں ہلا خرتھکتی ہیں تو میں کچھ دیر آنکھیں بند کر کے اونگھنے کی سعی کرتا رہا لیکن بند آنکھیں بھی کھلی رہتی کہ ان میں سے خانہ کعبہ کا روشن مہلوانا رخصت نہ ہوتا۔ میں ایک پر مسرت اطمینان اور شرابور شانتی میں تھا کہ بے شرط زندگی میں آج کی رات تو انہی پٹانوں اور پتھروں میں گزاروں گا۔ جن میں بابا کے سانسوں کی مہک تھی۔ ان کی ہتھیلیاں اور پاؤں تھے۔ بے شک غار حرا کے اندر نہ سہی۔ اُس کے صحن میں نہ سہی۔ بیٹیں کہیں۔ یہاں بھی اس گھڑے پر بھی۔ یا بابا بنگالی کے پھنجر کے برابر میں جو ہموار جگہ ہے اُس کے سنگریزوں پر ہی سہی۔ یہ رات تو بیکار بسر ہوگی۔ اور یہ اطمینان مجھے بے انت مسرت اور سرخوشی سے سرشار کرتا تھا اور میں اس خیال میں اپنی مسکراہٹ پر اختیار نہ رکھتا تھا۔

ایک اور سادگی یا حماقت کا اقرار کر لوں۔ میں خانہ کعبہ کی جانب ٹھٹھکی باندھے دیکھتا بھی کبھار اپنا دایاں بازو فضا میں بلند کر کے جیسے اُسے۔ ہیلو۔ کہتا۔ اور پھر مسکراتے لگتا۔ اور کبھی بایاں بازو اٹھا کر۔ اقامتہ قدرے بلند آواز میں۔ جھینگ یوسر۔ کہتا۔

میں یہاں اس بیان میں اپنی قصہ گوئی کی علت اور کہانی کہنے کی عادت کو جہاں تک ممکن ہے۔ میرے بس میں ہے۔ بروئے کار لانے سے نہ صرف اجتناب اور گریز کر رہا ہوں۔ بلکہ مبالغے سے بھی قتی الامکان قطع تعلق کرتا ہوں اور اُس شب کو ممکن مکالموں اور بے جا تقدس میں ڈوب کر وہاں تک نہیں لے جاتا جہاں تک وہ نہیں تھی۔ اپنی خصلت اور فطرت پر جہاں تک ایک مٹی کے انسان کے لیے ممکن ہے قابو پا کر مکمل ایمانداری سے اُس رات کو جوں کا توں بیان کرنے کی سعی کر رہا ہوں۔ اور اس کے باوجود کہیں میں جذبات میں بہہ جاتا ہوں۔ بھول جاتا ہوں تو اسے درگزر کرنا آپ کے اختیار میں ہے کہ میں نے نہ تو اُس شب کے بارے میں۔ اُس شب میں کوئی ٹوش تیار کیے اور نہ ہی ایک ایک لمحے کی تفصیل یاد رکھنے کی کوشش کی۔ ان لمحوں کو جذب کرتا رہا۔ انہیں یادداشت کی بجٹی پر چڑھا کر پتھر لکھیں کیا۔ ان سے گوندھی ہوئی مٹی سے بہت بعد میں حرا کا ایک کوزہ بنایا۔ اپنے تئیں جو دیکھا جو وارو ہوا ایسے ہو بہو بنایا۔ ویسا بنانے کی کاوش کی۔ اُس کوزے پر وہ رنگ نہیں لگائے جو وہاں نہیں تھے۔ اور حاصل کرنے کی خاطر نہ دنگ آمیزی کی اور نہ ہی اپنی کاریگری کے جوہر دکھائے۔ اُسے اپنے تئیں جوں کا توں۔ ہو بہو بنایا۔ وہ جیسا تھا اُسے ویسا ہی بنانے کی کاوش کی۔

چنانچہ اب میں یہ بھول رہا ہوں کہ یہ بابا بنگالی تھا جس نے کروٹ لے کر آنکھیں کھولیں اور میں اسے واضح طور پر دیکھ نہیں سکتا تھا کہ وہ اگلی لو کے باوجود اندر سے میں تھا۔ اُس چ۔ جو رات آخر

اعمال والے کا بھی چہرہ جل نور کے ہم رنگ ہو رہا ہے۔ ایسا کبھی نہ دیکھو گے۔ تو دیکھ لو۔

خواہش تو میری بھی یہی تھی اب ادھر سے بھی اشارہ آ گیا تھا۔ چنانچہ میں پھر اٹھاتی تھی اٹھا کر پھر اسی مقام پر چوٹی کی جانب جا رکھا اور اُس پر اپنا سر رکھا اور اُس روشن کعب کے دیدار کو اپنے سامنے کیا۔ البتہ پاؤں میں نے سمیٹ لیے۔ گھٹنے سینے کے ساتھ لگا لیے جیسے ماں کی کوکھ میں بچہ سنا ہوتا ہے۔ تاکہ وہ۔۔۔ دل کعبے شریف نہ ہوں۔

یہ اکتوبر کی تاریخ تھی۔ اکتوبر 2003ء

اس اونچائی پر ان نیولوں کی سرسراہٹیں تو مسلسل تھیں لیکن ہوا ذرہ بھر نہ سرکتی تھی نہ سرسراتی تھی۔ خنکی کا ہلکا سانس بھی نہ تھا۔ ویسے اتنی گرمی بھی نہ تھی کہ بدن بے چین ہو جائے۔ البتہ گھڑے کے نیچے سینٹ میں کچھ ٹھنڈک تھی۔

اگرچہ اس بلندی تک وادی مکہ میں رواں ٹریفک کا شور شدت سے نہ آتا تھا۔ یہاں آتے آتے اُس کا دم گھٹتا تھا اور وقفوں سے مدھم مدھم آتا تھا لیکن اب محسوس ہوتا تھا کہ اُس میں بھی کمی آ رہی ہے۔

میں بندوبست تو کر سکتا تھا لیکن جان بوجھ کر کیمبرہ نہ لایا تھا۔ تاکہ میری توجہ نہ بھٹکے۔ میں ہمہ وقت نئے زاویوں کی تلاش میں نہ رہوں۔ ہر شے کو کیمبرے کی آنکھ سے نہیں اپنی آنکھ سے دیکھوں۔ ان پتھروں اور منظروں کو ہمہ وقت اس نظر سے نہ دیکھوں کہ کدھر سے اور کہاں سے بہترین رخ بنتا ہے ایک عمدہ تصویر کے لیے۔

کوئی کیمبرہ اس لائق نہ تھا کہ وہ ان کے مقابلے میں اہمیت اختیار کر جاتا۔ میں ان پتھروں اور منظروں کو ایک ایسی شے نہیں بنانا چاہتا تھا جس کی تصویریں اتاری جاتی ہیں۔ ان کا مقام کہیں آگے تھا برتر تھا۔ میں انہیں مجروح نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ میں اپنی دیگر کوزہ نوریوں کی مانند تصویریں اتار کر بعد میں اپنی سنڈی ٹیبل پر پھیلا کر ان کی مدد سے منظر کی تفصیل اور کیفیت بیان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ان پر انحصار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں یہ تصویریں پتھروں اور منظروں کی اپنے اندر اتارنا چاہتا تھا۔ تاکہ یہ بیان ایک نقش کے سکوت سے مستعار نہ لیا گیا ہو بلکہ جو کچھ میں اپنی آنکھوں سے اپنے وجود میں جذب کرتا ہوں قلم پکڑتے ہوئے وہ اُس کی بے سے پھوٹے بے شک اُس میں ہر پتھر کا حدود و اربعہ۔ ساقی اور ہر مقام کی لمبائی چوڑائی قلمی نہ ہو۔ محاسب کتاب میں تھوڑی بہت کسر رہ جائے۔ لیکن بیان میرے بدن کا ہو۔ اُس کے اندر جو تصویریں نقش ہوتی ہیں ان کا ہو۔

بابا بنگالی ٹریفک کے بعد کی گہری نیند کے مزے لوٹ رہا تھا اور اُس پاس سے غافل تھا۔ بلکہ

کارو بار کرتے تھے اور جن میں نیاز بھی شامل تھا نیچے چائے تھے چوٹی کے برابر میں سیٹ کے تھوڑے پر مجھے تو یہی لگتا تھا کہ ابھی نہیں تو تھوڑی دیر میں یہ کروٹ بدلے گا تو کھائی میں جا کرے گا بابا بنگالی بے سدھ سوچتا تھا۔ غسل کے مزے لوفتا تھا۔

میں تھوڑے سے ہٹ کر دوسری جانب نیچے اترنے کے لیے پہلی سیڑھی تک آیا۔ سیڑھیوں پر بے شک وہ ہلکا نور تھا جو شہر مکہ کا عکس تھا لیکن میں نے چھوٹا نارنج آن کر لی اور اپنے عمر رسیدہ گھٹنوں کا خیال کرتا 'احتیاط کرتا' ایک سیڑھی پر اتر کر دونوں جو گر پہلے جا کر پھر دوسری پر قدم رکھتا۔ یہ کتنی سیڑھیاں ہوں گی جو سرنگ تک پہنچاتی تھیں۔ شاید میں کے قریب ہوں گی۔ ان سیڑھیوں پر سے اترتا تھا ایک راستہ میں۔ یہ بھی ایک منفرد احساس تھا۔ جیسے میکسیکو کے گھنے جنگلوں میں مایا تہذیب کے ٹھنڈیوں میں کچھ افسانہ اور گھاس بھری سیڑھیاں ہوں جن پر صدیوں سے کسی اور نے قدم نہ رکھا ہو۔ اور کوئی قدم رکھے اور نہ جانتا ہو کہ یہ سیڑھیاں اُسے کہاں لے جائیں گی۔ لیکن میں جانتا تھا۔

میں بابا بنگالی کے چھتر تلے آن پہنچا جہاں میں ابھی ابھی رکھوالا ہوا تھا۔ اور یہ کیا کہ چھتر تلے غار حرا میں اترنے والی سرنگ کے سیاہ دہانے اور تنگی کو دیکھ کر مجھے ڈر نہیں آیا۔ میرے دل میں کوئی ہول نہیں اٹھا۔ میں نے نارنج کا رخ اس کی سیاہی کی جانب کیا اور اطمینان سے اندر چلا گیا۔ اپنے سر کو جھکی ہوئی چٹانوں سے بچاتا۔ پتھر جو فرش میں ابھرے ہوئے تھے اُن پر چڑھتا اترتا۔ میں وہاں تک پہنچ گیا جہاں ایک دیو بیکل بولڈر اس سرنگ کو تقریباً بلاک کر دیتا تھا۔ لیکن میں آگاہ ہو چکا تھا کہ اس پٹائی دیوار کے دائیں جانب سے گزرنے کا نسخہ یہ ہے کہ اس کے قدموں میں جو ایک پتھر ہے اُس پر اپنا پایاں پاؤں بھا کر ذرا اونچا ہو کر اور سانس تھوڑا سکیڑ کر بولڈر اور دیوار کے درمیان میں جو ایک چھوٹی سی جگہ ہے جو ٹھنڈی ہے اُس میں سے گزرا جاسکتا ہے۔ سو میں گزر گیا۔

اور یہاں سے آگے روشنی دکھائی دینے لگی۔

اگرچہ عام آنکھوں کے لیے وہاں تاریکی تھی لیکن سرنگ کے گہرے اندھیرے کی عادی آنکھوں کے لیے آگے روشنی واضح تھی۔

میں صحن میں لکل آیا۔

نونا تاریک اور چپ۔ کہیں کوئی آہٹ تک نہ تھی ہوا کی بھی سرسراہٹ نہ تھی جیسے ہر شے نیند

میں ہو۔

لیکن میں نے اُس لمحے سب سرنگ سے باہر آ کر صحن میں قدم رکھا ہے تو اُسے بے سرفراہوش

کر دیا ہے کہ راستے میں کھنک سرنگ سے لکل کر مجھے لہال آگیا کہ مجھ سے ابا بھی تو اسی سرنگ میں سے

رہی تھی اُس کی سیاہی غالب تھی تو اُس نے کہا کہ۔ بابا کار میں نہیں جائے گا۔ اکیلا پڑا ہے۔ جاؤ۔

یا وہی تبتی تھیلا سرہانے دھرے خانہ کعبہ کے روشن جمال کو آنکھوں میں اتارتے ہوئے میرے ذہن میں ایک جھماکا سا کوندا۔ کہ تم یہاں بیکار لیٹے ہو۔ اُس گھر کو تنگے جاتے ہو جس کا سیاہ مکعب یہاں سے دکھائی نہیں دیتا ایک شاید دیتا ہے۔ اُسی گھر کو تنگے جاتے ہو اور وہ گھر خالی پڑا ہے جہاں ایک شمع نے اُجالا کیا تھا۔ پورے جبل نور پر صرف تم ہو جو اُسے آباد کر سکتے ہو۔ اُسے چند لمحوں کے لیے اپنا گھر بنا سکتے ہو۔ اور تم ہو کہ یہاں بیکار لیٹے ہو۔ بہت معتبوب کیا اپنے آپ کو۔ اُن زمانوں میں صحن کے نجوم میں کود جانے کا سوچتے تھے اور اب وہ صحن خالی پڑا ہے اور تم بیکار لیٹے ہو۔ اپنے آپ کو سر دلش تو بہت کی۔

نیچے سرنگ میں داخل ہوتے بھی خوف آئے گا کہ بابا بنگالی بھی ادھر خزانے لے رہا ہے وہاں اپنی نارنج کے ساتھ موجود نہیں۔ اور سرنگ کے اندر تو گھٹا ٹوپ اندھیرا ہوگا۔ چٹانیں حائل ہوں گی۔ اور دوسری جانب نکلوں گا تو نہ صرف صحن تاریکی میں تنہا بھائیں بھائیں کر رہا ہوگا بلکہ غار کی روپوشی میں پناہ نہیں کون ہو کیسا ہو۔ تو وہاں تک پہنچ بھی گئے تو کیا ٹھہر سکو گے۔ سہہ سکو گے۔

ان تمام سوالوں کے جواب اگرچہ "نہیں نہیں" میں آتے چلے جاتے تھے لیکن میں نے اپنے آپ کو تسلی دی کہ دیکھو بھائی نہ اُس سرنگ میں نہ صحن میں اور نہ غار کے اندر کوئی ڈر ہے کہ یہ بابا کا گھر ہے۔ یہ سب تمہارے ڈر پوک بدن کے واہے ہیں تو ذرا ہمت کرو۔ جاؤ تو سہی۔ اگر ڈر نے تمہیں جکڑ کر تمہیں بہت ہی بزدل کر دیا تو بے شک دوہائی دیتے ہوئے بھاگ آنا اور یہیں بابا بنگالی کے پاس آ بیٹھنا۔ زیادہ سے زیادہ ہارٹ فیل ہو جائے گا تو یہ ہونا ہے کبھی نہ کبھی۔ نہ گئے تو ذرا اُس پچھتاوے کا حساب کرو جو تمہیں عمر بھر ہوتا رہے گا۔ تو اٹھو۔ شاباش!

اٹھا تو ذرا لڑکھڑایا کہ وادی مکہ کی روشنیاں مزید گہرائی میں چلی گئیں۔ میں نے یہاں تک آنے کے لیے خاص طور پر ایسے جو گر پہنچے تھے جن کے تھے نہ ہوں تاکہ انہیں بار بار کھولنے اور باندھنے کا جھنجھٹ نہ ہو۔ ایسے آپس میں چپک جانے والے للیپ ہوں کہ پاؤں جو گز میں ڈال کر انہیں ہل بھر میں بند کیا جاسکے۔ چنانچہ اپنے جو گر میں ہنہ لیتے ہوئے قریب دھڑے تھے اور جنہیں متعدد نیوے سوکھ چکے تھے ہل بھر میں پہنچے تبتی تھیلا کمر بوجھ کیا۔ تھیلے میں جو دودھ کی بوتل تھی جس کے کونے میری کمر میں جیسے تھے وہ اب اذیت نہ دیتے تھے کہ اس میں سے بابا ایک گھونٹ بھر چکے تھے۔

جبل نور کی پہاڑی پر پہنچے تھا وہاں تاریکی رات کرتی تھی کوئی نہ تھا۔ وہاں جو دو چار افراد

اُٹھ کر سیاہی میں تھے۔ بار بار یہاں کھڑے ہو کر نیچے جھانکتے ہوں گے تو کیا دیکھتے ہوں گے۔ اُن زمانوں میں جو چراغ جلتے تھے اُن کی روشنی یہاں سے کہاں دکھائی دیتی ہوگی۔ دیرانی اور بے آبادی اور تاریکی کے سوا اور کیا دیکھتے ہوں گے۔

ابھی تک میں ڈر کی جھجک میں تھا۔

خوفزدہ نہ تھا لیکن خوف نے ابھی تک دامن چھوڑا نہ تھا۔

مقام کی وحشت اب بھی مجھے اسیر کرتی تھی۔

یعنی میں عام زندگی کے اطمینان میں سانس نہ لیتا تھا۔ ہر سانس کے ساتھ قہقہہ اُبھرتا اور کچھ بے چینی گھٹی ہوئی آتی تھی۔

اور پھر شاید اس لیے کہ مجھے یہاں رات گزارنے کی منظوری مل گئی تھی۔

تو اس منظوری سے منسلک ایک خیال مجھ پر اترا۔ جیسے یہ مقدس زمین ہے اپنے جوتے

اتار دو۔ کہ اس مقام پر نہ کوئی آسیب ہو سکتا ہے نہ کوئی بدروح اور نہ ہی کوئی آفت والے جنات۔ خوفزدہ

کیوں ہو۔ ڈرتے کیوں ہو۔ وحشت کس بات کی کہ اس مقام پر جہاں جبریل آتے تھے۔ جہاں ہاما

آتے تھے جن کے لیے وہ آتے تھے۔ اور جو اُن کا گھر تھا۔ تو وہاں کسی آسیب بدروح یا جنات کی جرات ہے

کہ کوئی آئے۔ کسی میں سکت ہے۔ اگر خدا کے گھر کے بعد کوئی ایسا گھر ہے جو ان واہوں اور خدشوں سے

ہلکا ہے تو یہ ہے۔ تو بے خوف ہو جاؤ۔

تو میں ایسا بے خوف ہوا۔ نذر ہوا کہ زندگی بھر کبھی ایسا تو نہ ہوا تھا۔

اور میں نے جبل نور کے دامن میں پہنچ کر اس پر پہلا قدم رکھنے سے پیشتر جو ایک اطمینان بھرا

سانس لیا تھا پہلی بار ویسا اطمینان والا بے خوف سانس لیا۔

غار حرا تاریکی میں تھی لیکن اُس کے فرش پر سنگ سرسری جو چند ملیں تھیں اُن کی سفیدی دکھائی

دے رہی تھی۔

میں نے تاریخ کی روشنی پہلی بار غار کے اندر پھیلائی صرف یہ اطمینان کرنے کی خاطر کے

اللہ کوئی اور تو نہیں۔

سب سے پہلے میں نے اپنا ہاتھ اٹھا کر سے اتارا۔ غار کے دہانے کے دائیں جانب ایک

دوار چھڑا اس پر رکھا۔ پھر اپنے جو گز کے لٹاپ ہدا کر کے اُنہیں اتارا اور اسی پتھر پر رکھ دیا۔

اگرچہ وہ ابھی تھی لیکن اس کے سوا چاروں طرف تھا۔ اگر اس غار کو گھسیٹا ہے تو شب بھر کے لیے تو اس کے سوا

نکل کر یوں صحن میں داخل ہوتے ہوں گے۔ کوئی ایک بار نہیں۔ برس بار برس تک بار بار۔ وہ بھی تو میری طرح اپنا سر جھکی ہوئی چٹانوں سے بچاتے۔ قدموں تلے جو پتھر ناتراشیدہ ابھرے ہوئے ہیں اُن کا دھیان رکھتے۔ غالباً نہیں یقیناً اُس بڑے بولڈر کوراہ میں حائل پا کر اُس کے اور دیوار کے درمیان جو مختصر خلا ہے اُس میں سے گزر کر۔ اور اُسی چھوٹے پتھر پر پاؤں رکھ کر۔ اپنا پایاں پاؤں رکھ کر ڈرا بلند ہو کر اُس خلا میں سے گزرتے ہوں گے تو اُس پتھر پر اُن کی چپل جمتی ہوگی جسے وہ خود گمانہتے تھے۔ اگرچہ ان چودہ سو برسوں میں کروڑوں نہیں اربوں لوگوں نے یہی سرنگ اختیار کی اُسی پتھر پر پاؤں رکھ کر پار ہوئے لیکن میرے لیے اُن سب کا کوئی وجود نہ تھا۔ اُن کے پاؤں کا کوئی نشان نہ تھا۔ ابھی بابا نے وہاں قدم رکھا تھا تو اُن کے فوراً بعد میں نے اُن کے نقش پا پر اپنا قدم جمایا تھا۔ البتہ ایک فرق تھا کہ میں تو بمشکل اپنی تو نہ سمیٹ کر اُس خلا میں سے گزرا تھا اور وہ ایک نوخیز چیتے کے پیٹ والے تھے ہوا کے ایک جھونکے کی مانند آسائش سے گزر جاتے ہوں گے۔

اور وہ بھی تنہا۔ میری طرح آتے ہوں گے۔

تو جب وہ سرنگ پار کر کے اس صحن میں داخل ہوتے ہوں گے تو پہلے کیا کرتے ہوں گے۔

اُن کے ہاتھوں میں ایک عصا بھی ہوگا جو ان دنوں رواج تھا اور خاص طور پر پہاڑ پر چڑھنے کے لیے ایک

واکنگ سنگ کا کام دیتا ہوگا تو پہلے وہ اُس عصا کو رکھتے ہوں گے اور پھر وہ اپنی کمر پر بوجھ کیے ہوئے تھیلے

کو اتارتے ہوں گے۔ یقیناً جہاں یہ دیوار ہے جو تب نہیں تھی صحن کا کنارہ تھا اس کنارے کے قریب جا کر

وہاں سے نیچے جھانکتے ہوں گے۔ اُن زمانوں میں تو یہاں نہ صرف بندر بلکہ بڑے بن مانس بھی پائے

جاتے تھے تو شاید یہ جاننے کے لیے جھانکتے ہوں گے کہ کہیں آس پاس کوئی شریر بندر تو نہیں جو اُن کی

خوراک کا تھیلیا اٹھا کر لے جائے۔ اور یہ تو نہیں کہ وہ فوراً کھوہ میں جا بیٹھتے ہوں۔ وہ کچھ دیر اس صحن میں

ٹھہرتے ہوں گے۔

میں تا دیر اُس سرنگ کو جو اس تاریکی میں کم کم دکھائی دیتی تھی دیکھتا رہا کہ جب بابا اُس میں

سے برآمد ہوتے ہوں گے تو کیسے لگتے ہوں گے۔ اچھے لگتے ہوں گے۔

یہ صحن پختہ نہیں۔ بارہ ایک ستر گز بڑے ہیں۔ مٹی ہے۔ شاید 8X8 فٹ کا ہوگا۔

اور میں نے ابھی تک جان بوجھ کر غار کی جانب نگاہ نہ کی تھی کہ کہیں ڈر پھر سے غالب نہ

میں نے آگے بڑھ کر صحن کی دیوار پر کہاں لگا کر نیچے لگا دی۔ بندر چاہئے تھے یا کہیں نہ

چھٹے تھے۔ اور اگر اُن کے آگے جو ابھی چھٹتی تھی اُس میں کہیں کہیں روشنیاں تھیں اور پہاڑیوں کے

میں سے آسمان کا ایک ٹکڑا بھی دکھائی دے جاتا ہے۔

غار کے اندر ذرا سا جھک کر اپنے سر کو چٹان سے بچاتے ہوئے داخل ہونا پڑتا ہے۔
غار کے داخلے پر جہاں میں نے مصلیٰ بچھایا تھا وہاں بس ایک ہی مصلیٰ کی گنجائش تھی۔ البتہ
اُمّیں ہاتھ پر فرش سے دو تین انچ بلند تھوڑی سی ہموار جگہ ہے جس پر سنگ مرمر کی چند سلیں جڑی ہیں اور
بب بہت زیادہ جھوم ہو جائے تو کوئی شخص سمت سمت کر اپنے سر اور دائیں کندھے کو چاکر ہتھکل لٹل پڑھ
سکتا ہے ورنہ گنجائش نہیں ہے۔

جہاں میرا مصلیٰ ختم ہوتا تھا اُس کے آگے غار تنگ ہونے لگتی ہے اور اُس روزن یا شکاف پر جا
فتم ہوتی ہے جو ایک غفنی سے نصف سائز کا ہوگا۔ جہاں سجدہ کرتے ہیں یعنی مصلیٰ کا آخر وہاں سے آگے
جانے کے لیے رینگنا پڑتا ہے لیکن دو چار ہاتھ بعد اُس کا حجم اتنا تنگ ہو جاتا ہے کہ آپ کا سر اُس میں
داخل نہیں ہو سکتا۔ اور اس تنگ جگہ کے آخر میں وہ شکاف ہے۔ اسی شکاف کے بارے میں روایت ہے
کہ حضورؐ یہاں عبادت کے لیے کھڑے ہوتے تھے تو اس میں سے خانہ کعبہ نظر آتا تھا۔ مین ممکن ہے کہ
چودہ سو برس پیشتر یہ شکاف قدرے بڑا ہو اور پھر قدرتی طور پر چٹانوں کے کھسکنے سے یا کسی زلزلے کے
باعث یہ مختصر ہو گیا ہو۔ بہر طور اب اُس میں سے خانہ کعبہ نظر نہیں آتا۔ شہر مکہ کی چند روشنیاں البتہ نظر آتی
ہیں۔ یا پھر ایسا ہے کہ جیسے اُس شب میں نے تجربہ کیا کہ آپ غار کے بائیں جانب جو چٹان ہے اُس
کے ساتھ رخسار لگا کر گردن ایک خاص زاویے پر اکڑا کر ذرا ترہمے ہو کر ایک خاص زاویے سے شکاف کو
دیکھیں تو کعبہ کا ایک مینار اور وہ بھی کسی حد تک نظر آ جاتا ہے۔ اور اس حالت میں آپ زیادہ دیر تک نہیں
رہ سکتے۔

تو ایک شکاف ہے تنگ ہوتی غار کے آخر میں۔

اس کے علاوہ مصلیٰ کے عین اوپر دو شکاف ہیں۔ اور پھر دائیں ہاتھ پر بھی چٹانوں میں ایک
روزن ہے۔ تاریکی میں یہ غار کے گہرے سکوت میں قدرے نمایاں ہوتے ہیں اور ہوا کی مدھم
مدرجہ اہل ان کے راستے سے در آتی ہے۔

ان کے علاوہ ایک اور قدرے بڑا شکاف ہے جو غار کے اندر بیٹھنے سے نظر نہیں آتا کیونکہ یہ
گہائی کی جانب غار کے دہانے پر ہے۔ یہ اندر داخل ہونے سے پیشتر دائیں جانب دیکھا جاسکتا ہے۔
لیکن آسانی سے نہیں۔ اسے تلاش کرنا پڑتا ہے غار کے دہانے پر جو چٹانیں ہیں ان کے ساتھ پھر رخسار
ہمارا ایک خاص زاویے پر جھک کر اسے دریافت کیا جاسکتا ہے۔ اور بہت کم لوگ ہیں جو یہ شکاف تلاش
کریں۔ اس لیے اس جگہ اور تلاش کے لیے وقت و کار ہوتا ہے۔ اور ان لوگوں کے پاس وقت نہ تھا

اور کوئی چارہ نہ تھا۔ تھیلے کے برابر میں میں نے مارچ رکھ دی تاکہ ضرورت پڑنے پر ہاتھ بڑھا کر اسے
حاصل کیا جاسکے۔ یعنی خوراک اور پانی سرہانے رکھ لیا۔

اور پھر غار حرا کے فرش پر۔ اگرچہ وہاں پہلے سے ایک بوسیدہ اور لاکھوں نوافل کی جبینوں سے
گھسا ہوا ایک مصلیٰ بچھایا تھا جو مجھے پہلے نظر نہ آیا تھا اُس پر اپنی بہو رابعہ کا عطا کردہ اُس کے بابا کا
جائے نماز بچھا دیا۔ جیسے مجھے خدشہ ہو کہ کیا پتہ کوئی اور آجائے اور قابض ہو جائے۔ نیلی ریتوں اور سرو
کے درختوں کے نقوش والا جائے نماز وہاں بچھا کر جیسے میں نے اس گھر میں اپنا سامان رکھ دیا ہو اور
اگر کوئی آئے تو اُسے کہہ دیا جائے۔ کہ اس کھود میں تو صرف ایک بندے کی گنجائش ہے۔ میں پہلے
آ گیا ہوں۔

اپنے ذاتی جائے نماز پر کھڑے ہو کر۔ اُس یکتا تنہائی اور نیم تاریکی میں جب میں نے نفل ادا
کرنے کی نیت کی۔ اور منہ ول کعبہ شریف کیا۔ تو مجھے مکمل یکسوئی حاصل نہ ہوئی کہ مجھے ابھی تک یقین
نہیں آ رہا تھا کہ میں جبل نور کے کل وجود پر۔ بابا بنگالی کے خفتہ وجود کے سوا۔ یکسر تنہا غار حرا میں ہوں۔
میری نظر جائے نماز پر نہ تھی۔ میں غیر شعوری طور پر سامنے ادھر دیکھتا تھا تنگ ہوتی غار کے آخر میں نظر
آتی ایک مختصر شکاف میں سے پھوٹی روشنی کو دیکھتا تھا کہ اس میں سے خانہ کعبہ کا سراپا نظر آئے گا کہ
روایت یہی تھی۔ لیکن وہاں کچھ بھی نظر نہ آ رہا تھا سوائے ایک چھوٹے سے شکاف کے۔ جس میں سے
وادی مکہ کی چند بجھتی ہوئی روشنیوں کے سوا اور کچھ نظر نہ آتا تھا۔

میں نے سلام پھیرا اور وہیں اُسی حالت میں بیٹھ گیا۔ میری پشت صحن کی جانب تھی اور میرے
شانوں کا رخ کھوہ کی نیم تاریکی کے سامنے تھا۔

میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں لیکن اب غار حرا میں بیٹھنے ہوئے عرض کرتا ہوں کہ یہ روایتی
معنوں میں ایک غار ہرگز نہیں ہے۔ ایک قدرتی آماجگاہ نہیں ہے۔ ان گنت صدیوں پیشتر کسی قدرتی
آفت کے نتیجے میں جبل نور کی ہی چند چٹانوں نے جگہ بدلی۔ ادھر آن گریں اور ایسے زاویے اور انداز
میں آن گریں کہ اُن کے درمیان میں ایک کھود وجود میں آگئی۔ کھود کے اوپر اور دائیں بائیں بڑے
بڑے پتھر آڑے تر جیسے ایک دوسرے کے ساتھ ٹیک لگائے ایک دوسرے کے سہارے لاکھوں برسوں
سے اسی حالت میں قائم ہیں اور اسی لیے غار حرا ایک عام غار کی مانند مکمل طور پر بند اور ہوا سے عاری مقام
نہیں ہے بلکہ ایک دوسرے کے سہارے آرام گاہ پتھروں کے درمیان میں کہیں کہیں چھوٹے
چھوٹے شکاف ہیں جن کے راستے سے ہوا کا چلن جاری رہتا ہے۔ اور گھپ اندھیرے میں بیٹھنے ہوئے
بھی ان شکافوں میں سے بہت سی روشنی نازل ہوتی رہتی ہے۔ اور صحت میں جو ایک شکاف ہے اس

لے رہے ہو۔ پتھروں کے حساب کتاب کر رہے ہو۔ غار حرا کی رات میں تنہا ہو تو اس کی جانب رخ نہیں کرتے جو ان پتھروں میں رہائش کرنے والے کو محبوب جانتا تھا تو میں.. منقول کہتے شریف.. نیت کرتا اور ہاتھ ہاندہ کر کھڑا ہو جاتا..

نوافل ادا کرتے ہوئے.. اس غار کی تاریکی میں تنہا کھڑے ہوئے یوں تو مجھے تو اند کے طالب بھوک پیاس سے بے نیاز ایک روحانی کیف میں مستغرق ہونا چاہیے تھا لیکن میں ایسا کر نہ جنت تھا کہ میرا بدن مجھ سے باغی ہو کر دوہائی دینے لگا.. ثواب اپنی جگہ یہ مقام بھی اپنی جگہ.. لیکن مجھے بھوک لگی ہے.. مجھے پیٹ کا کچھ ایندھن دو.. کھلاؤ پلاؤ.. خالی پیٹ مجھ سے عبادت بھی نہیں ہوتی.. یکسوئی منتشر ہوتی جاتی ہے..

پہلے تو از حد شرمندگی ہوئی پھر خیال آیا کہ شرمندگی کی کوئی بات نہیں.. پیٹ میں روٹیاں ہیں تو سب گلاں کھولیاں ہوتی ہیں بے شک یہ غار حرا کی گلاں ہوں.. اور کیا بابا یہاں بھوکے ہمارے بیٹھے رہتے تھے.. وہ بھی تو اپنے سٹو.. کچھوریں اور دودھ کا ندھے پر بوجھ کر کے یہاں تک لاتے تھے.. اور اماں خدیجہ بھی تو نیچے سے اُن کے لیے کھانے پینے کا سامان کبھی کسی خادم کے ہاتھ اور کبھی اپنی بالائی فاطمہ کے ہاتھ یہاں بھیجتی تھیں تاکہ گلاں کھولیاں نہ ہوں.. تو شرمندہ نہ ہو کہ یہ گلی تو سنت رسول ہے..

سلام پھیر کر میں وہیں بیٹھ گیا البتہ دوزانو ہو کر نہیں آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا.. میری پشت صحن کی طرف تھی اور میرے شانوں کا رخ تنگ ہوتی کھوکھ کے آخر میں جو روزن کھلا تھا اُدھر کو تھا..

میں اگر برگزیدہ ہوتا پارسا اور خود کو یاد الہی میں فراموش کروینے والا ہوتا تو مجھ میں یہ طلب ہوا ہی نہ ہوتی.. لیکن میں نہ تھا.. میں تو اپنے بابا کے نقش قدم پر چلنے والوں میں سے تھا.. اگر اُن کو بھوک لگتی تھی تو مجھے بھی لگ رہی تھی..

پہنا لپچ میں نے ہموار سطح پر رکھے تھقی قبیلے کو اٹھایا اور اُس کا گلا کھولنے والی نعلی کو کھینچ کر اُسے اُڑا دیا..

لیکن قبیلے کو کھولنے سے پیشتر میں نے اپنا رخ موڑا.. چہرہ صحن کی جانب کیا اور پشت دل کی طرف رکھ لی کہ آپ نے اگر تین صدیوں کی آگ بجھائی ہو تو آپ ایک غار کی گلی کو سامنے نہیں رکھتے.. کچھ کل لٹا.. کچھ آسمان اور ہوا کے غلاب گار ہوتے ہیں جو صرف صحن کی جانب رخ کرنے سے ہی حاصل ہو سکتی ہیں..

اگرچہ میں غایت تو نہیں کر سکتا.. اور وہی سیرت کی کسی کتاب میں تفصیل ملتی ہے لیکن میں

اور میرے پاس پوری رات تھی جس میں میں نے بس اسی قسم کی تحقیقی حرکتیں کرنی تھیں.. اور بس یہ وہ شگاف ہے کہ آپ چٹان کے ساتھ رخسار جوڑ کر ایک خاص زاویے سے دیکھیں تو خانہ کعبہ اس میں ایک تصویر کی مانند جزا نظر آنے لگتا ہے.. رات کو تو یہ منظر اپنی روشن خوبصورتی سے پریشان کر دیتا ہے.. گنگ کر دیتا ہے کہ مکمل تاریکی میں سیاہ چٹانوں کے فریم کے درمیان میں یہ ایک ایسا خواب ہوتا ہے جو آپ جاگتے میں دیکھ رہے ہوتے ہیں.. لیکن آپ بہت دیر تک اطمینان سے اس منظر کو مسلسل نگاہ میں نہیں رکھ سکتے کہ وہاں اس زاویے پر چٹان کے ساتھ رخسار جوڑے تا دیر کھڑا رہنا ممکن نہیں ہوتا..

جیسے کوئی مکین اپنے گھر کا.. چاہے وہ ایک شب کا گھر ہی کیوں نہ ہو.. اُس کا تفصیلی جائزہ لینا ہے کہ دروازہ کہاں ہے.. کھڑکیاں کتنی ہیں اُس کا حدود و رابعہ جاننا چاہتا ہے ایسے ہی اگر میں بابا کے گھر میں ایک شب کا مہمان تھا تو اُس گھر کے روزن کھڑکیاں اور شگاف تو میں نے تفصیل سے دیکھنے تھے اور بیان کرنے تھے.. اور شاید اس لیے بھی کہ ان کی تفصیل آج تک کسی نے بیان نہیں کی.. یہ فرض مجھے سوچنا گیا ہے..

شاید آپ کو یہ گمان گزرے کہ میں یہ تفصیلی معائنہ ایک عمارتی انجینئر کی طرح نہایت ٹھنڈے دماغ سے کاروباری انداز میں کر رہا تھا.. نہیں جی.. ایسا کرتے ہوئے ان شگافوں کو ہر پہلو سے دیکھتے ہوئے.. کبھی جھکتے کبھی چٹانوں سے چٹ کر انہیں تلاش کرتے ہوئے میرا بدن اور میرے حواس اگرچہ ڈر سے خالی تھے پر وہ نہ تھے جو جبل نور کے تھڑے پر تھے.. یہ کوئی اور بدن تھا.. ہر چند ساعتوں کے بعد ایک عجیب سی تھر تھراہٹ میں تھرانے والا بدن.. اپنے بابا کی موجودگی کا احساس کرنے والا کچھ حواس باطن بدن تھا.. میں ہمہ وقت ہوشیار اور آگاہ تھا کہ میں کہاں ہوں اور جانتا تھا کہ یہ ساعتیں.. میری بقیہ زندگی بھر کی ساعتوں پر حاوی رہیں گی..

اور نہ ہی محض مشاہدے اور غار کے جغرافیہ کو ذہن نشین کرنے کا یہ عمل مسلسل تھا..

نہیں.. میں کچھ دیر بیٹھا رہتا اور پھر یکدم بدن میں ایک برق سی کوند جاتی.. ایک گھبراہٹ طاری ہو جاتی کہ میں بیکار بیٹھے ہو.. اُٹھو.. اور کچھ نہ کرو تو اس غار کے پتھروں کو چھونے لگو.. اُن پر ایک ناپیدا کیا مانند ہاتھ پھیرو کہ سنیں کہیں تمہاری انگلیوں کے پچھوں تلے "اقراء" کے حرف ابھرنے لگیں گے اُسی ہیئت میں.. اُسی رسم الخط میں.. جس میں وہ اترے تھے.. اور میں اُٹھ کر اُس گھبراہٹ اور سراپستگی میں اُٹھ کر پھر سے اُن پتھروں کو تار کی ٹیٹھی لٹا لٹا.. اُن پر ہاتھ پھیرتا.. اُن کی ہیئت کا اندازہ لگانے لگتا..

اور ہر قدم میں اُن کی مانی مانی کی مانند میرے لگتا کہ تم چارہ

تھا اور کرنے کو ہے۔ اب تک جہاں کہیں بھی میں کسی دسترخوان پر بیٹھا اور جو کچھ بھی کبھی رطبت سے کھایا وہ سب کچھ۔ اُس شب کے چراغ کے سادہ طعام کے سامنے.. بیچ تھا.. سب کچھ بیچ.. بے معنی بے روح اور کھانے کے سودے..

اور طعام کے بعد مجھے حسب عادت سگریٹ کی طلب ہوئی..
یہاں تو نہیں..

غار کے اندر تو نہیں..

گھر کے اندر تو نہیں..

باہر محن میں.. جہاں کھلی فضا ہے.. ہوا ہے.. میں نے ایک سگریٹ سلگا لیا..

بے شک کچھ معترضین ہوں گے جن کی جبینوں پر تقدس آمیز غلٹیں ابھریں گی کہ یہ کیسا بے ادب ہے کیسے مقام پر دھواں کشی کر رہا ہے.. اُن کا اعتراض کسی حد تک شاید بے جا نہیں ہے.. لیکن میں اعتراف کرنے والوں میں سے ہوں.. میں نہایت آسانی سے اس قصہ شب میں سے سگریٹ نوشی حذف کر سکتا تھا.. لیکن کیوں کروں..

جو گزری سو وہی ہو بہو بیان کیوں نہ کروں..

میں دیوار پر گھنٹیاں لٹکائے سگریٹ کے کش لگا رہا تھا.. جس کھائی میں آج شام بندر گھی اس چٹان پر اور کبھی اُس پتھر پر کودتے تھے.. جہاں ہنومان مہاراج راج کرتے تھے اُس سے کہیں بچے گہرائی کے دامن کے آگے جو دادی پھیلی ہوئی تھی اُس کے اکاؤ کا مکالوں میں سے بیشتر کی روشنیاں بچھ چکی تھیں اور اُن سے پرے جو پہاڑیاں تھیں وہ تاریکی میں چلی گئی تھیں..

ذہن میں کیا کیا خیال تیرتے تھے.. کبھی کبھی کچھ.. یعنی اس لمحے آریلنڈو میں کیا کر رہی ہوگی.. بلوچ شاید اپنی ماں کے ساتھ بیٹھا دکھ سکھ پھول رہا ہوگا.. رابعہ تو یقیناً پڑھائی میں مشغول ہوگی اور بے بی سیر بھی یقیناً کسی ریستوران میں دوستوں کے ساتھ قہقہے لگا رہا ہوگا.. بہن بھائی کیا کر رہے ہوں گے.. اہا ہی اور امی کی قبروں کے گرد بہت تاریکی ہوگی.. کیا وہ سب بھی میرے بارے میں اس لمحے کچھ سوچتے ہوں گے.. پھر ایک اور خیال آیا اور میں مسکرائے لگا..

اے تارڑ اتم تو یہاں پہنچ کر وہاں دینے کی تیاری کر رہے تھے.. تمہارا خیال تھا کہ ڈر نہیں لگے گا.. تم سہ نہ سکو گے.. ہول تمہیں گرفت میں لے لے گا.. تم برداشت نہ کر سکو گے اور اب مزے سے یہاں کھڑے سگریٹ پھونک رہے ہو..

وہ دہشت کہاں گئی جس کے تابع تم نے ہمارے درخواست کی تھی کہ وہ اس گمن میں آ کر

جانتا ہوں کہ بابا کو بھی جب بھوک ستاتی ہوگی تو وہ اپنے گیان میں سے باہر آ کر محن کی جانب چہرہ کر کے ہی اپنے خوراک کے تھیلے کو کھولتے ہوں گے.. اگر وہ اُنھ کے محن میں نہیں جا بیٹھتے ہوں گے تو.. اس کا مجھے یقین ہے..

میں نے اپنے تئیں شعوری طور پر یہ سعی کی تھی کہ میں غار حرا میں قیام کے لیے وہ خوراک لے کر جاؤں جو میرے بابا لے کر جایا کرتے تھے.. جدوہ میں سٹو نہیں ملتے تھے لیکن کھجوریں وافر تھیں بے شک اجوانہ تھیں.. بے شک دودھ کسی بکری یا اونٹنی کا نہ تھا کسی امریکی ملائی ٹیشل کا تیار کردہ گائیوں وغیرہ کا تھا.. پر دودھ تو تھا..

تو میں نے بسم اللہ کھجوروں سے کی.. کیا یہ میرا وہم تھا کہ غار حرا میں بیٹھے ہوئے.. چوڑی مار کر بیٹھے ہوئے ان میں مٹھاس اور طرح کی تھی.. کیا اجوا کی مٹھاس غار کی ہواؤں میں اب تک موجود تھی.. کھجوروں کی گٹھلیاں میں نے سنبھال کر رکھ لیں..

پھر دودھ کی بوتل کا ڈھکن کھول کر ایک لمبی ڈیک بھری.. دودھ ابھی تک قدرے ٹھنڈا تھا اور گاڑھا تھا اور میرے بچے میں ایک آہستہ رو سفید آبشار کی مانند اُترا.. بوتل وہی تھی.. جس کے بارے میں میں گمان کرتا تھا کہ بابا اس میں سے ایک گھونٹ بھر چکے ہیں.. اُن کے شیریں لب اس کے منہ کو چھو چکے تھے اور یہ دودھ اُن کا جھوٹا تھا.. جو میں نے پیا بھی تو اس نے مجھے ایک کیف سے بھر دیا تھا.. پھر میں نے ایک چھوٹا سا چکن سینڈویچ نہایت لطف اندوز ہوتے ہوئے کھایا.. اُس گھپ اندھیرے میں ایک سیب کو اپنے دانتوں سے آشنا کیا..

پھر دودھ کے دو گھونٹ بھرے..

ضیافت مکمل ہو گئی اور یہ کیسی شاندار ضیافت تھی..

نہ کوئی جبل نور کی چوٹی پر دکھائی دیتا تھا.. محن ویران پڑا تھا.. اور رات کے دس بجنے کو تھے.. اور بندر سو چکے تھے اور بکریاں گھروں کو لوٹ چکی تھیں اور وہ مار موٹ بھی شاید اپنے بلوں میں پوشیدہ ہو چکے تھے.. میں نے اُس گھر میں اتنے اطمینان اور بے پروائی سے ڈنر کیا جیسے ازل سے یہی میرا گھر ہے.. ہمیشہ سے یہیں رہتا آیا ہوں.. اس مقام کے سوا میں نے آج تک کوئی اور خوراک نہیں اور تو نوش

یہ ایسی شاندار ضیافت تھی..

پھر اُتر کر اپنے گھر میں کھانا کھا کر سو گیا.. اس مرتبہ ہوا اپنے اماں کی مرے

سوئے.. نہ سویا تو میں یہاں ٹھہرنے کا نہیں..

سب واہے.. بول اور وحشتیں رخصت.. اور میں جیسے اپنے گھر میں بے خوف اور بے خطر ہوتا ہوں.. لیکن نہیں یہ مثال درست نہیں کہ میں اگر اپنے گھر میں کبھی تنہا ہو جاؤں اور رات ہو اور بے شک تمام روشنیاں جل رہی ہوں تو بھی مجھے وہاں تنہائی سے خوف آتا ہے.. میں سو نہیں سکتا اور ہر آہٹ پر جاگ جاتا ہوں... یہاں میں شانت اور بے ڈر ایسا تھا جیسے کسی کو ہستانی سفر سے واپسی پر میں اپنی والدہ سے لپٹ جاتا تھا اور اُن کے دوپٹے میں سے ماں کی جو مہک آتی تھی اُسے سونگھتا ایک اطمینان اور کیف میں چلا جاتا تھا.. میں یہاں ایسا ہو چکا تھا..

میں نے کاہے کو نیاز سے درخواست کی کہ وہ یہاں رات گزارے..

میں تو یہاں اپنی ماں کی مہک میں آسودہ تھا..

میں اپنے گھر میں تھا.. اپنی گار میں تھا..

میں تسلی اور امن میں تھا.. آس پاس خوف نہ تھا ماں کے دوپٹے کی مہک تھی..

جب میری والدہ کا انتقال ہوا تو میں نے خواہش کی کہ اُن کا کوئی دوپٹہ کوئی چادر سنبھال لوں.. تاکہ کبھی زندگی کا آزار سہانہ جائے تو اُسے ناک سے لگا کر اُس میں رچی ہوئی مامتا کے بدن کی خوشبو کو سونگھ کر کچھ لمحوں کے لیے اُن کے پاس چلا جاؤں.. پھر سوچا کہ یہ بے سود ہے.. جس بدن سے وہ مہک پھوٹی تھی وہ تو مٹی میں مٹی ہو گیا.. اُس مہک کی سپلائی تو ہمیشہ کے لیے منقطع ہو چکی.. ایک دوپٹے میں وہ کب تک ٹھہری رہے گی وہ بھی خالی ہو جائے گا.. تو فائدہ..

اور یہاں میں نے پھر اُس مہک کو محسوس کر لیا تھا..

ڈر سے خالی ہو جانے کا سبب وہی تھا.. کہ بابا کے اس پتھر پر مہک میں کوئی بھوت پریت.. کوئی جادوؤں کا بحر.. کوئی واہمہ.. کوئی وسوسہ جرات نہیں کر سکتا کہ اس کے آس پاس بھی پھٹک جائے.. تو ڈر کس بات کا..

ایک اور جواز بھی تھا.. مجھے یہاں.. اس آس پاس.. چار پتھرے.. آ لے دوالے میں آ لے

ہوئے چار گھنٹے ہو چکے تھے اور میں مانوس ہوتا جاتا تھا.. ہر پتھر.. اُس پتھر کے سائے.. صحن کی

منکریوں.. اس کی دیوار کی اینٹوں کی کھر دہی بناوٹ اُن کی موتائی چوڑائی.. غار پر جھکی آڑی ترچھی ایک

دوسرے کے سہارے آلام کڑی چٹانوں کی اندھیرے میں ابھرتی شکلوں.. صحن سے اٹھتی جبل نور کی چوٹی

تک پہنچتی چٹان کی نیست.. ان سب سے واقف ہوتا جاتا تھا.. ڈر اُن جانے کا ہوتا ہے.. جسے جان لیا جائے

سگریٹ ختم کرنے کے بعد میں نے اُس کا اختتام کھائی کے نیچے پھینک دیا.. اگرچہ یہ آلودگی کے صحن میں آتا تھا لیکن وہاں پہلے سے ہی بہت ڈبے اور پلاسٹک کی بوتلیں تھیں تو میری اس ایک اینٹی کی تسلی آلودگی سے کیا فرق پڑتا تھا..

میں نے سوچا کہ غار پر تو میرا قبضہ ہو چکا ہے.. میرا رہائشی سامان اُس میں سجا ہے اور اگر مرض محال کوئی آ بھی گیا تو جان جائے گا کہ یہاں کوئی آباد ہے تو ابھی سے نیند میں چلے جائے گا.. مگر میں چاہتا تو کیوں نہ بابا بنگالی کی خیریت دریافت کی جائے.. نیاز کا پتہ کیا جائے.. ڈر اہو غوری کی جائے..

میں چھوٹا نارنج روشن کر کے سرنگ میں چلا گیا.. اور اس کی روشنی بھی آشنا ہو رہی تھی کہ میں کس پتھر پر پڑ رہی ہوں.. اور جس ہاتھ نے مجھے تمام رکھا ہے وہ جب کبھی مجھے متوازی حالت سے (را اوپا اور افقی سطح پر کرتا ہے تو جو پتھر ملی جھکی ہوئی چھت ہے اُس میں کہاں کہاں نوکیلی اور کھر در پٹا نہیں لگتا.. انہیں میں نے روشن کرنا ہے..

کیا یہی وہ سرنگ تھی جس میں تنہا داخل ہونے سے میری رُوح فنا ہوتی تھی؟

نہیں.. یہ تو اب میرے گھر کا راستہ تھا..

جونہی میں سرنگ کے دوسری جانب بابا بنگالی کی جھکی میں آ نکلا.. تو میرا چہرہ پھر سے اس لوکی رو میں آ کر منور ہو گیا جو وادی کلمہ کے کوچہ و بازار کی روشنیوں سے جنم لیتی مدھم مدھم یہاں تک پہنچ رانی تھی.. بیڑھیاں ملے کرتا ہوا جب میں اوپر سینٹ کے تھڑے تک پہنچا تو بابا بنگالی کو خرا لے آ میرا سہارہ نیند میں نہ پایا بلکہ وہ آلتی پالتی مارے ایک رغبت بھرے انہماک سے لبثانی روٹی کے ساتھ مرغ روست نوش کرنے میں مگن تھا.. اتنے رغبت بھرے انہماک سے کہ اُسے میری آمد کا بھی علم نہ ہوا.. اور جب علم ہوا تو بھی بدستور مرغ نوشی میں مشغول رہا اور میری جانب دیکھے بغیر کہنے لگا "کھانا کھائے گا؟"

"آپ بسم اللہ کرو.. اگرچہ وہ کرچکا تھا" میں ابھی ابھی کھا کر آیا ہوں..

"نیچے جا کر کھایا ہے؟"

"نہیں.. ساتھ لایا تھا.. گار میں بیٹھ کر کھایا ہے.."

"کیا کھایا ہے؟"

"کھجور.. سینڈ ویچ.. پیپ اور دودھ.."

"مرغ کھائے گا؟"

تھا۔ اور پھر اٹھ کھڑا ہوا "اب سوتا ہے"

"اپنے چھتر تے سوتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔ اُدھر فجر کو آئے گا۔ اب جرائیچے جو کھلا جگہ ہے جدھر اپنا دوسرا لوگ سوتا ہے اُدھر ہوا

میں سوتا ہے۔" یہ کہہ کر اُس نے ایک تسلی آمیز ذکر لیا اپنی بدھ تو ند پر ایک تشکر آمیز ہاتھ پھیرا اور یہ پوچھے بغیر کہ تم کہاں سوتا ہے۔ میری موجودگی سے سراسر غافل ہو کر چوٹی کے چھتر میں گم ہو گیا۔

نیاز نے ایک بوسیدہ سا کھیس سینے سے لگا رکھا تھا۔

"تارڑ صاحب۔" اُس نے صرف اتنا کہا۔

"ہاں بھئی۔" میں نے بھی صرف اتنا ہی کہا۔ لیکن اپنی جگہ سے ہلا نہیں۔

میں اُس کی بے وجہ عنایت کا اتنا ممنون تھا کہ اُسے ہرگز اس لمحے یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ ہرادر عزیز نیاز تم بے شک اُس کھلی جگہ پر جا سو جہاں بابا بنگالی جا رہا ہے اور جہاں تمہارے رفیق ہوا کے جھونکوں میں رات کرتے ہیں کیونکہ مجھے تمہاری ہمسائیگی کی ضرورت نہیں میں ڈر سے آزاد ہو چکا ہوں۔

"فجر کے ٹائم اٹھتا ہوں۔" وہ کہنے لگا "اس ٹائم حاجی لوگ آنے لگتے ہیں۔ پھر سارا دن دوڑ دھوپ کرتا ہوں۔ فوٹو اتارتا ہوں۔ شام کو جوس اور منرل واٹر کے دو کریٹ نیچے سے اوپر لانا میری ذمہ داری ہوتی ہے۔ انہیں ڈھونڈتا ہوں۔ اور پھر رات ہوتی ہے تو تھوڑے آرام کے بعد نیچے کھانا کھالے اور بابا نور اللہ کا کھانا لانے کے لیے چلا جاتا ہوں۔ تھک جاتا ہوں۔ تو چلیں۔"

میں اُسے نہیں روک سکتا تھا۔ نہیں منع کر سکتا تھا کہ نہیں۔ نہیں چلیں۔ مجھے اب تمہاری موجودگی درکار نہیں۔ تم میرے لیے فالتو ہو چکے ہو کہ میں نے ہی اُس کی منت سماجت کی تھی۔ اور اگر وہ اُس وقت انکار کر دیتا تو میں کب کا نیچے جا چکا ہوتا۔

میرے ذہن میں مسلسل یہ شک تو سر اٹھاتا تھا کہ یہ بندہ اتنا بے غرض نہیں ہو سکتا جتنا دکھائی دیتا ہے۔ ضرور کل سڑک کے یہ مجھ سے کچھ ریال نکال لے گا۔ ایک بھاری ہپ کا امیدوار ہو گا تبھی تو اتنا ہمدرد اور مددگار ہے ورنہ میرا کیا لگتا ہے۔ جیسے تاریخی نوعیت کی حامل عمارتوں۔ ریلوے سٹیشنوں اور ایئر پورٹوں کے باہر سیاحوں کے غنچے جاکسیں ڈرائیو ہوتے ہیں۔ ہاتوں میں موہ لیتے ہیں اور پھر آپ کو نکال کر دیتے ہیں تو اس مقام پر جہاں تاریخ کا آثار ہوا تھا یہاں جو شخص ہو گا اور اگر صرف ایک سیاحی ہے تو کبھی بھی اُس کا اثر نہیں تھا۔ اُس میں جو بے غرضی تھی اُسے صرف میری

بے غرضی مشکوک بناتی تھی ورنہ۔ یہ اُس کی خصلت اُس کی جبلت تھی کہ وہ میرا ساتھ دے رہا تھا۔ کسی بھی لالچی یا فائدے کے لیے نہیں کہ ایسے لوگوں کی گفتگو نہایت لچھے دار اور محرکیز ہوتی ہے جب کہ نیاز بہت کم بولتا تھا ایک سادہ شخص تھا۔ اور جب وہ جبل نور کے تھوڑے سے اترتی سیڑھیوں پر میرے آگے آکر رہا تھا تو اُس کے اترنے سے میں نے بھانپ لیا کہ یہ شخص کوئی غرض نہیں رکھتا۔ آخری سیڑھی کے بعد جب بابا بنگالی کا چھتر آیا تو اُس نے میرا انتظار کیا کہ میں ہر سیڑھی پر ٹیم اندھیارے میں دیکھ بھال کر قدم رکھتا تھا۔

تاریکی بڑھ گئی تھی۔ نیچے سے بلند ہونے والی لومزید مدھم ہو چکی تھی۔

ہم دن میں نہ تھے ایک رات میں تھے۔

"چلیں صاحب۔" وہ سرنگ کے دہانے پر میرا منتظر تھا۔

چوٹی تارچ جس کی روشنی کی مدد سے میں سیڑھیاں اترتا تھا اب میں نے اُس کا رخ سرنگ کے اندرون کی جانب کیا اور نیاز کے ہمراہ اندر چلا گیا۔ بے خطر اور ہر پتھر سے آشنا ایک ایسے کوہ پیما کی مانند جو بہت باران راستوں پر چل چکا ہے۔ بے جھجک راستے کے ہر پتھر سے آگاہ چلتا ہے۔

جب ہم صحن میں داخل ہوئے تو نیاز کہنے لگا "صاحب آپ تو ایک پھرٹ ہو گیا ہے۔ لیکن آپ کا سامان کہاں ہے۔ اوپر تو نہیں چھوڑ آئے۔"

"نہیں۔ غار میں ہے۔"

نیز اُس پر غالب آ رہی تھی۔ ہم تھوڑی دیر باتیں کرتے رہے۔ صحن کی دیوار کے ساتھ لگ کر تاریکی میں ڈوب جانے والی وادی پر نظر کرتے اور اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ اور پھر اُس نے سرنگ کے قریب صحن میں سے جبل نور کی چوٹی تک اُٹھتی چٹان کے پہلو میں اپنا کھیس بچھایا بازو کیلئے کر اُس پر سر رکھا اور لمحوں میں بے سدھ ہو گیا۔ نیز میں چلا گیا۔ اُس چٹان کے برابر میں اُس کا ایک ساکت حصہ ہو کر اُدھل ہو گیا۔

تاریکی نے اُسے گم کر دیا تھا۔

اگرچہ وہ موجود تھا۔ لیکن ظاہر نہ تھا۔

اگر کوئی بھی شخص سرنگ کے راستے صحن میں داخل ہوتا تو اُسے اُس کی موجودگی کا شک بھی نہ ہوتا۔ وہ چٹان کے لگا اندھیرے میں اُدھل ہو چکا تھا۔ ظاہر نہ تھا۔

تو دراصل یہ وہ ساعت تھی جب میری رات کا آغاز ہوا تھا۔

یکدم ایک اور دوسو سے نے آن گھیرا۔ تم ڈرے تو آزاد ہو گئے ہو موت سے تو نہیں۔ اگر یہاں موت آگئی تو پھر کیا ہوگا۔ اس عمر میں چل چلاؤ کا چلن ہو جاتا ہے۔ کچھ پتہ نہیں کب چٹھی آ جائے۔ اکیڈ آئے اور بلاوے کی چٹھی یہیں تھما دے۔ دل یکدم ساکت ہو جائے۔ کھلی آنکھیں ایک لمحے دیکھتی ہوں اور دوسرے لمحہ مردہ اور پتھر ہو جائیں۔ کسی شریان میں کوئی انک آ جائے۔ دماغ کی کوئی رگ بسیدہ ہو کر ڈھسے جائے۔ چل چلاؤ کے ان موسموں میں کچھ بھی ہو سکتا تھا یہاں کچھ ہو گیا تو کیا ہوگا۔ لیکن اس ۳۰ سے اس دھڑکے سے بھی یکدم اسی لمحے میں نجات مل گئی۔ یہ بے اثر ایسا ہوا کہ جیسے کبھی تھا ہی نہیں۔ اور اسے بے اثر اس خیال نے کیا کہ قربت مرگ تو ہے۔ دو چار پل نہیں تو دو چار دن یا چلو دو چار برس ہی آسکی۔ آئے گی تو سہی۔ تو اگر یہیں آ جائے۔ غار حرا میں۔ اپنے بابا کے ڈرے پر تو کم بخت تھے اور کیا درکار ہے۔ تمہیں کوئی قلق ہوگا دنیا چھوڑ جانے کا۔

بے شک میں نے ہرگز یہ تمنا نہیں کی کہ مجھے یہیں موت آ جائے لیکن میں اس کے دوسو سے یوں یکسر آزاد ہوا کہ پھر آئندہ دنوں میں کبھی ایسا نہ ہوا۔ ہمیشہ اس ڈر کا اسیر رہا۔ صرف وہ ایک رات تھی جب میں اس کے خوف سے یکسر آزاد ہوا۔

میں یکسرے کے علاوہ جان بوجھ کر اپنے ہمراہ گھڑی بھی نہیں لایا تھا۔ صرف اس لیے کہ بابا کے زمانوں میں وقت کی رفتار کا تعین کرنے کے لیے یہ پیمانہ نہیں ہوا کرتا تھا۔ گزرتے لمحوں کا حساب چاند ستارے اور ہوائیں تھیں۔ شا میں راتیں اور سوریں تھیں۔

تو میں بھی انہی قدرتی پیمانوں پر انحصار کرنا چاہتا تھا۔ جیسا کہ بابا کیا کرتے تھے۔ اس لیے میں نہیں جانتا تھا کہ اس ساعت جب نیاز اس چٹان کے برابر میں لیٹ کر سپاہی میں اوجھل ہوا اس لمحے دنیا بھر کی گھڑیوں کی سوئیاں کہاں اور کون سے ہندسے پر تھیں۔

وقت چل بھی رہا تھا یا ختم چکا تھا نہیں جانتا۔ جبل نور کے چپتر سے ڈراوائیں جانب ایک مدھم روشنی والا بجھا بجھا سا چاند ابھرتا تھا۔ پھر وہیں کا تھا کہ شب بھر رہا چہ چاترا۔ بارہویں کا تھا۔ اور اس کے باوجود شب بھر رہا چہ چاترا۔

اس بے زور چاند کی اوت میں۔ یا آس پاس۔ دور پار کوئی ستارہ نہ تھا۔ مجھے آس تو یہی تھی کہ غار حرا کی رات میں میرے اوپر ایک ستاروں سے اُلجھا ہوا اور اُڑتا ہوا۔ بے شمار اور بے حساب ستاروں پر آسمان ہوگا۔ ایسے ستارے جو دریاے سندھ کی ایک شب میں اس کے پانچوں پر کمیش سے ٹانگے ہوئے اپنے کی مانند بچھ دیکھتے۔ اُسے دکھائی دیتے تھے لیکن اس بجھے ہوئے چاند نے اُن کو بھی بھار کھا

جب نیاز کی موجودگی کے باوجود میں یکسر شہروں کی ماں مکہ کے بزرگ اور سب سے بڑے پہاڑ۔ جبل نور پر۔ یوں تنہا ہوا جیسے انسان قبر میں تنہا ہوتا ہے۔ شاید یہ مثال درست نہیں اُترتی۔ کہ قبر میں تو حساب کتاب ہوتا ہے اور انسان اپنی مرضی سے تو ہرگز وہاں نہیں جاتا۔ یہ تو بابا کا گھر تھا یہاں کیسا حساب کتاب اور یہاں میں خواہش کر کے بڑے تردد سے آیا تھا۔ تو یہ مثال درست نہیں۔ دراصل یہ ایک ایسی تنہائی تھی جس کی کوئی مثال نہیں۔

مجھے ابھی غار کے اندر جا بیٹھنے یا جا کھڑے ہونے کی کوئی جلدی نہ تھی کہ میرے پاس پوری رات تھی۔

البتہ یہ رات میری توقع سے قدرے برعکس تھی۔ اس رات کی خواہش کرتے۔ اس خواہش پر دم نکلتے۔ ہزاروں نہیں بس اس خواہش پر دم نکلتے میں نے سوچا تھا کہ اگر یہ کبھی ممکن ہو گیا تو میں غار حرا کی رات میں اس پر جو آسمان کا خیمہ تہا ہوگا اُسے تادیر دیکھتا رہوں گا۔ اور اس آسمان پر ستارے ہوں گے۔ میں رات بھر اُن ستاروں کے چلن کو۔ اُن کی مدھم مسافت کو نظر میں رکھوں گا۔ کہ کیسے وہ دھیرے دھیرے غار کے آسمان پر اپنا سفر مکمل کرتے ہیں۔ کہ میری نگاہ کا زاویہ وہی ہوگا جو میرے نبی کی نگاہوں کا تھا۔ جس جگہ پر وہ کھڑے ہوتے تھے۔ چلتے تھے وہیں کھڑے ہو کر بیٹھ کر گویا اُنہی کی نگاہوں سے ستاروں کی چال کا مشاہدہ کروں گا کہ سرشام وہ کہاں نمودار ہوئے۔ پھر جب رات اُترتی تو وہ کیسے ٹھٹھائے اور آسمان کے کون سے حصے میں۔ یوں ہر ساعت کے گزرنے سے وہ بھی نامعلوم انداز میں حرکت کرتے رہیں گے اور میں اُن پر نظر رکھوں گا صرف اس لیے کہ میری آنکھیں بابا کی آنکھیں ہو جائیں اور میں بھی اُنہی ستاروں کو اُسی مقام سے اُسی زاویے پر دیکھتا رہوں۔ شب بھر کے سفر کا مشاہدہ کرتا رہوں۔

یہ رات میری توقع سے قدرے برعکس اس لیے ہوگئی کہ آسمان پر ابھی تک ستارے نہ تھے۔ چاند جو جبل نور کی چوٹی پر سے ابھی تک جھانکتا تھا اور غار حرا کے اس صحن میں اپنی بجھی بجھی روشنی بچھانے کو تھا اُن کو ظاہر نہ ہونے دیتا تھا۔

آج چاند کی بارہویں تاریخ تھی۔ مہینہ شعبان کا۔

مجھے پہلی بار اس کی بجھی بجھی چاندنی نے دکھ دیا۔

میرے لیے ستاروں کی مسافت زیادہ اہم تھی۔

واقعی۔ اور اس کنج تنہائی میں ہوا کم کم آتی تھی۔

میرے لیے پہلی بار یہ تھا کہ اس کے واسطے میں پوشیدہ تھا۔

میں تنہا ہوا تو پہلے یہی سوچ آئی کہ ابھی تو پوری رات پڑی ہے۔ اوپر تھڑے چار مولوں اور ٹرائوں نے چین نہ لینے دیا تھا اور کعبہ کا کھلونا آنکھیں بند نہ کرنے دیتا تھا تو اب کچھ دیر آرام کر لیا جائے۔ چڑھائی کے دوران جو رگیں کھینچ کر پتھر ہو رہی ہیں اور پنڈلیوں کے ہاتھوں میں جو بے چینی ہے اس کا دوا کیا جائے۔ تو یہ آرام کیسے کیا جائے۔

غار حرا میں بچے اپنے مصلے پر ٹانگیں پھیلا کر سونے کی سعی کروں۔ نیند سے ناکا ہو جانے کی کوشش کروں۔

پھر بدن میں ایک سنسنائٹ سی دوڑ گئی کہ۔۔۔ یہ تو ایسی رات نہیں۔ تمہاری حیات کی ہزاروں معمولی راتوں ایسی رات تو نہیں۔ یہ تو کچھ اور ہی معاملہ ہے۔ کوئی اور رات ہے۔۔۔ جو نہ پہلے کبھی آئی اور نہ آئے گی۔

اب ہوا یہ کہ قطعی طور پر۔۔۔ غیر ارادی طور پر جیسے باب السلام میں داخل ہو کر بابا کی آرام گاہ تک چلتے ہوئے کچھ فلمی قسم کی نعیتیں بدن میں جھومنے لگی تھیں بالکل ویسے کیا نا واجب اور بے ادبی کی حد میں داخل ہوتا ایک تیز دھن والا فلمی نغمہ میرے ذہن میں گونجنے لگا۔

’ساقیا آج مجھے نیند نہیں آئے گی‘

’نا ہے تیری محفل میں رت جگا ہے‘

جیسے حسرت کی ایک کچھ کے نزدیک عامیات اور فاسقانہ غزل نے روضہ رسول میں سارا ساتھ یوں دیا تھا کہ ظاہری معانی یکدم بے معنی ہو کر رہ گئے۔ اور انجمن جمال یار سے۔۔۔ روشن ہو گئی۔ تمام ا تو ایسے ہی اس عامیات فلمی گانے کی معانی کچھ اور ہو گئے اور ہر مصرعہ میری کیفیت کے اظہار کے لیے مامور کر دیا گیا۔

گزارش حوض کوثر کے ساقی سے ہو رہی تھی۔

اے ساقی کوثر۔

مجھے نیند نہیں آئے گی۔

’سنائیں۔۔۔ یہ یقین ہے کہ آج تیری اس محفل میں تیرے اس گھر میں رت جگا ہے۔‘

بے شک رگوں اور پنڈلیوں میں بے چینی تھی جو دور ہوئی۔ کہ ساقیا آج مجھے نیند نہیں آئے گی۔ آرام طلبی کی خواہش رخصت ہو گئی۔ آٹھ گھنٹوں میں نیند تھی اور نہ بدن میں کچھ تھکاوٹ۔

تو اس رت جگے کا آثار کیسے کروں۔

اپنے گروں کہ جب بابا اپنے کعبہ کے کمرے اور چہند میں ملبس سرگم میں سے گزر کر محفل

کہیں کوئی سرسراہٹ نہ تھی۔ نہ ہوا تھی اور نہ زندگی کی کوئی علامت۔ بس ایک گہری خاموشی تھی۔ ایک خاموش چُپ تھی۔ ایک بھید بھرا سناٹا تھا جس میں محفل کی دیوار پر ہاتھ رکھے میں تاریکی میں گم ہو چکی واوی کو تکتا تھا۔ کہیں دو چار ٹٹماتی روشنیاں تھیں ورنہ ہر سواند حیران راج کرتا تھا۔ دیوار سے گرنے والی کھائی کا کوئی ایک پتھر بھی بھائی نہ دیتا تھا۔ کوئی ایسا پتھر جس پر کچھ دیر پہلے ہنومان جی کودتے اور آنکھیلیاں کرتے تھے۔

ایک گہری چپ تھی جو ایک سیاہ لہارے کی مانند مجھے ڈھانپ کر مزید چپ ہو جاتی تھی۔ اوپر۔۔۔ جبل نور کے تقریباً ہر پتھر پر جس کا رخ غار حرا کی جانب تھا بھدے انداز میں جو ”اقراء بہ اسم ربی“ پینٹ کیا ہوا تھا وہ بھی تاریکی میں نظر نہ آتا تھا۔ نہ صرف وہاں بلکہ غار کے اندرون میں ہر پتھر پر نہایت بھدے انداز میں سرخ پینٹ سے ”غار حرا“ یا ”اقراء“ لکھا ہوا تھا۔ کسی پینٹ کرنے والے پرش یا شاید کسی ٹہنی کو پینٹ میں ڈبو کر ان پتھروں کا ستیاناس کیا گیا تھا۔ یہاں تک کہ غار کے اندر لوگوں نے اپنی حاضری کی گواہی کے طور پر اپنے نام کھودے ہوئے تھے۔ مار کر سے ”اللہ وسایا۔ گاؤں دین پناہ“ اور ”نعمت گل خان۔ مانسہرہ“ قسم کے نام لکھے ہوئے تھے۔ آپ جان گئے ہوں گے کہ اس قسم کی ناپاب خطاطی کے جو ہر صرف پاکستانی ہی دکھاتے ہیں۔

صد شکر کہ یہ قباحتیں اور بدنمائیاں رات کی تاریکی میں دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔ چٹانوں اور غار کے اندرون کے پتھروں پر یہ آنکھوں کو دکھ دینے والی تحریریں نظر نہ آتی تھیں۔ تاریکی نے اُن عبارتوں کو اوجھل کر کے جبل نور غار حرا کے اندرون اور اس کے ماتھے اور محفل کو وہی شکل وہی ہیئت عطا کر دی تھی جس شکل اور ہیئت میں بابا اُنہیں دیکھا کرتے تھے۔

میں جب بابا کی دیکھی جانے والی شکلوں۔ پتھروں اور چٹانوں کے درمیان یکسر تنہا ہوا ہوں تو ایک اور خیال وارد ہوا کہ تم اب اس رات میں اس مقام پر تنہا ہو گے تو اب کیا کرو گے۔ کون کون سی دعائیں پڑھو گے۔ کتنے نفل ادا کرنے کا ارادہ ہے۔ کیا کیا اپنے ذہن میں لاؤ گے۔ تصور کے پردے پر کون سی تصویریں مقصور کرو گے۔ بابا کے گھر میں رہو گے تو کیسے اُن سے رابطہ کرو گے۔ کس کس کو یاد کرو گے۔ سچی بات ہے کہ مٹی نے اُن سلسلے میں کچھ محسوس بندی نہ کی تھی۔ ساری توجہ اسی لگن میں صرف ہو گئی کہ کیسے پہنچوں گا۔ رات گزار سکوں گا یا نہیں۔ عبادت کا بھی کچھ خاص خیال نہ آیا۔ صرف یہی چاہا کہ میں پالتا تھا کہ بابا کے گھر میں رہنا ہے۔ اُن کی موجودگی محسوس کرنی ہے۔ اُن کے اٹھنے بیٹھنے کے انداز اپنانے ہیں۔ اور شب کے گزرنے کا یوں مشاہدہ کرنا ہے جیسے بابا کرتے تھے۔

سازشی سے ذور بہر طور ایک حقیقت ہے جسے جھٹانا مشکل ہے۔

انہوں نے متعدد بار فرمایا کہ میں بھی تم جیسا ایک انسان ہوں صرف اس فرق کے ساتھ کہ مجھ پر وہی اُترتی ہے۔

اور اللہ کی توصیف ہو کہ یہ کیسا فرق ہے۔ جو سب کائناتوں میں انہیں سب انسانوں کا فہم اور مانتا ہے۔

تو ایک انسان یونہی لاشعوری طور پر اس کھوہ میں داخل ہوتے ہوئے انہی پتھروں کا سہارا لیتا تھا جن پر میری ہتھیلیاں تھیں۔

اُس شب۔

غار حرا کی اُس رات میں۔

سینکڑوں نہیں تو درجنوں بار میں غار میں سے نکلا۔ صحن میں آیا اور پھر سے اُس کے اندر داخل ہوا۔ جان بوجھ کر بار بار۔

کبھی ایک بچے کی بے پروا چلبلاہٹ کے ساتھ جس میں تجسس ہے۔

کبھی ایک گھٹنوں تک آئی ہوئی داڑھی والے خفیدہ کمر بزرگ کی مانند۔

کبھی یونہی۔ جیسے برقی بلند یوں پر کوئی کوہ نور اپنے سامنے ایک کھوہ کو دیکھتا ہے تو اُس کے اندر جانے بغیر وہ نہیں سکتا۔

تو میں کبھی یونہی خالی الذہن ہو کر۔ جیسے یونہی ٹھہرتا ہوا وہاں آ نکلا تھا اور اُسے سامنے پا کر۔ کہ ہلا اس غار میں جھانکتے ہیں اس کے اندر قدم رکھتے ہیں۔

کبھی سرسری طور پر جیسے وہ کوئی بھی غار ہو۔ چلا اس میں بدھ عہد کی نشانیاں سنہا لے کوئی غار ہو۔ فرانس یا چین کی وہ غار ہو جس کے اندر قدیم ترین انسانوں نے معشوری کی ہو۔

میں سرنگ سے۔

سو ڈھنگ سے۔

بار بار غار حرا میں داخل ہوا۔

صرف اس لالچ میں کہ کبھی نہ کبھی تو میرا ہاتھ وہیں جھپٹ ہوگا جہاں بابا نے ہاتھ رکھا تھا۔ میں

اس مقام پر میری ہتھیلی ان کی ہتھیلی سے مل جائے گی۔

اور یقیناً ایسا ہو گیا ہوگا۔

اس میں تو کوئی شک نہیں کہ مجھ سے پیشتر اس غار میں کروڑوں لوگ داخل ہوئے ہوں گے۔

میں داخل ہوتے ہوں گے تو کیسے داخل ہوتے ہوں گے۔ یہاں سے اس رات جگے کا آغاز کروں۔

میں واپس دو چار قدم سرنگ کے اندر گیا اور پھر رخ صحن کی جانب کیا۔ سرنگ کے اندر سے

صحن کچھ کچھ دکھائی دے رہا تھا۔ اگر رات کو آتے تو ایسے دکھائی دیتا ہوگا۔ پھر میں نے آرام سے وہی

دو چار قدم اٹھائے تو سرنگ کی تاریکی سے آگے آ گیا۔ صحن میں آ گیا۔ وہیں قدم رکھنے کی کوشش کی جہاں

سرنگ میں سے باہر آتے ہوئے کوئی بھی شخص قدرتی طور پر رکھ سکتا تھا۔ چار پانچ قدم آگے جو دیوار تھی وہ

تب نہ تھی۔ تو وہ احتیاط سے کنارے تک جاتے ہوں گے۔ کھائی میں جھانکتے ہوں گے۔ پھر اپنی توجہ غار

پر مرکوز کرتے ہوں گے۔ لیکن پہلے اپنا خوراک کا تھیلا کمر سے اتار کر کہیں رکھتے ہوں گے کہ غار کے اندر

اتنی جگہ ہرگز نہیں کہ وہاں کچھ سامان بھی رکھا جاسکے۔ اور اُسے کہیں قریب رکھنا تھا صحن میں نہیں کہ وہاں وہ

مارموٹ بھی اُن دنوں ہوں گے اور شاید بندر بھی۔ اور بندر تو ہر شے اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ اور قریب

ترین جگہ غار میں بیٹھے ہوئے شخص کے لیے غار کے دہانے کے دائیں جانب جو ہموار پتھر تھا وہی ہو سکتی

ہے۔ چنانچہ وہ اپنی گٹھڑی اسی ہموار پتھر پر رکھتے ہوں گے جہاں میرا تفتی تھیلا پڑا تھا اور جو گر پڑے

تھے۔ کیسے؟۔ یوں جھک کر۔ اور میں جھکا اور جیسے جھک کر وہاں اپنا تھیلا رکھا اور پھر سیدھا کھڑا ہو گیا۔

اب میرا رخ غار کی جانب ہے۔ غار کی چھت کے پتھر میرے سر سے ذرا نیچے۔ دو چار انچ نیچے جھکے ہوئے

ہیں۔ میں سیدھا کھڑا چلتا ہوا اندر نہیں جاسکتا۔ مجھے اپنی پیشانی کو بچانا ہے۔ تو جھکتا ہوں۔ گردن نیوڑھا

کر اندر داخل ہونے کے لیے جھکتا ہوں۔ جھکتے ہوئے یہ تو نہیں کہ میرے ہاتھ لٹکے ہوئے ہیں میں اُن

سے کوئی کام نہیں لے رہا۔ بلکہ میں انہیں کسی نہ کسی نزدیکی پتھر پر رکھوں گا سہارے کے لیے۔ جیسے کوئی

بھی شخص ایک کھوہ کے اندر جاتے ہوئے سر جھکا کر کہیں نہ کہیں اپنے ہاتھ رکھتا ہے سہارے کے لیے۔

اور وہ کہیں نہ کہیں۔ ایک ہی جگہ ہوتی ہے جہاں قدرتی طور پر لاشعوری طور پر۔ بغیر سوچے

سمجھے۔ خود کار طریقے سے ہاتھ رکھا جاتا ہے۔

نہ زیادہ اونچائی پر اور نہ ہی نیچے۔ بس وہ شخص وہاں ہاتھ رکھتا ہے جہاں پر وہ خود بخود جاتے

ہیں بدن کو سہارا دینے کے لیے۔

یہ نہیں کہ ہر انسان ایک مختلف جگہ پر ہاتھ رکھتا ہے اندر داخل ہونے کے لیے۔ بے شک قد کی

مناسبت سے ایک دو بالشت کا فرق آتا ہو لیکن ہمیشہ غیر شعوری طور پر ہاتھ ایک ہی مقام پر پڑتا ہے۔

اور بابا کا قد بھی۔ میرے جتنا تھا۔ بلکہ میرا قد۔ یہ فنا ہو جانے والا قد بھی اتنا تھا۔ تو اس میں

کچھ زیادہ شک نہیں کہ جب بھی۔ اور سینکڑوں بار وہ اس کھوہ میں داخل ہوئے تو اُن کے ہاتھوں نے انہی

جگہوں پر اپنی ہتھیلیاں جمائی تھیں جہاں میں اپنی ہتھیلیاں رکھتا تھا۔ یہ تصویر کی کرشمہ

ہزاروں نے یہاں رات بسر کی ہوگی۔

اور ان سب نے غار میں داخل ہوتے ہوئے شاید انہی پتھروں پر ہاتھ رکھے ہوں گے۔

لیکن ان سب کے لمس کو دوام حاصل نہیں تھا۔

دوام صرف بابا کے ہاتھوں میں تھا۔ ان کے لمس میں تھا۔

صرف ان کا نقش باقی ہے۔ اس کے سوا۔ فنا! فنا!

تو میں اس نقش پر۔ ہاتھ رکھتا تھا اور وہ میرا ہاتھ تمام لیتے تھے یا احساس ہوتا تھا۔ اور ان کے

اور میرے درمیان جو کروڑ ہا نقش تھے وہ فنا میں جا چکے تھے جیسے میرے اس نقش نے بھی مٹ جانا تھا۔

لیکن مٹ جانے سے بیشتر بابا کی ہتھیلی کی گرمی جو اس پتھر میں دکتی تھی اُسے محسوس کرنا تھا اور اس کے بعد

اگر مٹ جانا تھا تو کیا غم۔ اس گرمی نے تو روز حشر تک ساتھ دینا تھا۔ آتش دوزخ سے میری سفارش کرنی

تھی کہ تو اس پر اثر نہ کر۔ اس پر میرا اثر ہو چکا ہے۔

شاید میرے قاری کو گمان گزرے کہ میں قدرے تفصیل میں چلا ہی جاتا ہوں۔ تو وہ نہیں جانتا

کہ میں تو دل پر جبر کر کے بیان مختصر کرتا ہوں۔ سرسری کرتا ہوں۔ ورنہ سب سمندروں کی روشنائی شتم

ہو جاتی اور سب درختوں کی قلمیں بیکار ہو جاتیں تب بھی اس شب کی ایک ساعت کا بیان مکمل نہ

ہوتا۔ میں تو مختصر کرتا ہوں۔

اندرو داخل ہوا۔

یعنی جھک کر اپنے سر کو بچاتا پتھروں کا سہارا لیتا۔ دو قدم اٹھائے تو اندر داخل ہوا۔

فرش پر جو مصلیٰ بچھا تھا اس پر اگلا قدم آیا۔

ظاہر ہے میں ننگے پاؤں تھا۔

دہانے کے قریب ہموار سطح والے پتھر پر میرا تہتی تھیلا ڈھلکا ہوا پڑا تھا۔ برابر میں میرے جوگر

دھرے تھے۔ سگریٹ تھے۔ اور ٹشو پیپر تھے۔ اور نارنج تھی۔

پہلی بار۔ یعنی جب نیاز خواہیدہ ہو کر چٹان کا حصہ ہو گیا۔ میں تنہا ہو گیا۔ جبل نور کی رات میں

ہوا۔ غار میں داخل ہو گیا تو تادیر کھڑا رہا۔ سر کھاتا رہا کہ اب کیا کروں۔

سوئے کی سعی کرنا ہی ہو تھا کہ رستہ جگمگا تھا۔

تو اب کیا کروں۔ چراکی غار کے ہر پتھر۔ ہر مسام۔ اور ہر اُبھار کو چوموں۔ کہ وہاں تو ان کے

نار کو جن آوازے ترچھے پتھروں نے دبو دیا تھا۔ ان کے درمیان میں جو چھوٹے چھوٹے

کروں۔ کیا کروں۔

بہت سے لوگ ہاتھوں میں کیلکولیٹر لیے پھرتے ہیں۔

اس مقام پر ایک نماز پڑھنے سے چالیس ہزار نمازوں کا ثواب ہوگا۔

یہاں دو نفل پڑھ لینے سے جنت کے مخلوں میں جگہ مل جائے گی۔

ایسے لوگ جو مجھ سے برتر۔ عقیدے میں مجھ سے بڑھ کر پختگی رکھتے ہیں۔

کہیں ذرا بھر عجائباتِ شکر کی نہیں رکھتے جن کا روز حشر کچھ حساب کتاب نہ ہوگا اور میرے تو

دھڑکے رجسٹر کھل جائیں گے اور کوئی بھی بڑے سے بڑا چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ ان میں سے میری بخشش کا

کوئی ایک جواز بھی تلاش نہ کر پائے گا۔

میں شروع سے ہی حساب کے پرچے میں رعایتی نمبروں سے پاس ہونے والا تھا۔

تو یہاں بھی کچھ حساب کرنا اُسے کتاب کرنا میرے بس میں نہ تھا کہ میں بابا کے گھر میں پائی

کراپے نامہ اعمال میں نوافل اور نمازوں کے طویل اندراج کر لیتا۔ چنانچہ میں نے یہ پرچہ جو میرے

اُس میں نہ تھا خالی چھوڑ دیا۔ غار میں داخل ہوا تو مصلیٰ پر چوڑی مار کر بیٹھ گیا۔ دو نفل اور ادا کر لوں۔ وہ

میں کر لیے۔ تو اب کیا کروں۔ اب میں لیٹ گیا۔ صحن کی جانب پاؤں کر کے۔ تہتی تھیلا کو سر ہانے رکھ

کر۔ اس پر اپنا سر رکھ کر لیٹ گیا۔

غار حرا کے صحن میں ایک دھندلی مکر چاندنی تھی۔

میرے پاؤں تک آتی کچھ مکر چاندنی تھی اور میرا بقیہ وجود تاریکی میں تھا۔

جہاں میں لیٹا ہوا تھا وہاں بائیں جانب جو چٹان اٹھتی تھی اس کے ساتھ لگ کر لیٹا ہوا تھا۔

اور دائیں جانب سنگ مرمر کی دو چار سلوں کے پہلو میں جو پتھر غار کا حصہ اس کی دیوار تھے

انہیں ہاتھ بڑھانے سے میں چھو نہیں سکتا تھا۔

جب میں نے اپنے بدن پر۔ اور برابر میں جو خالی جگہ تھی۔ وہاں وہاں اس ٹکپ اند میرے

میں چاندنی کے کچھ مختصر جزیرے دیکھے۔ نیم روشن دھبے دیکھے۔

غار کے اندھیارے میں وہ میرے بدن پر اور برابر میں سنگ مرمر کی سطح پر ٹھہرے

ہوئے تھے۔

کل چار پانچ جزیرے تھے۔

غار حرا کی سیاہی میں۔

غار کو جن آوازے ترچھے پتھروں نے دبو دیا تھا۔ ان کے درمیان میں جو چھوٹے چھوٹے

شکاف تھے جن سے ہوا آتی تھی اب ان میں سے چاندنی نازل ہو رہی تھی۔

اسی چاندنی کے یہ جزیرے تھے۔

میں گھٹا ٹوپ غار کے اندرون میں لیٹا ہوا اور وہ مجھ پر اور برابر کے فرش پر اور ہاں سامنے والی چٹان پر بھی روشن ہوتے تھے۔

آج سے چودہ سو برس پیشتر وادی مکہ میں سرشام جو چراغ جلانے جاتے تھے وہ کب کے گل کر دیئے گئے ہوں گے۔ چند ایک قدیلیں جو روشن کی جاتی ہوں گی انہیں رات کے اس سے تک بچھا دیا جاتا ہوگا اور وادی مکہ پر مکمل تاریکی کا رواج ہوتا ہوگا۔

تو ان زمانوں میں بھی۔

کہ چاند تو اپنی گردش اور خصلت نہیں بدلتا۔ اس غار کے اندر چاند کی انہی راتوں میں شکافوں کے راستے داخل ہونے والی چاندنی میں یہی جزیرے عین انہی مقامات پر جہاں وہ تھے تب بھی نمودار ہوتے ہوں گے۔

یعنی میں یہاں صرف آج نہیں تھا۔ چودہ سو برس پیشتر بھی ہو سکتا تھا۔

تب بھی رات کی ان ساعتوں میں یہی جزیرے انہی مقامات پر نمودار ہوتے تھے۔

اگر کوئی شخص میرے قد بُت کا تب یہاں لیٹتا تھا تو یہی جزیرے اُس کے بدن پر بھی روشن

ہوتے تھے۔

چاندنی کے آگے وقت ختم گیا تھا۔

عجیب انہونا منظر تھا۔

جو بہت سوں نے دیکھا تو ہوگا لیکن کبھی بیان نہ کیا اس لیے یہ میری حیرت کے سمندر پر بھی ہوئی چاندنی کی ایک ایسی کشتی کی مانند ساکت تھا جسے میں نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔

اور جو پہلے کبھی نہ دیکھا ہو اور کبھی گمان بھی نہ ہوا ہو کہ ایسا دیکھا جانا ممکن ہے تو وہ منظر ایک معجزے کی قربت میں ہو جاتا ہے۔

میں جانتا ہوں کہ میں بہت بار بہت منظروں اور بہت کیفیتوں کے بارے میں یہ کہہ چکا ہوں کہ ان میں سے ہر ایک منظر اور ہر کیفیت کے بارے میں میں ایک کتاب لکھ سکتا ہوں۔ اس میں قطعی طور پر میں اپنے ذہن و بیان کے گھنڈھیل ادا نہیں کرتا۔ جہاں مجھ سے کچھ بیان ہی نہیں ہو پاتا تو وہاں اُس بیان میں زور کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ تو وہ منظر ہے وہ کیفیت ہے جو ایک کتاب کی سورت ہے۔ تو چاندنی کے ان جزیروں پر ساکت جو یہ بھی ہوئی چاندنی

کی کشتیاں ہیں۔ یہ خود ایک کتاب ہیں اور میرا بجز بیان چند حرفوں سے آگے جانے کی سکت نہیں رکھتا۔

یہ چند جزیرے چاندنی کے۔ غار حرا کی رات میں۔ یونہی تو میرے بدن کو ایک حیرت اور اکہ میں جٹا نہیں کرتے تھے۔ دنیا بھر میں اسی ساخت کی ہزاروں غاریں ہوں گی جن میں شکاف ہوں گے اور ان میں سے چاندنی اُترتی ہوگی۔

فرق صرف یہ ہے کہ یہ چاندنی اس کے نیم روشن دھبے بابا کے بدن پر بھی ایسے ہی اُترتے ہیں گے جیسے میرے بدن پر اُتر رہے تھے۔

وہ جب کبھی یہاں آتے تھے۔ اس غار میں ہر وقت تو عبادت اور سوچ بچار میں مگن تو نہیں رہتے تھے۔ آرام بھی کرتے تھے۔ تو شب کے انہی لمحات میں چاندنی کے یہ جزیرے۔ شکافوں میں سے نازل ہوتے۔ ان کے کھدکے کرتے میں سے سرایت کرتے ان کے بدن پر بھی پڑتے ہوں گے۔ اور کچھ شرمندہ ہوتے ہوں گے کہ یہ بدن تو ہم سے بھی کہیں منور اور روشن ہے اور ماند پڑ جاتے ہوں گے۔ اور چاندنی کے یہ پھاہے وہیں وہیں ان کے وجود پر ٹھہرتے ہوں گے جہاں وہ میرے بدن پر نمایاں ہو رہے تھے۔

جہاں جہاں۔ چاندنی کے یہ پھاہے میرے دکھتے بدن پر رکھے ہوئے تھے۔

میں۔ حرکت نہ کرتا تھا کہ کہیں یہ آگے پیچھے نہ ہو جائیں۔ میرے بدن سے گرنہ جائیں۔

گر گئے تو کھو جائیں گے۔ دوبارہ نصیب میں نہ آئیں گے۔

غار میں اس کے سوا کسی اور پہلو سے یا انداز میں لینا نہیں جاسکتا تھا جیسا میں لیٹا ہوا تھا۔ گھبراہٹ نہ تھی۔ تو پھاہے چاندنی کے وہیں وہیں تھے جہاں آج سے چودہ سو برس پیشتر وہ چاندنی راتوں رات کے اس پہر میرے حضور کے کُرتے پر اُترتے تھے۔

تاریکی میں۔ چاندنی کے یہ دھبے۔ اُسی سائز کے تھے جس سائز کے شکاف میں سے وہ گزر کر اُتر رہے تھے۔

ان میں سے صرف دو روشن نشان مجھ پر ٹھہرے ہوئے تھے۔ میرے بدن پر۔ ایک سینے کے اچھے ٹھکانے پر اور دوسرا دائیں بازو پر۔ لیکن مکمل طور پر نہیں۔ اُس کا کچھ حصہ فرش پر بھی نمایاں ہو رہا تھا۔

چاندنی کے بقیہ دھبے۔ ایک میرے سر کے پیچھے ایک پھر پڑکا ہوا تھا۔ دوسرا تنگ سرمری ٹلوں کے برابر میں ہو چکا تھا اور اُس کے درمیان میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اور ان کا حجم ملکہ تھا اُس شکاف کی

شاید میری اس تفصیل کی تحریر سے یہ تاثر ابھر رہا ہو کہ میں بہت اطمینان سے اور ایک حالت سکون میں یہ مشاہدہ کر رہا تھا۔ یہ سب کچھ اپنے اندر سونے اور اسے ذہن کی ڈائری پر نوٹ کرنے میں محو تھا۔ یہ عمل اتنا سلیقہ نہیں تھا۔

میرا بدن اور اس کے اندر جو روح تیرتی تھی، ہمہ وقت اور میرے بدن پر چلتے روکتے تھے اور میرا ہر منہ سب کے سب آگاہ تھے ہمہ وقت کہ ہم کہاں ہیں اور ان میں ایک دوسرا اضطراب مسلسل اٹھتا تھا جس میں خوش بختی اور اس مقام پر رات کرنے کی انمول سعادت مسلسل دھڑکتی اور دھڑکیں مارتی تھیں۔

یہ بھی نہیں کہ میں بس شکافوں میں سے اترتے چاندنی کے دھبوں میں ہی کھویا ہوا تھا یا صحن پر چاندنی سے بھرا ہوا تھا اسی میں گم تھا۔ نہیں۔ میں ایک پر لطف اضطرابی بحر میں مسلسل گرفتار سانس لیتا تھا۔

اور تب یکدم۔ جب میں بہت دیر تک تپتی تھیلے پر اپنا بازو سمیٹے اس پر سر رکھے چاندنی میں کھویا ہوا تو یکدم مجھ پر ایک گھبراہٹ سی وار ہو گئی۔

ایک حد سے نے سر اٹھایا۔ کہ بے شک اس سے تم جیل نور پر۔ اور اس کی کھائی میں پوشیدہ دھاتو کیا کائنات کی سب سے مقدس غار میں ہو۔ رات میں ہو۔ نہ کسی چاند اور نہ کسی مریخ میں ایسی کھو ہے۔ ابھی کھو میں تم ہو اور تنہا ہو۔ اس میں اطمینان سے لینے صحن میں پھیلی چاندنی کا نظارہ کرتے ہو مکمل غلوٹ میں۔ تو کیا پتہ کوئی اور۔ ادھر آٹھ۔ کوئی اور سر پھرا آوارہ گرد اس خیال کا اسیر ہو جائے کہ رات کے اس پہر غار خالی ہوگی تو میں زیارت کر لوں۔ یکسوئی سے دو لٹل تنہائی میں پڑھ لوں۔ کوئی اور بھی تو آسکتا ہے۔ ابھی سرنگ میں سے برآمد ہو کر صحن میں آسکتا ہے تو تنہائی کا یہ دھاگا ٹوٹ جائے گا۔ چاندنی کے یہ جزیرے ڈوب جائیں گے۔ یہ جو رابطہ ہے میری تنہا فضا کا اس غار سے اس کے صحن سے۔ ہر ایک پتھر سے اس میں دروازے آجائے گی۔ اس لیے کیا بیکار لینے چاندنی کے تنہائی بنے لینے ہو۔ اگر کوئی مرضی پیش کرتی ہے تو ابھی کرو۔ کچھ مانگتا ہے تو بس یہی وقت ہے۔ اگر کچھ پڑھنا ہے تو کتابی سے پڑھ لو۔ نہ کوئی آگیا تو مکمل تنہائی کا یہ بحر داخل ہو جائے گا۔ یکسوئی ابھر جائے گی۔ اگر کوئی آجائے تو تم اس سے یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ تم یہاں نہیں آ سکتے بھائی صاحب۔ یہ میری غار ہے اسے میں نے اپنا کھانا رکھا ہے۔ میں یہاں رہتا ہوں تم نہیں آ سکتے۔ نہیں کہہ سکتے۔ تو اس حد سے لے ایسی گھبراہٹ طاری کی کہ میں اٹھا۔ اور صحن کی جانب پشت کر کے کھڑا

مناسبت سے جس میں نقب لگا کر وہ غار میں داخل ہو رہے تھے۔

موسم کسی حد تک معتدل تھا۔ ہلکی گرمی تھی لیکن بدن کو بے چین نہ کرتی تھی۔

پسینے کا باعث نہ بنتی تھی۔

اور ایسا خوشگوار بھی نہ تھا کہ وجود کے لیے سرخوشی کا سبب ہو۔

صحن دھیرے دھیرے چاندنی سے بھر رہا تھا۔

اور صحن میں پھیلی ہوئی چاندنی جو میرے دونوں پاؤں کو روشن کرتی تھی۔ دھیرے دھیرے

سرکتی تھی۔ اور اب میری شلوار کے پائینوں تک آگئی تھی۔

میں اپنے پاؤں ذرا سیٹھ لیتا تو چاندنی کا وہ حصہ فرش پر بچھ جاتا۔

باکس ہاتھ پر سنگ مرمر کی سلوں کے آگے غار کے دہانے پر جو ہموار پتھر تھا اس پر میرا

سامان پڑا تھا اور جو گر پڑے تھے۔ ان میں سے ایک جو گر چاندنی میں آیا ہوا تھا۔

اگرچہ باہر چاندنی تھی اور غار کے اندر وہ چند دھبوں کی صورت موجود تھی لیکن اس کے باوجود

اندرون خاصا تاریک تھا۔ اتنا تاریک کہ ہموار پتھر پر جو گرز کے علاوہ میری تارچ۔ دودھ کی بوتل۔ تھیلی

اور بال پوائنٹ وغیرہ رکھے ہوئے تھے۔ وہ بالکل نظر نہ آتے تھے اور ان میں سے کسی ایک کو گرت میں

لینے کے لیے ذرا ٹولنا پڑتا تھا۔

تپتی کھیس کا رنگین دھاریوں والا تھیلیاٹکے کا کام دے رہا تھا اور میرے سر کو بقیہ بدن سے

بس اتنا اونچا رکھتا تھا کہ میں اطمینان سے اگر صحن کو دیکھتا ہوں تو مسلسل دیکھتا رہوں۔ اس میں اتاری

ہوئی چاندنی کی ٹو میں جو کچھ دکھائی دے رہا تھا۔ سامنے کی چٹان جس کے سائے میں نیاز روپاں تھا۔

اور صحن کا فرش۔ انہیں بھوکے نظروں سے تکتا رہوں کہ۔ بابا یہیں استراحت فرماتے شاید کسی پتھر کو

سرہانے رکھ کر یا شاید میری طرح اپنی پوٹلی پر سر رکھے اسی حالت میں اس صحن کو ہو بہو دیکھتے تھے

میں دیکھتا تھا۔

بہر صورت یہ طے ہے کہ بابا ماہ رمضان اسی غار میں گزارتے تھے۔

آج شعبان کی بارہویں تاریخ تھی۔

تو رمضان کے مہینے کی بارہویں تاریخ کو بھی وہ یہیں ہوتے تھے۔ اور تب بھی اسی قدر

چاندنی۔ انہی زاویوں پر صحن میں اترتی ہوئی۔

انہی شکافوں میں سے اسی قدر چاندنی۔ رات کے اس پہر وہیں لہایاں ہوتی ہوگی جہاں

وہ رہتا تھا۔

پر میرے بھول جانے سے کیا فرق پڑتا تھا۔

اُسے تو میں یاد تھا ناں۔

میں خود یہاں تھا ایک سفارش کے طور پر۔

تو وہ خوب جانتا تھا کہ میں بھی ہوں۔

میرا بھی کچھ بندوبست کرنا ہے۔

تو چٹا مت کرو وہ کر دے گا۔ دلوں کے حال جانتا ہے تو جودل میں ہے اُسے لبوں سے ادا

کر لے یا اپنے لیے درخواستیں کرنے سے فائدہ۔ یہ عبادتیں یہ رت جگے۔ ڈھک کے یہ سلسلے۔ یہ عرشیاں

دروازے تو محض اپنی تسلی کا سامان ہیں ورنہ دل زار کے حال وہ خوب جانتا ہے۔ اُس نے میرا بندوبست

کر دیا ہے چاہے میں کہوں یا نہ کہوں۔

اور بندوبست یہی کرنا ہے کہ جو اُس کی عنایتیں 'نوازشیں' کرم اور آسائشیں عطا ہیں وہ برقرار

ہوں۔ صحت تندرستی اور خوشی مجھے اور میرے بال بچوں پر جو رحمت ہے اسے جاری رکھے۔ کامیابیوں کی

سہ پائیاں مہربانیاں ہیں وہ اگرچہ بہت ہیں۔ میری جھولی بھری ہوئی ہے تو شکست کو ان سے دور

رکھنا۔ اور میرے ابا جی اور امی کو بہشت کے محلوں میں راجہ اور رانی کر دے۔ اور میری موت کو آسان کر

دے۔ وہ حیرت ہاتھ میں ہے اُس سے آگے جس گھر میں آج شب مقیم ہوں اس گھر والا بابا میرا ہاتھ تھام

لے گا۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ بس اتنا بندوبست کافی ہے۔ ہاں اس کے سوا جو تو چاہے کرے۔ جو

مجھ سے لے چیرے سن میں آئے کرے۔ لیکن میرے لیے یہی سب کچھ بہت کافی ہے۔

اور جب اس غارتنا میں قدم رکھنے سے پیشتر میں دودھ قطر کا ایوارڈ ایک ادیب کی حیثیت

سے وصول کر رہا تھا تو مجھ سے کہا گیا کہ میں اپنے فلسفہ فن کے بارے میں کچھ ارشاد کروں۔ بس اتنا کہا۔

مگر فلسفہ سے کام لیا نہ عاجزی کا اظہار کیا بس اتنا کہا کہ مجھے تو کچھ علم نہیں کہ میرا فلسفہ کیا ہے اور فن کیا

ہے۔ اس سے معلوم ہے کہ کبھی اوپر والے نے نیچے نظر ڈالی تو اسے ایک بیچارہ ست۔ بے بہرہ۔ اور بے علم

محض نظر آتا ہو کسی کاروبار میں کامران ہو سکتا تھا اور نہ اسے کوئی احتیاج کی ملازمت مل سکتی تھی۔ اُس

تعلیق کا کچھ سیل نہ بن سکتا تھا تو اس نے سوچا کہ اس بندے کا کیا کروں۔ یہ کجست تو بھوکا مر جائے گا

تو اور ہو جائے گا۔ اس نے بھی تو حیات کے دن کاٹے ہیں تو اس کا کیا بندوبست کروں۔ تو کیوں نہ اسے

ایک اور کچھ عزت عطا کروں۔ تھوڑی شہرت اس کے نام کروں ہے ایک یہ اس کے قابل نہیں ہے۔

اور یہ دعویٰ گزار سکے۔ تو اس کے حوالہ کوئی فن ہے اور نہ کوئی فلسفہ۔ اس اک عنایت کی نظر ہے۔ اگر میں

اکابرانہ رویہ دیتا تو اس کی نظر مجھ پر کبھی نہ پڑتی۔

ہو گیا۔ غار کے آخر میں جو روزن تھا جس میں سے وادی مکہ کی ہلکی سی روشن جھلک اب بھی دکھائی دے

رہی تھی اُسے نظر میں لایا اور پھر نیت کر لی۔

منہ و لکبے شریف۔ نظر جھکائی اور اپنے تہمتی تھیلے پر رکھ دی۔

کبھی میری ناگوں میں ہلکی سی لرزش سرسرائی کہ میں کہاں ہوں۔ اور کبھی جبدے میں گرنا تو

اپنے مصلیٰ تلے جو اس غار کا برسوں سے بچھا آبا کی اور اس کا مکین مصلیٰ تھا اُس کے نیچے جو سنگریزے تھے

انہیں اپنے ماتھے پر محسوس کرتا۔

میں نے حساب کتاب کا پرچہ چھوڑ دیا تھا کچھ حساب نہ کیا کہ کتنے نفل ہو گئے ہیں۔

سلام پھیرتا تو دائیں جانب یہ سلام ذرا دور ہو جاتا اور اُس تاریک چٹان پر ثبت ہو جاتا جس

کے نیچے سنگ مرمر کی سلیں تھیں وہ ہموار پتھر تھا جس پر میرا سامان پڑا تھا۔ اور جب بائیں جانب سلام

پھیرتے ہوئے چہرہ کرتا تو گویا میرا چہرہ چٹان کے ساتھ ہی لگ جاتا کہ وہ میرے رخساروں کے برابر

میں ہی تھی۔

میں نے وہاں بھی۔ خانہ کعبہ کی مانند۔ ہر ایک کے لیے دعائیں مانگیں۔

آغاز تو ظاہر ہے گھر سے ہوتا ہے انہوں سے ہوتا ہے بال بچوں۔ بیوی۔ بہن۔ بھائیوں اور

ماں باپ سے ہوتا ہے۔ پھر دادا اور دادی یا میں آتے ہیں۔ ثانی جان کے ہاتھوں کی لرزش محسوس ہوتی

ہے۔ اور پھر یہ دعائیں پھیل جاتی ہیں جو بھی یاد آتا ہے۔ مرچکے عزیز اور دوست۔ جن سے کبھی سرسری

ملاقات ہوئی تھی۔ گلی محلے والے۔ زندگی بھر کے حاسد اور دشمنوں کے لیے بھی۔ یہ سوچتے ہوئے کہ اس

مقام پر اگر میں اُن کا نام لیتا ہوں تو محض نام لینے سے انہیں اور اُن کے بچوں کو اگر اللہ تعالیٰ نواز دے گا ہے

تو ایسا کرنا چاہیے۔

اُن لوگوں کو بھی یاد کیا جن کے نام نہیں جانتا تھا صرف چہرے یاد تھے۔ اُن کے چہرے یاد

کیے یہاں تک کہ اُن کی پہاڑوں نے سر بلندی کی دعائیں کیں جن کے دامن میں کبھی میرا خیر نصیب

ہوا تھا۔ اُن وادیوں کی سدا سرسبز کی دعا کی جنہوں نے میری آنکھوں میں اپنی ہریاں بھری تھی۔

جھیلوں کے پانیوں کو یاد کیا۔ یہاں تک کہ جتنے پرندے میں نے آج تک دیکھے تھے اُس مرغ و زریں

مست جو وادی شمشال کے راستے میں اپنی چھب دکھلا کر اوچھل ہو گیا تھا۔ اُن سب کے رنگوں کے

مزید گڑھے ہونے کی دعا کی۔ اُن جانوروں کے لیے بھی جو کبھی میرے پالتو رہے تھے۔ سنولیک کی

تھکن کے لیے بھی

لیکن۔ سب کو یاد کرتا میں اپنے آپ کو بھول جاتا۔

جس کے آگے چلا جاتا ایک انسان کے لیے ممکن نہ تھا۔

ایک انسانی بدن کی کچھ دباؤ والی مجبوریاں ہوتی ہیں۔ وہ بے شک غار حرا میں ہو اُن سے درگزر کرنا ممکن نہیں۔ اُن کے دباؤ کو عقیدت کے بوجھ تلے دبا کر ممکن نہیں۔

یہاں تک کہ باہا بھی نہیں دبا سکتے تھے۔

اس دباؤ سے نجات حاصل کرنا از حد ضروری تھا۔ ورنہ یہ عبادت میں خلل ڈالنے والا تھا۔

میں نے جو گرد کو پاؤں میں کیا۔ اُن کے سڑیپ جوڑے اور غار سے باہر آ گیا۔ گھن میں

آ گیا۔

صحن میں تو کچھ نہیں ہو سکتا۔ میں نے سوچا۔

تو کہاں ہو سکتا تھا۔ اس آبی بوجھ سے نجات کہاں حاصل کی جائے۔

وہ بندہ خدا۔ بلکہ بندہ جبل نور۔ نیاز۔ مجھ سے منہ موڑے چٹان کے ساتھ جڑا ایسا جڑا اس

چٹان کا جڑواں لگ رہا تھا۔ بے سددھ سوتا تھا۔

جانے رات کی کون سی ساعت تھی۔

کیا وقت ہوا تھا۔

شاید نصف شب کی قربت تھی۔

جبل نور کی اوٹ میں سے بارہویں کا چاند جو ابھی ابھی اُس کی چوٹی کے کنگرے کے برابر

میں سے ابھرا تھا اب سرکنا ہوا ہولے ہولے سرکنا غار حرا کے صحن کے سین اوپر آ چکا تھا۔

صحن متورہور ہا تھا۔

میں اپنی حاجت سے لاچار ہو کر۔ چاندنی پر دھیان نہ کرتا صحن میں کھلتی سرنگ کے اندر داخل

ہوا اپنی چھوٹی نارنج کی روشنی میں اُس کے اندر قدم رکھا۔

سب سے اوّل وہی بڑی چٹان رکاوٹ تھی۔ لیکن میں اسے اب خاطر میں کہاں لاتا تھا۔

سارے داؤد جان چکا تھا کہ کہاں سے پیٹ سکیڑ کر اس کے پار جانا ہے اور پھر کیسے گرون میں ذرا سا لم

اسے گرسر ہو کر ہائے محبت کی چٹانوں سے بچتے دوسری جانب جانا ہے۔ میں بقول نیازا یکسرٹ ہو چکا

تھا۔ یہ سرنگ میرے گھر کے اندر داخل ہولے والا راستہ ہو۔ ایک ذرا تلخ ہو۔

بلکہ میں سرنگ میں سے متابی سے گزر جانے کی بجائے اُس میں ٹھہرا رہا۔ جیسے مہم جو

بہاؤں کے اندر بازین کی گہرائی میں چیدہ غاروں میں اُڑ کر اطمینان سے اُن کا جائزہ لیتے ہیں ایسے

میں بھی کہاں سکون سے نارنج کی روشنی کی محبت کے کسی مجھے پرکھی فرش کے مٹروں پر ڈالتا مڑوڑ کرتا

تو میں نے یہی التجا کی کہ تمہاری نظر ٹھہری رہے۔

تو جو رحم کرتا ہے۔ کرم کرتا ہے تو ان صفات میں میرا بھی تو کچھ ہاتھ ہے۔ مجھ ایسے پر دم کرتا

ہے کرم کرتا ہے تو لوگ کہتے ہیں کہ اس جیسے پر اگر رحم کرتا ہے اور کرم کرتا ہے تو واقعی اس کے رحیم و کریم

ہونے میں کوئی شک نہیں۔ دیکھو میں نے بھی تو تجھے کیسا موقع فراہم کیا ہے۔ مجھ پر تمہاری نظر ٹھہری رہے

تو اچھا ہے۔

میں مسلسل نوافل ادا کرتا چلا جاتا تھا۔ اور مجھے کچھ تحکُن نہ ہوتی تھی۔ البتہ توجہ کامل نہ ہوتی

تھی۔ بھٹک جاتی تھی۔ اور مجھے بھٹکانے والے دنی چاندنی کے جزیرے تھے۔

غار میں لیٹے ہوئے تو وہ میرے بدن پر ساکت ٹھہرے ہوئے تھے لیکن کھڑے ہوتے تو کوٹ

میں جاتے اور سجدہ ریز ہوتے وہ حرکت میں آ جاتے۔ کھڑا ہوتا تو وہ میرے بدن سے گر جاتے۔ رکاوٹ

میں جاتا تو اُن میں سے ایک پہلے میرے ماتھے پر اُترتا۔ میں ذرا حرکت کرتا تو وہ میری آنکھوں میں

تیرنے لگتا۔ سجدے میں جاتا تو وہ پہلے سے ہی تفتی تھیلے پر براجمان ہوتا۔ تو ان جزیروں کی حرکت مجھے

بھٹکتی تھی۔ میں اُن کے دھیان میں چلا جاتا کہ وہ اب کہاں ہیں۔ غار کی دیوار پر اور فرش پر جو چاندنی

کے پچا ہے رکھے تھے وہ البتہ ساکت اور ٹھہرے ہوئے تھے۔ لیکن کن اکھیوں سے میں اُنہیں بھی اپنے

دھیان میں رکھتا۔

مسلسل نوافل دعاؤں اور التجاؤں کے ساتھ ساتھ میں باتیں بھی کرتا جاتا تھا۔

جی ہاں۔ میں غار حرا میں بہت مؤدب ہو کر اپنی آنکھوں سے گرنے والے آنسوؤں کو سنبھالتا

نہ تھا بلکہ بڑے اطمینان سے زیر لب بڑبڑاتا باتیں بھی کرتا چلا جاتا تھا۔

مجھے عربی میں تو بہت کچھ یاد نہ تھا۔ تو کبھی اردو میں اہل دنی کی مانند لب و لہجہ کا خیال کرتا

کہ۔ میاں ہمیں بھولے گا نہیں اپنی نظر کو ٹھہرائے رکھنا ہاں۔ اور کبھی انگریزی میں جو کچھ سوچتا اور آکر

پنجابی میں۔ کہ اُس نے جتنے بھی پیغمبر اتارے انہوں نے اپنی مادری زبان میں ہی اُس کے پیغام دیے۔

چنانچہ جو کچھ بھی۔ اور جس زبان میں بھی مجھے سوچتا تھا کہ چلا جاتا تھا۔ باتیں کیے جاتا تھا۔

UrduPhoto.com

UrduPhoto.com

UrduPhoto.com

اپنی دیر کہ بلا خراس مسلسل اٹھک اور سجدہ ریز کی عاجزی اور التجاؤں نے مجھے تھکا دیا

کہ میں ایک انسانی بدن رکھتا تھا۔ اس کی ہر اہمیت کی کچھ سرحدیں تھیں جن کے پار میں جانا چاہتا بھی تو

بھی نہ ہا سکتا تھا۔ شاید میں اب بھی سچی کر کے کچھ اور آگے چلا جاتا لیکن ایک ایسے دباؤ کا احساس ہوا

بے خطر اتر جاتا اگر یہ کوئی اور کوہ ہوتا جبل نور نہ ہوتا۔ قیام کسی اور غار میں ہوتا غار حرا میں نہ ہوتا لیکن اس لیے نزاکت ایسی تھی جیسے وقت کا پیالہ کاٹنے کا ہاتھوں میں تھامے چلتا ہوں کہ کہیں ذرا سی لغزش پائے یہ چھوٹ نہ جائے کرچی کرچی ہو کر ہمیشہ کے لیے یہ وقت مجھ سے جدا نہ ہو جائے۔ میں اپنے آپ کو زلزلے نہ کروں۔ کہیں چوٹ انہی نہ آجائے کہ یہ جام کاٹنے کا جو لمحہ موجود کی سہ کو سنبھالتا ہے ٹوٹ نہ جائے۔ سہ بہہ نہ جائے۔ کہ یہ متاع میرے لیے بہت قیمتی تھی۔ یہ وہ جام سفال نہ تھا جو بازار میں عام تھا۔ اس لیے اسے سنبھالنا تھا کوئی خطرہ مول نہیں لینا تھا۔ یہ لمحہ ہاتھ سے جانے نہیں دینا تھا۔

چنانچہ میں نے اس راستے پر اترنے کا ارادہ ترک کیا۔ اب کسی اور مقام کو کھوجنا تھا۔ پیر حیاں اوپر جاتی تھیں لیکن وہاں تو مسجد کا تھرا تھا۔ چھتر تھا۔ وہاں تو نہیں۔ پھر ادھر بچھتر کے دوسری جانب جہاں کھلی فضا ہے جدھر سے میں اور نمبر غار حرا کی چھت تک پہنچے تھے وہیں کہیں ممکن ہو سکتا تھا۔

چھتر کے آگے۔ سرنگ چھتر کے دائیں جانب ہے تو بائیں جانب ایک دو قدم اٹھانے کے بعد راستہ مسدود ہو جاتا ہے اور ایک ہموار قسم کی چٹان آگے آ جاتی ہے۔ میں اس پر اپنے جوگر بھانا ہوں اور جھکا جھکا اس پر چڑھتا ہوں۔ جیسے میں حج کے ایام میں نمبر کے ہمراہ اسی چھتر پر چڑھا تھا لیکن تب اور اب میں بہت فرق تھا۔

تب ایک انبوہ کثیر کی دھکم پیل میں تھا۔ دن کی روشنی میں تھا۔ بیٹے کے سہارے پر قائم تھا۔ اور اب میں رات میں تھا اور تنہا تھا۔ تو اس چٹان پر دو چار قدم چڑھتے ہوئے بھی میں بہت ڈرا آتش میں قدم اٹھائے کہ مجھے اب ساتوں کے کورے لمحوں کے پیالے اور وقت کے جام بھی تو سنبھالنے تھے۔ نہ سنبھال سکا تو اس رات کو کھودوں گا۔ یہاں گر گیا یا اپنے آپ کو لاچار کر لیا تو یہ رات گئی۔ اگرچہ رات تو نہیں کرنی تھی نیچے جانا تو ممکن ہی نہ تھا لیکن اپنے آپ کو زخمی کر کے اگر بٹلیں کراہتا رہا تو فائدہ۔

ساتوں کے کورے کو ایسے مقام پر سنبھالے رکھنا ہلکا کام نہیں ہے۔ مت ہل اسے ہانوں۔ اس چٹان پر جھکا جھکا اوپر ہوا اور مجھے طمانیت ہوئی کہ میرے جوگر نے جواب نہ دیا تھا وہ اس کی کھردری سطح پر خوب جم کر چڑھے۔ ڈرا بلند ہوا۔ اگرچہ اعلان اب بھی تھی پانچ قدم چلا تو اس مقام پر پہنچ گیا جہاں میں اور نمبر آن پہنچے تھے یعنی غار حرا کی چھت کے پتھروں پر آن بیٹھے تھے اور نیچے مگن میں ٹھنسی طلق لدا کی جانب ہاتھ بڑھا کر۔ جو لعل ادا کر چکے تھے انہیں تمام کراؤ چہلے گئے تھے۔

اُن کے کھردرے پن اور ساخت پر غور کرتا دیر تک رُکا رہا۔ جیسے یہ ایک معمول ہو۔ میں ہر روز اسی راستے سے گزر کر جانے والا ہوں۔ اور اس میں تعجب کا پہلو یہ تھا کہ ڈر کا کوئی ایک ذرہ بھی میرے بدن سے چھٹ کر مجھے خوفزدہ نہیں کرتا تھا۔ اتنی خالص تنہائی میں۔ ایک پورے پہاڑ کے اندر ایک سرنگ کے اندر مکمل اکلا پے میں۔ میں نڈر تھا۔

کیا پتہ بابا بھی آتے جاتے یہاں کچھ دیر رکتے ہوں۔ ان پتھروں کی بناوٹ پر غور کرنے کے لیے۔ لیکن نہیں۔

وہ نہیں رکتے ہوں گے۔ اس سرنگ میں کچھ دیر نہیں رکتے ہوں گے۔ وہ اپنے آپ میں گم گزرتے ہوں گے جلد از جلد غار حرا کی آغوش میں جا بیٹھنے کے لیے۔

پر اپنے ہاتھ تو رکھتے ہوں گے۔ سہارا لیتے ہوں گے انہی پتھروں کا جن پر میں ہاتھ رکھتا تھا۔ میں نے کچھ دیر یہی کام کیا۔ سرنگ کی چٹانوں اور پتھروں پر ہر جگہ اپنا ہاتھ رکھا۔ انہیں سر سے پاؤں تک چھوا۔ فرش کو بھی کہ وہاں اُن کے نقش پائینا تھے۔

ذرا اتنا ڈور چلا گیا تھا کہ میں اس سرنگ کے اندر بھی اگر چاہتا تو رات گزار سکتا تھا۔ پھر میں نے بقیہ چند قدم اٹھائے اور دوسری جانب باہر آیا تو بنگالی بابا کے چھتر کی چھاؤں میں آ گیا اور اس کے ساتھ ہی۔ میرا چہرہ بھی وادی مکہ سے اٹھنے والی ہلکی روشنی کی زد میں آ کر عیاں ہو گیا۔

وہ چھتر شب کی تاریکی میں کیسی پُچ سادھے ہوئے تھا۔ بابا بنگالی کا سامان۔ بور یا برتن۔ بوسیدہ کھیس۔ بچ۔ کاغذوں کے پلندے سب ایک ساکت تصویر تھے جس پر سیاہی غالب آ چکی تھی۔ صرف وہ اشیاء قدرے نمایاں تھیں جو چھتر چھاؤں سے ذرا پرے چاندنی وصول کر رہی تھیں۔

میں نے اسی چھتر کے پہلو میں سے اترتے ایک راستے پر بابا بنگالی کو فارغ ہونے کے لیے اترتے دیکھا تھا اور یہی سوچ کر آیا تھا کہ میں بھی اسی راستے پر چل کر ذرا نیچے چلا جاؤں گا جہاں کوئی نہ کوئی متعین مقام ہوگا جو بوجھ خالی کرنے کے کام آتا ہوگا۔

لیکن اب جو غور کیا تو نیچے اترنے والا کوئی واضح راستہ تو دکھائی نہ دیتا تھا۔ شاید راستہ تھا ہی نہیں اور بابا بنگالی اپنے تجربے کے ذور پر اترتا تھا۔ یوں بھی اس اندھیرے میں نیچے جانے سے میں بھجکتا تھا کہ کہیں اترتے ہوئے ٹکریوں کے پائوں لٹک نہ جائیں کوئی پتھر راہ میں آ گیا تو ٹھوکر نہ لگ جائے کہ وادی مکہ سے اوپر آنے والی روشنی ہا کانی تھی اور تاریکی کی روشنی بھی میرے تجربے کے مطابق پہاڑوں کی اعلیٰ اعلیٰ جگہوں پر آتی تھی اس کو ہموار سے جاتی تھی۔ میں بے فکر

میں رُک گیا۔

یہ مناسب مقام لگتا تھا۔

اگرچہ یہ مناسب مقام بھی حد درجہ غیر مناسب تھا۔ جبل نور پر تھا۔ غار حرا سے منسلک پتھروں

پر تھا۔

یہاں میں نے بعد معذرت اور شرمندگی... اپنے آپ کو اُس آبی بوجھ سے آزاد کیا اور پھر

کیہا شانیت اور مطمئن محسوس کیا۔

فارغ ہو کر میں ذرا پیچھے ہٹ کر بیٹھ گیا اور ایک سگریٹ سلگا لیا۔ لائٹر کا پل دوپل کا مختصر شعلہ

جو عام حالات میں دکھائی بھی نہیں دیتا یہاں نارِ جہنم کی مانند بھڑکا اور آس پاس کو عیاں کر کے بجھ گیا۔

نارِ یکی چھا گئی۔ اُس شعلے کا اثر زائل ہوا تو چاندنی لوٹ آئی۔ بارہویں کی چاندنی لوٹ آئی۔ ہر پتھر اور

پہاں کے لیے قلعی گر ہو گئی۔

میں نے ایک اور کُش لگایا اور سرک کر اپنا چہرہ زوہر و کر لیا۔ رُخ خانہ کعبہ کی جانب مٹھیر لیا۔

جبل نور کی چوٹی پر ترکوں کی مٹ چکی مسجد کے سینٹ کے فرش پر جب میں نمازِ عشاء کے

لیے تہا کھڑا ہوا تھا تو نیچے ڈور تک دکھائی دینے والی وادی تکہ کے آخر میں خانہ کعبہ کا منور کھلونا اگرچہ ایک

ظاہر ایک سحر لگتا تھا اُس کا روشن وجود میری بے یقینی کے سمندروں پر تیرتا تھا۔ لیکن یہاں سے جو

منظر دکھائی دے رہا تھا وہ بھی ایک اُنت جو بہ تھا۔ دماغ کے ہر ہر خطیے پر یہ روشن گہرائی نقش ہوتا تھا جیسے

کوہ طور پر دس خدائی احکام نقش ہوتے تھے۔

میں چوٹی پر نہ تھا۔ جبل نور کی آخری چٹانوں کے آخری کنارے پر بیٹھا تھا اور دو چار ہاتھ

آگے یہ کنارہ ایک فکرت کھائی میں گر جاتا تھا تو یوں۔

ہم دونوں کے درمیان کچھ حائل نہ تھا۔

ہم ایک دوسرے کے مقابل تھے۔

چہرہ بہ چہرہ زوہر و تھے۔

میں ایک طائر کی مانند بلندی سے جیسے میں اُس کی جانب پرواز کرتا جا رہا ہوں اُس کھلنے

کو لگتا تھا۔

میں اور خانہ کعبہ۔ دو وحائی کلمہ میٹر ہمارے درمیان والی مسافت جس پر میری آنکھیں سطر

کرتی اُس تک جاتی تھیں۔

پہ ایک اور عظمت کے سوا کچھ نہ تھا۔

اور اب۔

میں اپنے آبی بوجھ کو بھول کر عین اُس سپاٹ پر بیٹھ جاتا ہوں جہاں میں اور ٹھیکر بیٹھے تھے اور

نیچے دیکھتا ہوں۔

تو وہاں... نیچے... غار حرا کے مختصر صحن میں سوائے چاندنی کے ہجوم کے اور کچھ نہیں۔

وہ سنگریزے جو غار میں لیٹے ہوئے نظر نہ آتے تھے یہاں سے آٹھ دس فٹ کی اونچائی سے

الگ الگ... چاندنی سے قلعی کیے ہوئے جدا جدا دکھائی دے رہے ہیں۔ جیسے چاند کے قلعی کرنے ہر

سنگریزے کو بھٹی میں گرم کر کے اُس پر نوشادر چھڑک کر اُسے خوب چمکایا ہے اور پھر سے وہیں رکھ دیا ہے

جہاں سے اٹھایا تھا۔

اور یہ قلعی شدہ سنگریزے سکوت میں ہیں ان کا دم رُکا ہوا ہے۔

نیاز چٹان کا ایک حصہ تھا دکھائی نہیں دے رہا تھا

صحن سے اٹھتی چٹان کی بناوٹ بھی یہاں سے عیاں ہو رہی ہے۔ اور اُس کی دیوار سے گرتی

کھائی جو نیچے وادی کے دامن تک رکتی ہی نہیں گرتی چلی جاتی ہے اُس کے بڑے بڑے پتھر آدھے

اندھیرے میں ڈوبے ہیں اور آدھے چاندنی میں ہیں۔

یہ وہی پتھر تھے جن پر سرشام ہنومان مہاراج کو دتے تھے۔

اگر وہ رات کے اس پہر بھی وہاں موجود ہوتے۔ تو وہ بندر بھی آدھے چاندنی میں ہوتے اور

بقیہ آدھے اندھیرے میں۔ عجیب سے بندر ہوتے۔

میں نے ذرا آگے ہو کر غار حرا کے اندر نگاہ کی۔ اس لیے جھانکا کہ کہیں اور کوئی تو میرے گھرے

قابض نہیں ہو گیا۔

اس چھت سے اٹھا اور احتیاط سے اٹھا۔ میں نارِ ج گل کر چکا تھا کہ جیسے آنکھیں اندھیرے کی

عادی ہو جاتی ہیں ایسے اس بلندی کی کھلی فضا میں وہ چاندنی کی عادی ہو چلی تھیں۔ میں نے نارِ ج اس

لیے بھی بھجادی کہ اُس کی روشنی پتھروں کو مجروح کرتی تھی اور وہ غیر حقیقی لگتے تھے۔

نارِ ج کی بھجادی نے پتھروں کو اُس مگر چاندنی میں ایک الوہی شکل عطا کر دی تھی۔ اور میں

صاف دیکھ سکتا تھا۔

اُنکھ کر ذرا آگے گیا۔ چہرہ اُس کوہ کا آخری کنارہ تھا۔ جس کے نیچے وادی تکہ کا دوسرا رُخ

تھا۔ اور جو کنارہ میرے قدموں تلے آیا اُس سے پرے ایک مختصر چٹانی دھلوان تھی جس پر اترنا گویا ہمیشہ

لیے آئی پہاڑ تھا کہ اُس کے آگے پہاڑ تھا ایک ایک کیمرائی تھی۔

یہی وہ گھر ہے... یہی وہ در ہے... اور یہی وہ کوچہ ہے جس میں میرا قیام ہے... اور میرے اور حیرے درمیان کچھ حائل نہیں سوائے یار کے چہرے کے... اور اُس کے بغیر تو بھی بے رنگ ہے... حیرے سب رنگ اُس کے رنگ سے ہیں جمال یار کے رنگ سے ہیں... میں اُس کے گھر میں ہوں اور حیرے گھر کو دیکھتا ہوں... میں فراموش کر گیا کہ ان پتھروں کے نیچے ایک کھوہ میں میرا تہمتی تھیلا پڑا ہے جو میرا سر ہاتھ ہے اس شب میں قیام کے لیے... میں اس منظر میں ایسا کم ہوا... بہت دیر بعد میں نے اوپر دیکھا...

اوپر بارہویں کا مدھم چاند اپنا سفر طے کرتا جبل نور کی چوٹی سے اتر کر میں میرے سر پر اپنا بھی ہوئی کر میں ایک مدھم آبشار کی صورت گزارا ہوا تھا... تب میں نے محسوس کیا کہ میں کہیں بھی اپنی حیات میں اس قدر نزدیکی میں نہیں ہوا تھا... اُس کا گھر تو کچھ فاصلے پر دمکتا تھا لیکن آسمانوں سے اُس کی اترنے والی قربت جیسے مجھ پر نازل ہو رہی تھی...

پیغامبری کے جتنے بھی سلسلے تھے سب کے سب بلند یوں پر ہی اترے... کبھی ایک نیلے پر... پیغامبروں کے باپ ابراہیم کا ظہور ماہتاب سے اور کبھی طلوع آفتاب سے متاثر ہونا اور اُن کو رد کر دینا...

کبھی کوہ طور کی سلگتی نور سے دھکتی جھاڑی کو دیکھ کر اپنے جوتے اتارتے ہوئے موسیٰ...

کبھی پہاڑی کے واعظ کی صورت میں ابن مریم!

اور آخر... پیغامبری کے اختتام پر... یہاں جہاں میں بیٹھا تھا... یہیں ان پتھروں میں پوشیدہ

ایک غار میں... میرے محمد!

تو میں ان تمام نزدیکیوں کے قُرب میں... جتنا امکان میں تھا اتنا تھا...

بے شک وہ شہرگ سے بھی قُرب ہے لیکن اگر وہ اپنی تخلیق کردہ کائنات کے کسی گوشے میں

زودیک تر تھا تو یہاں تھا...

سا منے اس رات میں اُس کے گھر کا اٹا تھا...

اوپر... اس رات میں اُس کی نزدیکی میں... میں اُس کے نزدیک تر تھا...

وہ لاشریک تھا تو میں جو کوہ طور کے آگے آ کر ہی کھڑا ہوں اس رات میں تھا بیٹھا تھا تو میرا بھی اُس

ایک اور مہربانی ایک کرم تھا جو مجھ پر ایک روشن صحنے کی مانند اتر رہا تھا اور کیوں نہ اترتا کہ یہیں جن پتھروں پر میں بیٹھا ہوا تھا ان کے کٹھن میں وہ کھوہ تھی جہاں سب کچھ اترتا تھا...

اگر مجھ میں غار حرا میں ہی رات کرنے کی ہوس نہ ہوتی تو پھر یہ ایسا مقام تھا جہاں میں ناگہم سیٹے اُن کے گرد اپنے بازو حائل کیے گھٹنوں پر سر رکھے شب بھر یونہی دیدار کرتا... رُوبہ رُورہتا... چہرہ پہ چہرہ رہتا...

"اگر مجھے تیرے رُوبہ رُورہنے اور آ منے سامنے ہونا نصیب میں ہو تو میں تیرا غم نکتہ بہ نکتہ اور ہو بہو بیان کروں"

تو یہ تو میرے نصیب میں آ گیا تھا کہ میں اُس کے رُوبہ رُورہ اور آ منے سامنے تھا تو کر بیان اپنا غم نکتہ بہ نکتہ اور ہو بہو... کیوں نہیں کرتا...؟ نہیں کر سکتا...

رب کعبہ سے نہیں کر سکتا... وہ ماوراء ہے میری فہم سے میری پہنچ میں نہیں ہے... میرا چہرہ تو ہے پر تیرا کوئی ایک چہرہ ہو تو اُس کے سامنے بیان کروں... اور میں تیرا کوئی ایک چہرہ بھی تصور میں نہیں لا سکتا... تیری موجودگی ہے پر تیری شکل کو کیسے اپنے سامنے تصویر کروں... بس ایک ہی صورت ہے کہ میں ہا ہا کے وسیلے سے تجھ تک پہنچوں... بیان کروں تو اُن سے کہ اُن کا چہرہ تو میری پہچان پر ثبت ہے... اور یہ بھی جان لے کہ اگر میں یہاں ہوں تو اُن کا مہمان ہوں اُن کے گھر میں ٹھہرا ہوا ہوں تو اپنے میزبان کے وسیلے سے ہی تجھ تک پہنچنے کی سعی کرتا ہوں...

"ظاہر نے اپنی کتاب دل کا ایک ایک صفحہ ایک ایک تہہ اور ایک ایک پردہ دیکھ لیا تھا... لیکن وہاں تیرے عشق کے سوا اور کچھ بھی نہ پایا"

اگرچہ رُوبہ رُورہ تو ہے لیکن میں تجھ میں فقط تیرے یار کا چہرہ دیکھتا ہوں...

"میں تیرے چہرے کے دیدار کے لیے ہا ہا کی مانند گھر گھر در در اور کوچہ کوچہ پھرتی ہوں..."

میں پہاں بھر چاندنی کی ردا اور مے اُس وادی کو نکلتا رہا جو شیب میں پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے تا دیر اُس کوہ کو دیکھا جس پر ایک شخص افق تا افق اپنا وجود پھیلائے کھڑا نظر آیا تھا۔ اور کچھ دیر میں نے چاند کو دیکھا جو میرے سینے اوپر۔ صحن کے سینے اوپر نہ مکمل طور پر روشن تھا اور نہ سراسر مدھم ہوتا تھا۔ پھر میں نے رخ سوز اور غار میں قدم رکھا۔ قدم رکھا تو رک گیا بلکہ ٹھنک گیا کہ اُس کی تاریکی میں جا بجا چاندنی کے پھاہے ثبت تھے۔ سفید جزیرے سے جلتے تھے۔ اور میں بھول گیا تھا کہ وہ وہاں ہیں۔

اور وہ وہاں تو نہیں تھے جہاں میں اوپر جانے سے پیشتر اُنہیں چھوڑ گیا تھا۔ وہ چاند کے قطر کے ساتھ مدھم مدھم سفر کرتے اپنی جگہ بدل کر سرکتے ہوئے آگے ہو گئے تھے۔

وہاں نہیں تھے جہاں وہ تھے۔ ریختے ہوئے کچھ فاصلہ۔ ایک آدھ بالشت کا طے کر چکے تھے۔ وہ وقت کے ساتھ سفر میں تھے۔ رات گزرتی تھی تو وہ بھی اُس کی آہستگی کے پہاڑ پہ پہاڑ سرکتے جاتے تھے۔

اور جب میں اندر داخل ہوا تو اُن میں سے تین جزیرے میرے بدن پر غفل ہو کر لوہے لگے۔ اور میں نے اُن کی ٹھنڈک محسوس کی۔

اندر داخل ہوا تو سب سے پہلے دودھ کی بوتل سے منڈلگا کر ایک بہت گہرا اور سفید گھونٹ بھرا کر میں بہت پیاسا ہو رہا تھا۔ وہ طویل گھونٹ بھر کر میں نے بوتل کو اپنی آنکھوں کے سامنے لا کر اُسے تاری سے روشن کیا یہ تعین کرنے کے لیے کتنا دودھ باقی ہے کہ ابھی تو رات باقی ہے۔ لیکن اندھے ہلاکت میں سے دودھ کی سطح دکھائی نہ دی البتہ ذرا چھلکانے سے اندازہ ہوا کہ میری توقع سے زیادہ اودھ ابھی باقی تھا۔

میں صحن کی جانب رخ کر کے مصلے پر براجمان ہو گیا۔ غید مجھ سے کوسوں تو نہیں بس اتنی دور تھی کہ اگر میں اُسے بلا لیتا تو وہ آجاتی۔ نہ بلاتا تو وہاں تھی رہتی۔ میں نے نہ بلایا۔ وہ منتظر رہی۔ ہمیشہ بلا لیتا ہوں آج میرا انتظار کر۔ کار جہاں دراز ہے۔ اب میرا انتظار کر۔

کچھ نہ کچھ سلسلہ درود و سلام کا سلسلہ جاری رہتا۔ کبھی تسبیح کے دانے پھر دے لگتا۔ پھر صحن میں براجمان چاندنی کی شفاف دھند کو یونہی بے وحیائی میں تا دیر نکلتا رہتا۔ اپنے اندر اتار رہا تھا۔ یہ رات یہ چاندنی پھر کہاں۔ جو جوانی کے اوائل کا یہ گیت یہاں کچھ اور ہی مفہوم لے کر آ گیا۔ اُن دنوں یہ گمان کہاں ممکن تھا کہ رات یہ ہوگی۔ یہاں ہوگی اور یہ چاندنی ہوگی۔ بیچوں کی شاموں پہ سوئی سوئی چاندنی۔ ہاں صحن میں چاندنی سوئی سوئی لگتی تھی۔ اور حیرت سے خیالوں میں کھوئی کھوئی چاندنی۔ یہاں اور کس کا خیال تھا کس کا خیال تھا۔ جس کا خیال آ سکتا۔ کبھی سنہال لینے والی چاندنی تھی۔ یہ یہ میرے سنہالنے

لمحے کوئی شریک نہ تھا۔

میرا نہ تو دل کبے شریف تھا ہی لیکن وہاں اتنی جگہ نہ تھی کہ اُس کے ساتھ سلسلہ گفتگو جاری کرتا۔ بمشکل کھڑا ہو کر سنبھلتا اگر نیت کر بھی لیتا ہوں تو جو مقام جگہ سے کا ہے وہاں تو تاریک خلا ہے۔ نور کا پہاڑ اُس سے پیشتر ہی کھائی میں گر رہا ہے تو میں نے وہیں بیٹھے بٹھائے۔ اُسی حالت میں۔ بانگوں کے گرد بازو حائل کیے۔ گھٹنوں پر اپنا چہرہ رکھے اُسے تکتے دو نفل ادا کیے۔ نہ کھڑا ہوا نہ رکوع میں گیا۔ وہیں اُسی حالت میں بیٹھے سلام پھیرا۔

یہاں نہ صرف یہ کہ اُس کی نزدیکی بہت نزدیک تھی بلکہ کھائی کے پار جو کوہ نظر آ رہا تھا سیاہ اور مہیب۔ رات میں رات ہوتا۔ وہی کوہ ہو سکتا تھا۔ بابا غار حرا میں سے نکلتے ہیں تو بہت ڈرے ہوئے کہ یہ مجھ پہ کیا بیت گئی۔ یہ کیسا خواب تھا۔ یہ کون تھا جو مجھے پڑھنے کے لیے کہتا تھا اور میں کہتا تھا کہ میں پڑھ نہیں سکتا تو بھی پڑھنے کے لیے کہتا تھا۔ اور تب وہ اسی سامنے والے کوہ پر ایک شخص کو دیکھتے ہیں۔ جو فلک تک جاتا ہے اور وہ جدھر اپنا رخ کرتے ہیں وہ شخص وہیں نظر آتا ہے۔

افق سے افق تک۔ وہی شخص نظر آتا ہے۔ اوپر جو ہے وہ شہرگ سے بھی قریب تر یہاں ہے اور سامنے اُس کا گھر دمکتا ہے ایسے مقام سے کیسے اُٹھنے کو جی چاہے۔ صرف تب چاہے جب دنیا سے اُٹھ کر آپ اُس کے گھر جانا چاہیں جس نے آگاہ کیا کہ وہ شہرگ سے بھی نزدیک ہے جس نے اُس کے گھر کی پہچان کروائی کہ وہ یہاں رہتا ہے۔

واپسی پر وہی راستے۔

اترائی تھی بابا بنگالی کے چپتر تک۔ میں احتیاط سے جو گر جاتا اُس کے چپتر تک پہنچا۔

اور پھر اپنی سرنگ میں۔ چھوٹی نارنج کوروشن کر کے داخل ہو گیا۔

سرنگ کے آخر میں جو ایک بڑا چپتر تھا اُس کے ایک حصے کو چاندنی نے قلعی کر دیا تھا۔

چاندنی جو صحن میں پھیل کر سرنگ کے اندر جھانکنے لگی تھی۔

نیاز۔ جیسا کہ میں اُسے چھوڑ گیا تھا ویسے کا ویسا چٹان کی جانب چہرہ کیے ایسا غافل تھا کہ نہ

کوئی اُس کی موجودگی تھی اور نہ یہ لگتا تھا کہ وہ زکوہ ہے۔ حاضر نہیں لگتا تھا۔ غائب لگتا تھا۔ اگرچہ کچھ کچھ

دکھائی دیتا تھا پر ایسا کہ کبھی وہ کچھ کچھ بھی دکھائی نہ دے۔

میں ہوا و رستہ میں پہاڑ کی دیوار کی جانب گیا۔ اُس پر ہاتھ رکھ کر اُس رستہ

میں پنہاں ہو کر چاندنی کی ردا اور سے اس واوی کو تکتا رہا جو ٹیپ میں پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے تاجر اس کوہ کو دیکھا جس پر ایک شخص افق تا افق اپنا وجود پھیلائے کھڑا نظر آیا تھا۔ اور کچھ دیر میں نے چاند کو دیکھا اور میرے سینہ اوپر۔ صحن کے سینہ اوپر نہ مکمل طور پر روشن تھا اور نہ سراسر مدھم ہوتا تھا۔ بلکہ میں نے رخ ہوا اور غار میں قدم رکھا۔ قدم رکھا تو رک گیا بلکہ ٹھٹھک گیا کہ اس کی تاریکی میں جا بجا چاندنی کے چھپے ٹھٹھے تھے۔ سفید جزیروں سے جلتے تھے۔ اور میں بھول گیا تھا کہ وہ وہاں ہیں۔

اور وہ وہاں تو نہیں تھے جہاں میں اوپر جانے سے پیشتر انہیں چھوڑ گیا تھا۔ وہ چاند کے قطر کے ساتھ مدھم مدھم سفر کرتے اپنی جگہ بدل کر سرکتے ہوئے آگے ہو گئے تھے۔

وہاں نہیں تھے جہاں وہ تھے۔ ریگتے ہوئے کچھ فاصلہ ایک آدھ ہالشت کا طے کر چکے تھے۔ وہ وقت کے ساتھ سفر میں تھے۔ رات گزرتی تھی تو وہ بھی اس کی آہستگی کے پہلو پہ پہلو حرکت جاتے تھے۔

اور جب میں اندر داخل ہوا تو ان میں سے تین جزیروں میرے بدن پر فتل ہو کر لوہے لگے اور میں نے ان کی ٹھنک محسوس کی۔

اندر داخل ہوا تو سب سے پہلے ذودھ کی بوتل سے منہ لگا کر ایک بہت گہرا اور سفید گھونٹ بھرا کر میں بہت پیاسا ہو رہا تھا۔ وہ طویل گھونٹ بھر کر میں نے بوتل کو اپنی آنکھوں کے سامنے آکر اسے روشن کیا یہ تعین کرنے کے لیے کتنا ذودھ باقی ہے کہ ابھی تو رات باقی ہے۔ لیکن اندھے ہالٹک میں سے ذودھ کی سطح دکھائی نہ دی البتہ ذرا چمکانے سے اندازہ ہوا کہ میری توقع سے زیادہ ابھی باقی تھا۔

میں صحن کی جانب رخ کر کے مصلے پر براجمان ہو گیا۔ غیند مجھ سے کوسوں تو نہیں بس اتنی دور تھی کہ اگر میں اسے بلا لیتا تو وہ آجاتی۔ نہ بلاتا تو وہیں تھی رہتی۔ میں نے نہ بلایا۔ وہ منتظر رہی۔ پہلے ہالا لٹا ہوا آج میرا انتظار کر۔ کار جہاں دراز ہے۔ اب میرا انتظار کر۔

کچھ نہ کچھ سلسلہ درود و سلام کا سلسلہ جاری رہتا۔ کبھی تسبیح کے دانے پھرو لئے لگتا۔ پھر صحن میں اجماع چاندنی کی خلاف و حند کو پونہ بی دھیانی میں تادیر تکتا رہتا۔ اپنے اندر اتار تارہتا۔ یہ رات سے چاندنی پھر کہاں، انہو جوائی کے اوائل کا یہ گیت یہاں کچھ اور ہی ملبوم لے کر آ گیا۔ ان دنوں یہ گمان کہاں تھا کہ رات یہ ہوگی۔ یہاں ہوگی اور یہ چاندنی ہوگی۔ بیڑوں کی شانوں پہ سوئی سوئی چاندنی۔ ہاں صحن میں چاندنی سوئی سوئی لگتی تھی۔ اور تیرے خیالوں میں کھوئی کھوئی چاندنی۔ یہاں اور کس کا خیال تھا کہ کس کا خیال تھا جس کا خیال آ سکتا۔ یہ کبھی سنبھال لینے والی چاندنی تھی۔ یہ میرے سنبھالنے

لمحے کوئی شریک نہ تھا۔

میرا منہ تو دل کعبے شریف تھا ہی لیکن وہاں اتنی جگہ نہ تھی کہ اس کے ساتھ سلسلہ گفتگو جاری کرتا۔ بمشکل کھڑا ہو کر سنبھلتا اگر نیت کر بھی لیتا ہوں تو جو مقام جدے کا ہے وہاں تو تاریک خلا ہے۔ نور کا پہاڑ اس سے پیشتر ہی کھائی میں گرتا ہے تو میں نے وہیں بیٹھے بٹھائے۔ اُسی حالت میں۔ ناگھوں کے گرو باز و حائل کیے۔ گھٹنوں پر اپنا چہرہ رکھے اسے تکتے دو نفل ادا کیے۔ نہ کھڑا ہوا نہ رکوع میں گیا۔ وہیں اُسی حالت میں بیٹھے سلام پھیرا۔

یہاں نہ صرف یہ کہ اس کی نزدیکی بہت نزدیک تھی بلکہ کھائی کے پار جو کوہ نظر آ رہا تھا سیاہ اور مہیب۔ رات میں رات ہوتا۔ وہی کوہ ہو سکتا تھا۔ بابا غار حرا میں سے نکلتے ہیں تو بہت ڈرے ہوئے کہ مجھ پہ کیا بیت گئی۔ یہ کیسا خواب تھا۔ یہ کون تھا جو مجھے پڑھنے کے لیے کہتا تھا اور میں کہتا تھا کہ میں پڑھ نہیں سکتا تو بھی پڑھنے کے لیے کہتا تھا۔ اور تب وہ اسی سامنے والے کوہ پر ایک شخص کو دیکھتے ہیں۔ جو لالک تک جاتا ہے اور وہ جدھر اپنا رخ کرتے ہیں وہ شخص وہیں نظر آتا ہے۔

افق سے افق تک۔ وہی شخص نظر آتا ہے۔ اوپر جو ہے وہ شہرگ سے بھی قریب تر یہاں ہے اور سامنے اس کا گھر دکھتا ہے ایسے مقام سے کیسے اٹھنے کو جی چاہے۔ صرف تب چاہے جب دنیا سے اٹھ کر آپ اس کے گھر جانا چاہیں جس نے آگاہ کیا کہ وہ شہرگ سے بھی نزدیک ہے جس نے اس کے گھر کی پہچان کروائی کہ وہ یہاں رہتا ہے۔

واپسی پر وہی راستے۔ اُترائی تھی بابا بنگالی کے چھتر تک۔ میں احتیاط سے جو گرجا تا اس کے چھتر تک پہنچا۔ اور پھر اپنی سرنگ میں۔ چھوٹی نارنج کوروشن کر کے داخل ہو گیا۔ سرنگ کے آخر میں جو ایک بڑا پتھر تھا اس کے ایک حصے کو چاندنی نے قلمی کر دیا تھا۔ چاندنی جو صحن میں پھیل کر سرنگ کے اندر جھانکنے لگی تھی۔

نیاز۔ جیسا کہ میں اسے چھوڑ گیا تھا ویسے کا ویسا چٹان کی جانب چہرہ کیے ایسا غافل تھا کہ کوئی اس کی موجودگی تھی اور نہ یہ لگتا تھا کہ وہ زخمی ہے۔ حاضر نہیں لگتا تھا۔ غائب لگتا تھا۔ اگرچہ کچھ دکھائی دیتا تھا پر ایسا کہ کبھی وہ کچھ کچھ بھی دکھائی نہ دے۔

میں ہمارا راستہ تھا میں جاسونے لگی۔ بھانے دیوار کی جانب گیا۔ اس پہ ہاتھ رکھ کر اس راستے

میرے پاس کھوج لگانے کے لیے وقت بھی تو بہت تھا۔

اس غار کے آخر تک جایا جائے۔ دیکھا جائے کہ کیا محسوس ہوتا ہے۔ کیا کیا کچھ وہاں ہے جو یہاں پیٹھے ہوئے محسوس نہیں کیا جاسکتا۔

جہاں میرا جتنی تھکنا ایک جگہ کے طور پر دھرا تھا اُس سے آگے غار کی چھت دیواروں کی پٹائیوں اور فرش۔ یا فرش پر جو پتھر تھے وہ ایک دوسرے کی قربت میں آنے لگتے تھے۔ اس تھیلے سے آگے گزے ہو کر تو نہیں جایا جاسکتا تھا۔ میں کمر تک جھکا پھر بھی ذرا آگے ہوا تو سر کو چھت کے ایک پتھر سے بمشکل بچایا۔ اس حالت میں دو قدم آگے گیا ہوں گا جب جھک کر کبڑا ترین ہونے کے اندر بھی آگے جانا ممکن نہ تھا۔ جھکنے کے بعد اگلا مرحلہ تولیٹ جانا ہوتا ہے چنانچہ میں احتیاط سے اپنے ہاتھ دھو لیا۔ اور دونوں ہاتھوں نے دائیں بائیں غار کی دیواروں کو تھاما۔ میں ایسے لیٹ گیا جیسے اعتراف گناہ کرنے والے اعتراف سننے والے کے سامنے منہ فرش پر رکھے لیٹ جاتے ہیں۔

میرے سینے اور ٹانگوں تلے کوئی ہموار فرش نہ تھا۔ سنگریزے تھے ایک دو ابھرے ہوئے پتھر تھے جو اگر کام کر سکتے تو مجھے سخت سرزنش کرتے کہ تم یہ کیا لالچنی حرکت کر رہے ہو۔ صدیوں سے لوگ اسے اس غار کے دہانے میں عبادت کرتے ہیں چلے جاتے ہیں ہمیں دیکھ نہیں سکتے کہ ہم تاریکی میں پائیدہ المیہ نمان میں ہوتے ہیں تو تم پر کیا افتاد پڑی ہے۔ یہاں کیا لینے آئے ہو۔

چونکہ وہ کام نہیں کر سکتے تھے اس لیے لینے کے بعد میں ایک نادان تیراک کی مانند دونوں ہاتھوں کو چلاتا۔ بلکہ پتھروں کو تھامتا۔ ہولے ہولے ریگتے ہوئے آگے ہونے لگا۔

اور ہولے ہولے غار کی پتھریلی تنگی مجھ پر مزید تنگ ہونے لگی۔

یہاں آس پاس بہت سے اندھے سوراخ اور گڑھے تھے۔ کچھ تاریک شکاف تھے جن میں اشراۃ الارض میں سے کچھ بھی مقیم ہو سکتا تھا۔ کہ ادھر اس نوعیت کی آمد و رفت کا رواج نہ تھا۔

اور ہاں جب وہاں لینے ہوئے۔ ایک ایک مسام پیٹ کے بل ریگتے ہوئے مجھے یاد آیا کہ اب میں مصلے پر بیٹھا۔ صحن کی جانب چہرہ کیے آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا تو یونہی دائیں جانب جو چٹان میرے ہونے کے برابر میں سے اٹھتی تھی اُسے ٹوٹا رہتا تھا تو میرے برابر میں ایک دراڑ تھی۔ چٹان کے اندر ایک غلاف تھا اور میں نے بے خطر اُس میں ہاتھ ڈال کر اُس کی اندرونی حالت جاننے کی۔ اُس کے اندر اٹھلی چاکریہ جاننے کی سعی کی کہ اس کا حد و دار بعد کیا ہے تو میرا ہاتھ ایک پلاسٹک کے بیک سے جا کھوا اور وہاں کچھ سنگریزے بھی پائیدہ تھے۔ میں انہیں ٹوٹا رہا۔ ان کے سوا بھی تو وہاں کچھ ہو سکتا تھا یہ حد و دار سے دہن میں ایک بل کے لیے بھی نہ آیا میرے پیچھے اسی خیال میں دھنکے محسوس ہوئے کہ یہ

سے کہاں سنبھلتی تھی۔ اگرچہ اس کی ایک کرن بھی حیات کے تاریک راستوں کو چمکا چوند کر دینے پر قادر تھی پر ایک کرن بھی کہاں سنبھلتی تھی۔ تب میں نے یہی یقین کیا تھا کہ ایسا ہو جانا ممکن نہیں ہے۔ چاہے جب کہ میں غار حرا میں بسر ہونے والی اُس رات کا بیان کرتا ہوں تو اب یقین کرتا ہوں کہ کوئی ایک کرن میری رہنمائی کے لیے میرے ساتھ چلی آئی تھی۔ میرے قلم کی نوک میں اُس کا کوئی ایک اندازہ سرایت کر چکا ہے ورنہ میں کیسے اتنی تفصیل سے جزئیات کے ساتھ اُس رات کو یاد کر سکتا ہوں۔ یہ اُس ایک کرن کا کمال ہے۔

اور کبھی میں اپنے مسلسل ہيجان میں آئے ہوئے بدن کو پرسکون کرنے کی خاطر لیٹ جاتا اگرچہ اس بے چین ہيجانی کیفیت میں بھی ایک مزا تھا۔ لیٹتا تو چاندنی کے دھبے میرے بدن پر آٹھرتے۔ میں کسی ایک دھبے کو غور سے... تا دیر تک تارہتا کہ شاید میرے یوں ٹنگی باندھ کر اُسے دیکھنے رہنے سے چاند کے سفر کے ساتھ ساتھ اُس کی کوئی خفیف سی حرکت کا اندازہ ہو۔ پر یہ کیسے ممکن تھا۔ اور کبھی میں اپنا رخ بدل کر وہیں مصلے پر بیٹھا ہوا صحن سے منہ موڑتا اور غار کی تاریکیوں کو ٹھٹھکتے لگتا۔ اور میری نظروں کے سامنے وہ غار تنگ ہوتی اُس شکاف تک چلی جاتی جو اُس کے آخر میں عیاں تھا۔ وادی مکہ سے ابھرنے والی روشنیاں اُسے تاریکی میں آویزاں ایک روشن تصویر کر دیتیں۔ پھر میں بائیں جانب اٹھتی چٹان کی پتھریلی سطح پر اپنا پایاں رُخسار جما کر۔ بلکہ پچکا کر جب اُس شکاف کی جانب بمشکل دیکھتا تو اُس کے دائیں حصے میں خانہ کعبہ کا ایک مینار۔ منور اور ڈو دھیا۔ ایک آدمی غسل کی جسامت جتنا بمشکل نظر آنے لگتا۔ اور میں سانس روکے کچھ دیر اُسے دیکھتا رہتا اور اس حالت میں چٹان کے ساتھ گال جمائے ایسے کہ جڑے کی ہڈی پر بوجھ پڑتا ہو زیادہ دیر ممکن نہ ہوتا۔ میں ایک گہرا سانس بھی لیتا۔ میرے رُخسار میں وہ سانس بھرتا تو وہ مینار تاریک پتھروں کی اوٹ میں چلا جاتا۔ اور میں پھر سیدھا ہو کر بیٹھ جاتا۔

صحن سے منہ موڑے غار کی تاریکی اور اُس شکاف کو قبلہ بنائے۔ کہ قبلہ اُسی جانب تھا۔ میں جب بہت دیر تک اسی حالت میں بیٹھا رہا۔ غار اُس شکاف کی جانب بڑھتی تاریک تر ہوتی چلی جاتی تھی۔ تنگ تر ہوتی جاتی تھی تو اُس لمحے میری کوہ نور دی کی کہولت زدہ خصلت نے مجھے چمکا دیا۔ کہ جیسے ایک کوہ بیابانی ناممکن نظر آنی چوٹی پر پہنچنے کی تمنا کا جواز صرف یہ پیش کرتا ہے کہ میں نے وہاں جانا ہے کیونکہ وہ وہاں ہے۔ تو یہ تنگی اور تاریکی اور غار حرا کی تنگی اور تاریکی میرے سامنے ہے تو وہاں تک جایا جائے۔ ذرا کھوج لگائی جائے۔ ذرا آگے ہو کر اُس شکاف تک پہنچا جائے کہ وہ بھی

چنانچہ ان کے مساموں میں میرے بابا کے سانسوں کی ہوا موجود ہوگی لیکن پھر بھی میں یوں زندہ درگنگ نہیں ہونا چاہتا تھا۔ زندگی ایسی نایاب اور پیاری شے ہے۔ میں کچھ دیر اسی حالت میں اوندھا ہوا رہا۔ پھر ہسپتالی اختیار کرنے کے لیے اپنے بدن کو حرکت دی اس خوف کا اسیر ہو کر شاید میں پیچھے نہ ہو سکوں۔ لیکن میرے کسمالے سے کچھ گنجائش پیدا ہوگئی۔ اور میں ایک کپڑے کی مانند سمٹ سمٹ کر کچھ سرکتا گیا۔

لیکن ٹھہریے جہاں تک میں رہتا ہوا چاہتا تھا اس سے آگے کیا نظر آیا اس منظر میں آپ کو شریک تو کر لوں۔

مجھ سے تقریباً ڈیڑھ دو فٹ کے فاصلے پر وہ آخری شکاف نمایاں ہو رہا تھا اور اس میں سے اہل ہونے والی ہوا کا ہلکا سا لمس میرے ماتھے پر محسوس ہوتا تھا۔ ابھی چاند اتنا اڑھلا تھا کہ اس کی لو اس شکاف میں سے سرایت کر کے اندر آتی۔ البتہ واوی مکہ کی بھی روشنیاں اور ایک دو گھر نظر آتے تھے یہاں میں نے مقدور بھرسی کی کہ اپنے چہرے کو ذرا جنبش دے کر کوشش کی کہ شکاف میں سے خانہ کعبہ کا کوئی گوشہ نظر آجائے۔ پر نظر نہ آیا۔ میں اپنی ٹھوڑی تلے تھیلی رکھ کر اس شکاف کو دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ اگلے تو کا ہے کو یہاں تک رینگ کر آنا تھا۔ تو کیا کوئی مجھ سے پہلے بھی۔ ان چودہ سو برسوں میں یہاں آیا ہے۔ کوئی مہذب مجھ ایسا کوئی جنس کا مارا یہاں تک بے وجہ رینگ کر آیا ہوگا۔ یا ان پتھروں نے پہلی بار ایک انسانی بدن کو چھوا ہے اپنے درمیان پایا ہے؟

بہت ہوں گے۔ جواب آیا۔

بہت ہوں گے جنہوں نے اس غار کے پتے پتے پر اپنے ہونٹ ثبت کیے ہوں گے۔ ہر گوشے کو اپنے ہاتھوں سے چھوا ہوگا۔ پلکوں سے چوما ہوگا۔ بہت ہوں گے۔ بالآخر میں سمٹتا سمٹتا اسے آپ کو سکینے لایا۔ ہوتا گیا اور جب میرے پاؤں تھقی تھیلے سے جا چھوئے ہیں تو میں نے سکھ کا ایک لہا لاس لیا ہے۔

میں اپنی لشت پر صحن کی جانب رخ کر کے بیٹھنے کو تھا اپنی قمیض اور شلوار پر سے غار میں رینگنے کے باعث لگ جانے والی مٹی جھاڑنے کو تھا کہ میں نے ہاتھ روک لیا۔ کون ہے جسے ایسے ذروں کی ریزاں نصیب ہوئی ہو۔ اسے رہنے دو۔

جذوہ الہی پر مجھ سے ایک کوتاہی سرزد ہوگئی۔ میں نے جس لباس میں غار حرا میں شب بسر کی جس اسے اعلیٰ الہا۔ اور بعد میں چھٹا۔ اسوقت کے نصیب میں جب پہلی بار رؤف رسول کے اندر

سگریزے۔ غار حرا کی ایک دراڑ کے اندر جوں کے توں ہیں۔ وہی ہیں جو چودہ سو برس پہلے تھے۔ مجھ اُس لمحے چاہیے تو یہ تھا کہ اُن میں سے کوئی ایک سگریزہ غار حرا کے وجود کا ایک حصہ اپنے ساتھ لے آئے لیکن اُس لمحے وہ پوری غار اور اُسے وجود میں لانے والی بھاری بھر کم آڑی ترجمی ایک دوسرے کے سہارے آرام کرتی چٹانیں میرا گھر تھیں۔ بھلا مجھے ایک سگریزے کی کیا پروا تھی۔

ایسے سگریزے تو بہت بعد میں یاد آتے ہیں۔

کہ گئے تھے اُس گلی میں تو ایک سگریزہ ہی لے آتے۔

بہت بعد میں قفق ہوتا ہے۔ اُس سگریزے کی وقعت کا احساس ہوتا ہے۔

لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کہ اگر پورے کا پورا جبل نور آپ کا ہو۔ غار حرا کے سب پتھر آپ کے ہوں۔ شدہ تنہائی میں وہ آپ کی ملکیت میں ہوں تب ایک سگریزے کی کچھ حقیقت نہیں رہتی۔

تو میں رہتا ہوا۔ ایک عمر رسیدہ کینچوے کی مانند سرکتا ہوا آگے ہو رہا تھا اور میرے پاؤں میرے تھقی تھیلے کو پیچھے چھوڑ آئے تھے اور غار حرا کی کوکھ مجھ پر تنگ ہو رہی تھی۔ جیسے فوجی مشینوں کے دوران رینگتے ہیں۔ اور میرے دونوں کندھوں سے حرا کے پتھر کھیتے تھے ذرا سا آگے ہوتا تھا تو شانے مزید بھینچ جاتے تھے۔ ذرا سا سر اٹھاتا تھا تو وہ چھت کی پتھرلی سطح سے چھو جاتا تھا۔ غار حرا مجھ پر ایسا لگ ہوئی کہ اب مزید سرکنے کی ذرہ بھر گنجائش نہیں تھی اور میں ساکت پڑا ہنسنے لگا کہ ہوا نایاب ہو رہی تھی۔ گویا میں اُن پتھروں کا ایک حصہ بن گیا۔ اُن کے وجود میں بھر گیا۔ میں اپنے پاؤں تو ہلا سکتا تھا لیکن اپنے دھڑکار کے پتھروں میں پیک ہو کر پتھر ہو گیا تھا۔ گھبراہٹ ہونے لگی۔ میں اس خیال سے ہراساں ہو گیا کہ کہیں خاص زاویے سے پہلو بدلنے یا ذرا سرکنے سے میں اس قبر نما تنگی میں پھنس نہ جاؤں۔ پھنس گیا تو کیا ہوگا۔ رات گئے اور یہاں۔۔۔ بدد کو کون آئے گا۔

نہ سرنگ کے باہر بنگالی بابا ہے جو یونہی ٹھہرتا ہوا میرا حال دیکھنے کو یونہی ادھر آٹکے اور مجھ غار کے دہانے پر نہ پا کر اندر جھانک لے۔ اور اگر میں گھٹی گھٹی آواز میں فریاد کرتا ہوں دو ہائی دیتا ہوں تو وہی نیند میں ڈوبے ہوئے نیاز تک کہاں پہنچے گی۔ صرف ایک امکان تھا کہ میرا چہرہ اُس آخری شکاف کے قریب تھا اور اگر میں مدد کے لیے پکارتا ہوں تو شکاف سے باہر چٹان پر بیٹھا کوئی شخص میری آواز سنا۔ سن لے۔ اور کون ہے جو رات کے اس پہر شکاف کے باہر بیٹھا ہو۔ کوئی نہیں۔

بے شک یہ دنیا بھر کی چٹانوں اور پتھروں سے افضل اور بلند مرتبت چٹانیں اور پتھر تھے جن میں میں ایک نہیں تھا۔ بلکہ ایک سادہ جملگی کی مانند پیک ہو چکا تھا اور بے شک ان کے پوروں میں

جانے اور وہاں کچھ دیر بٹھرنے اور غلاف کو چھونے کا شرف لکھا گیا تو اس نے بھی بے دھیانی میں اپنے لباس کو دھلوا لیا اور تب ایک رفیق کار نے اسے سرزنش کی کہ تم نے یہ کیا کیا۔ تم نے اس لباس کو دھلوا لیا جسے روضہ رسول کے اندرون کی ہوائ نے مس کیا تھا اور اس پر غلاف سے جھڑنے والے مٹی کے کچھ ذرے تھے۔ جب اسے روضہ رسول کے اندر جانے کا ایک اور موقع ملا تو پھر اس نے لباس کو کیا وہ نشوونما بھی جوں کا توں سنبھال لیا جو اس کی جیب میں تھا۔

جبل نور کے چتر پر۔ حرا کے صحن پر اور غار کی چھت پر سے نصف شب یقیناً گزر چکی تھی۔ شاید وقت کی سوئی ایک کے آس پاس تھی یا ذرا آگے سرک چکی تھی۔ مجھے پھر بھوک ستا رہی تھی۔

چند کھجوریں باقی تھیں۔ اور دودھ کی بوتل ابھی تک خاصی بھاری تھی۔ میں نے ایک مختصر سٹیک کیا اور اس کے بعد تمباکو کی طلب پھر محسوس کی۔

غار سے نکلا اور سرنگ کی تاریکی کو نارنج روشن کیے بغیر پار کیا۔ کہ اب میری آنکھیں عادی ہو گئی تھیں اور مسلسل پریکٹس سے میں ہنومان مہاراج کی پھرتی اور کودنے پھاندنے کی صلاحیت سے قریب ہوا جاتا تھا۔ بابا بنگالی کے چتر کے راستے کھائی کے کنارے پر بے خطر۔ میں لمحوں میں حرا کی چھت پر جا بیٹھا۔ اطمینان سے ایک سگریٹ پھونکا۔ خانہ کعبہ کے گرد سب کچھ مدھم ہو چکا تھا لیکن اس کی دمک جوں کی توں ظاہر ہو رہی تھی۔ اسے دیکھنے کا یہ جان اب دھیما ہو رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہوئے دل بدستور مسرت سے بھرتا تھا لیکن یہ منظر معمول ہوتا جاتا تھا۔

سگریٹ کے خاتمے پر میں اپنی پتھریلی قیام گاہ میں لوٹ آیا۔ غار میں آ بیٹھا۔

کچھ فاصلے پر کھڑی۔ منتظر نیند کو میں نے مناسب جانا کہ اب تو ٹیلا ہی لیا جائے۔ اس پر اس نے آیا کہ وہ بے چاری اتنی دیر تک بن بلائے کھڑی رہنے کی عادی نہ تھی۔

بے شک تیری محفل میں رست چکا ہے لیکن تھوڑا سا سستا لینے میں کیا حرج ہے۔ ہاں ابھی مسلسل تو نہیں جاتے ہوں گے۔ اپنی دل نہیں پلٹیں بند کر کے نیند بھی کرتے ہوں گے تو ان کی عیوب کی

البتہ دقت۔ کچھ دیر پہلے نیند سے بڑھے اور تپتی تھیلے کے سر ہانے پر سر دھک کر لیٹ گیا۔

نیند جو بہت دیر سے کچھ فاصلے پر کھڑی میرے بلاوے کی منتظر تھی آئی تو کچھ ہلکی ہلکی تھی۔ آئی مگر میری آنکھوں میں اترنے سے جھجکتی رہی اور میرے بچوں کو اپنے شمار سے ہماری کر کے انہیں اٹھانے لگی۔

نیند مجھ میں مکمل طور پر نہ اتر سکی۔ ہاں چند لمحوں کے لیے ایک نیم غنودگی کی کیفیت طاری ہوئی۔ آدھے سوئے آدھے جاگے کے درمیان معاملہ رہا۔

پھر چند ساتتیں۔ دو چار۔ یا بے شمار ایسی آئیں کہ میں ایک گہری اونگھ میں چلا گیا۔ یہ صحن میں اتری ہوئی مگر چاندنی کی طرح مگر نیند تھی۔ ابھی کبھی۔ اور میں آس پاس سے غافل ہو گیا۔

اور جب میں جاگا ہوں۔ جو آدھا سو یا ہوا تھا وہ جاگا ہوں۔ کب۔ چند ساعتوں کے بعد اسے شمار کے بعد اس کا حساب نہ ہوا تو میں نے اپنے بدن تلے اپنے مصلے کے نیچے جو قدیمی جاہ نماز تھا اس کے نیچے جو چند سنگریزے تھے ان کی جھپٹ اپنے بدن پر محسوس کی۔ اور اس بدن پر چاندنی کے کچھ جزیرے روشن تھے۔ یہ کیا ہیں اور کہاں سے آ گئے۔ تن اپنا پرانا پاپی ہے تو اس پاپی سمندر میں سے لہریاں ہونے والے یہ جزیرے کیونکر وجود میں آ گئے۔ کسل مندی سے دایاں ہاتھ سیدھا کرنا ہوں تو وہ ایک چٹان پر جا ٹھٹھ ہوتا ہے بایاں ہاتھ بلند کرتا ہوں تو وہ ایک خلاء میں ہے۔ اوج اٹھ کر رہا ہوں تو نیم تاریکی میں ایک پتھر یا جھکاؤ ہے۔ اور سامنے دیکھتا ہوں تو ایک ناشائسا عجیب سی روشنی میں لہایا ایک مختصر صحن ہے۔ یہ سب کیا ہے۔ میں کہاں ہوں۔ اپنے آپ سے سوال کرتا ہوں کہ یہ تم کہاں ہو۔

اپنے بیڈروم میں تو نہیں ہو۔ تو پھر کہاں ہو۔

بہت بار۔ اپنی آوارگی کے دنوں میں اور کوہ نور دی کے دوران میں نے اپنے آپ سے یہی سوال پوچھا ہے کہ یہ تم کہاں ہو۔

ایک سویر جاگا ہوں تو اس خیال میں گمن اور قید جاگا ہوں کہ اپنے بیڈروم میں جاگا ہوں۔ بسٹر کے اطراف کا ہوائیاں لیتا ہوا واش روم میں داخل ہوں گا اپنا ازار بند اڑستا۔ اپنے خزاں رسیدہ جھریوں کی آمد پر سے پر چند پھینٹے برسواؤں گا۔ برش کروں گا۔ اپنے کبولت زدہ چہرے اور زرد وائلوں کو دیکھ کر ان سے نظریں چھڑاؤں گا کہ یہ میں نہیں کوئی اور ہے۔ شیو کروں گا۔ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن چند لمحوں بعد اپنے اوج سے غیبی کے پردے کو پٹ پٹ آکھیں جھپکا کر دیکھتا ہوں تو یکدم کھٹا ہے کہ نہیں۔ تار زنی آپ اپنے بیڈروم میں تو نہیں جاگے۔ کہیں اور ہی جاگے ہیں۔ یہ تو روم سوٹ روم کی ایک کیوننگ ہے۔ اور روم کی جھیل وندہ کا کنارہ ہے۔ جھیل جھیل کے پانیوں کی نوا دہی ہے۔ شاید میری ہے۔ فلورنس

استعمال کی نوبت نہ آئی کہ نہ میں ذرا اور نہ بے چین اور مضطرب ہوا کہ شائق اور امن میرے دوست بن گئے تھے۔

میں غار میں اٹھنے بیٹھنے اور لیٹنے کے تمام تر زاویے اختیار کر چکا تھا۔

ذرا دیکھتے ہیں کہ کتنے مختلف انداز میں مصلیٰ سے اٹھا جاسکتا ہے۔

ذرا حساب کرتے ہیں کہ بیٹھے رہنے کے مختلف رخ کتنے ہو سکتے ہیں۔

ذرا ادھر ادھر مرک کر لیٹے رہنے کے مختلف روپ دیکھتے ہیں۔

انہی میں سے کوئی ایک انداز رخ اور روپ بابا نے یقیناً اختیار کیا ہوگا۔

آس پاس دوائیں بائیں اور اوپر چھت پر۔۔۔ جو بھی پتھر تھے جو چٹانیں تھیں ان کی بناوٹ میں

کوئی ایک ذرہ بھی ایسا نہ تھا جس پر میں اس آس میں ہاتھ پھیر چکا تھا۔ اُسے محسوس نہ کر چکا تھا کہ بابا نے ان پر کبھی نہ کہیں ہاتھ رکھے ہوں گے۔

اور جب میں اپنے تئیں ہر پتھر کے ہر مسام کو اپنے ہاتھوں میں حفظ کر چکا تھا تو ایک اور خیال

آیا کہ بابا جب تھک جاتے ہوں گے تو لیٹتے ہوں گے اور جب لیٹنے کو نہیں محض بدن کو آرام دینے کوئی

چاہتا ہوگا تو کہیں نہ کہیں ایک لگا کر بیٹھ جاتے ہوں گے کیونکہ صحن کی جانب یا غار کے اندرون کی جانب

چارہ کر کے مسلسل بیٹھنے سے ریزہ کی ہڈی کے آس پاس تھکاوٹ ہو جاتی ہے تو اپنی کمر کو آرام دینے کے

لیے کسی نہ کسی جگہ سے پتھر سے ایک لگا کر سیدھی کر کے ضرور بیٹھتے ہوں گے۔

لیکن کہاں؟

ظاہر ہے دائیں جانب کی دیوار شانے کے قریب تھی اسی دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھتے ہوں

گے ایسے کہ ایک رخسار صحن کی جانب اور دوسرا رخسار غار کے اندرون کے رخ اور چہرہ مبارک سامنے

غار کی دوسری دیوار کی طرف۔۔۔

تو میں نے وہی حالت اختیار کی اپنی کمر کو پتھروں کے ساتھ جوڑا۔ ایک لگائی۔ اور کچھ آرام کیا

اور پھر ذرا سرک کر آگے ہوا اور پھر ایک لگائی تاکہ کوئی مقام جو ممکن ہے باقی نہ رہ جائے۔ اس عمل نے

مجھے بہت خوشی دی کہ یہ امکان پہلے میرے ذہن میں نہ آیا تھا۔

مجھے یاد نہیں وہ کون سا لمحہ تھا۔

رات کتنی بیت چکی تھی۔

جب میں لوٹنے کی مسلسل ادائیگی سے تھک گیا تبھی پھر وہ بول گیا۔

میری ریزہ کی ہڈی دکھائی گئی اور میں اسے آرام دینے کی خاطر پہلو بدل کر دائیں جانب کی

ہے۔ شاہ گوری کا دامن ہے یا ناٹکا پر بت کے سائے ہیں وادی زوہل ہے۔ جمیل کروہر ہے یا جمیل سرال

ہے۔ یہ آپ کا بیڈروم نہیں ہے قطعی طور پر جس میں آپ جا گئے ہیں۔ تو بالکل غنودگی اور حیرت کا وادی

تسلل ہے آوارگی کی وہی زنجیر ہے۔ وہی کڑیاں ہیں اور ان میں آخری کڑی غار حرا کی ہے۔ اگر اچھا

بیڈروم میں نہیں تو کہاں ہوں۔ غار حرا میں ہوں۔ لیکن ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔

اور ایسا ہے جب یہ کھلتا اور عیاں ہوتا ہے تو ایک عجیب سی سرخوشی غمور کیے دیتی ہے۔ کیسا ایک

دیوانے کا خواب ہے۔ یہ انبساط اور بے اختیار مسکراہٹوں کا سامان لیے ایک خواب ہے جو حقیقت ہے کہ

میں غار حرا میں ہوں۔

تو میں نے اُس شب اگر جان بوجھ کر نیند کو مدعو کیا۔ بار بار کیا تو اس میں بدنی تھکاوٹ اور

پڑمردگی کا چنداں دخل نہ تھا۔ کوشش کر کے ایک اونگھ میں چلے جانے کی تنگ و دو کی تو صرف اس لیے کہ

جب میں بیدار ہوں تو میرے نیم خوابیدہ حواس اپنے تئیں اپنے بیڈروم میں جاگیں اور پل دوپل کے بعد

انہیں احساس ہو کہ نہیں۔ ہم تو غار حرا میں جاگتے ہیں۔

میں نے اس کیفیت سے خمار حاصل کرنے کے لیے متعدد بار نیند کو مدعو کیا۔ اگرچہ وہ مکر نیند تھی

پر میں نے اُس کے مکر سے غفلت برتی جان بوجھ کر۔ اور ایسا متعدد بار ہوا۔

میں چاندنی کے جزیروں سے غافل نہ ہوا تھا۔ بلکہ وہ مجھے غافل نہ ہونے دیتے تھے۔ وہ چاند

کے ڈھلنے سے میرے بدن پر ڈھلتے گئے۔ اُسے ترک کر کے غار کے پتھروں پر جا متمکن ہوئے۔

مجھے اُن کی بے وفائی پر از حد قلق ہوا۔

پر اُن کا دوش نہ تھا۔ وہ چاند کی مسافت کے تابع تھے۔

چاند کے ڈھلنے سے وہ بھی ڈھلتے جاتے تھے اور غار کی بائیں دیوار کی چٹانوں پر چلے گئے

تھے۔ وہاں جا روشن ہوئے تھے۔ مجھے اور میرے بدن کو ترک کر گئے تھے۔ ہمیشہ کے لیے دلچسپ

ہو گئے تھے۔

UrduPhoto.com

تکثیف جاتی تھی۔

UrduPhoto.com

میں نے بھی چاندنی کم کم دھوئی جاتی تھی اور سائے بڑھتے جاتے تھے۔ میں اپنے تئیں غافل

میں ذہن کو سکون دینے والی کچھ گولیاں لے کر آیا تھا کہ اگر رات میں وہشت ہوئی۔ بہت ڈر بہت

غول آئے تو میں اُن میں سے ایک چٹان پر شاک ہو جانے کا چارہ کروں گا۔ لیکن اُن کے

UrduPhoto.com

پلٹتے ہوئے... یہ وہی حصہ تھا جہاں فیک لگا کر میں بیٹھا تھا اور ایک واہمہ میرے سر میں سرسرایا تھا۔ اور یہ واہمہ نہ تھا حقیقت تھی، میں میرے کندھوں کی چوڑائی کے مطابق کولہوں تک کے بدن کی مناسبت سے وہاں ایک نامعلوم سادہ پاؤ تھا پتھر میں جس میں فٹ ہو گیا تھا۔ ایک نامعلوم سانچہ تھا جس میں میرے کندھے اور کمر ڈھل گئے تھے۔ میں نے متعدد بار اپنے آپ کو اس حالت سے اور اسادائیں یا ہائیں کیا تو پتھر کی تختی میری کمر کے ساتھ آگئی لیکن میرے کندھے اس کے ساتھ نہ لگتے اور جوئی میں کھسک کر پہلے والی حالت میں آتا تو اس سانچے میں فٹ ہو جاتا اور ایک اطمینان سے فیک لگائے آرام کرنے لگتا۔

اس دریافت کا کسی اور کو تو کیا مجھے بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔

میں نے اس کی مزید پرکھ کی خاطر ایک اور طریقہ آزمایا۔

میں وہاں سے اٹھ کر مصلے پر اپنی نارمل پوزیشن میں آ بیٹھا۔ ایسے کہ میرا چہرہ اس دیوار کی جانب تھا۔ پھر میں نے اپنی پھیلی پھیلا کر اس میں ٹھوکر خیر کر دینے والی جس کو مجتمع کر کے دیوار پر ایک ناوٹا کی مانند ہولے ہولے ہاتھ پھیرا۔ اور کسی حد تک میں نا بیٹھا تھا بھی کہ غار کی تاریکی میں چاندنی کے پلندہ جھٹے ہوئے جزیروں کے سواہر نو تار کی تھی اور کچھ بھی واضح دکھائی نہ دیتا تھا۔ لیکن یوں سرسری طور پر ہاتھ پھیرنے سے قطعی طور پر یہ احساس نہیں ہوتا تھا کہ دیوار کی پتھر کی سطح کہیں سے بھی ناہموار ہے یا دلی ہوئی ہے یا اس کے وجود میں کوئی نامعلوم سا بھی فرق ہے۔ میں نے ہمت نہ ہاری اور بار بار اپنی پھیلی پٹان پر جھرا کر اسے دھیرے دھیرے محسوس کرتے پھیرتا رہا۔ اور پھر ایک بار ایسے محسوس ہوا کہ ناوٹا کی انگلیاں خط بریل کے کسی حرف پر ہیں۔ اس فرق کے ساتھ کہ بریل ابھرا ہوا ہوتا ہے اور یہ حرف وہاں ہوا کھدا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ ہاں یکدم تھوڑا سا فرق میرے پہلوؤں نے محسوس کیا۔ شاید وہ برابر۔ شاید ریت کے ذرے کے برابر۔ میں نے پھر اپنا ہاتھ پیچھے کیا اور سانس روک کر اسے پٹان پر بہت آہستگی سے آگے سرکایا۔ ہاں فرق تو تھا۔ یکدم اس کی تختی نرمی میں بدل جاتی تھی اور وہ دلی ہوتی محسوس ہوتی تھی۔

یہ فرق کیسے آ گیا۔

دیوار کی پٹان میں ایک نامعلوم۔ کندھوں سے کولہوں تک کا دھاؤ کیسے وجود میں آ گیا۔

اس کی ایک تو جہہ ہو سکتی تھی۔

پتھر کی حرا کی غار کے الٹ میں میرے ہاتھ صرف انہوں نے ہی اس مقام کو دریافت کیا تا کہ ان کے ذہن میں جو سوال تھے ان کا حل اور لکھام قہرے اور اس کو قہرک رکھنے والی قوت کے

چٹائی دیوار کے ساتھ شانے لگا کر۔ کمر جوڑ کر بے دھیانی میں فیک لگا کر بیٹھ گیا اور تب ایک اور نایاب تجربے کی سننا ہٹ میرے بدن میں پھیل گئی۔ مجھے واہمہ سا ہوا کہ میرے شانے اور میری پشت پہلے کولہوں تک اس چٹان میں ثبت ہو گئے ہیں۔

جیسے حسن ابدال میں گورنا تک کا بچہ ایک پتھر میں نقش ہے اور اگر کوئی یا تری اس پر اپنی پھیلی ہوئی انگلیاں رکھتا ہے تو وہ اس میں ثبت ہو جاتی ہیں۔ جیسے ریت میں پاؤں کے نشان دھنسنے ہوں تو ان پر پاؤں رکھنے سے وہ ثبت ہو جاتے ہیں۔

تو ایسے ہی جوئی میں نے پتھر کی دیوار سے فیک لگائی تو مجھے محسوس ہوا کہ اس کی ہمواری میں یہاں کچھ فرق ہے۔ میرے شانے اور پشت اس طور اس میں فٹ ہو گئے ہیں جیسے پہلے سے ہی وہاں کسی پشت کا نشان ثبت تھا اور میں اس میں عین موزوں ہو گیا ہوں۔

پتھر کی ہمواری میں ذرا سادہ پاؤ آنے سے وہاں فیک لگانے کے لیے ایک جگہ تھی۔

ایک نامعلوم سا سانچہ تھا جس میں میری کمر اور شانے ڈھل گئے تھے۔

میں نے فوراً اس واہمے سے باہر آنے کی کوشش کی کہ نہیں یہ تو میرے اُلجھے ہوئے ذہن کی تخلیق ہے جو ممکنات کی کھوج میں ہر سنگریزے اور ہر پتھر میں کچھ نہ کچھ دریافت کرنا چاہتا ہے اور بے وجہ کر لیتا ہے۔

کوئی بھی پتھر محض کسی کے فیک لگانے سے کمر سے لے کر شانوں تک کے جسم کو آرام دینے کی خاطر فیک لگانے سے موم کا تو نہیں ہو جاتا کہ اس میں گنجائش ثبت ہو جائے۔ جیسے ریت پر پھیلی رکھنے سے ریت دب جاتی ہے اور اس کا نقش بن جاتا ہے۔

یہ واہمہ ہے۔

ایسا ہونا ممکن نہیں ہے۔

اسی گتھی کو سلجھانے کی خاطر میں نے ایک اور طریقہ کار آزمایا۔ ایک تجربہ کیا۔ میں وہاں سے اٹھا اور غار کے دہانے سے جہاں سے یہ پتھر کی دیوار شروع ہوتی تھی وہاں جا کر اس کے ساتھ فیک لگا کر کچھ دیر بیٹھا رہا۔ جہاں محسن کی کچھ چاندنی میرے دائیں شانے پر اثر کرتی تھی۔ مجھے یہاں کچھ بے آرامی اور پتھر کی تختی نسبتاً زیادہ محسوس ہوئی۔ پھر اپنی پشت اور شانوں کو دیوار کے پتھر کے لمس سے الگ کیے بغیر اور کھسکا۔ غار کے اندرون کی ہوائی لہر کا۔ کچھ دیر ویسے ہی فیک لگائے بیٹھا رہا۔ پھر قدرے سرک کر اور اسی حالت میں دیوار سے اپنے آپ کو جدا کیے بغیر اس کی تختی کو محسوس کرتا اور اور

بارے میں اُن کے جوابوں کی جستجو کی جاسکے۔

نہیں.. وہ اوّل مکین نہیں تھے غار حرا کے.. قدیم زمانوں سے جو ذہن الگ سوچ رکھتے تھے.. جاننا چاہتے تھے کہ ابر کیا چیز ہے.. ہوا کیا ہے.. ماجرا کیا ہے.. خانہ کعبہ کے اندر رکھے ہوئے سینکڑوں خود ساختہ خداؤں کی خدا کی سے مطمئن نہ تھے.. جو کھوج رکھتے تھے.. متلاشی تھے.. نا آسودہ تھے معاشرے کے چلن سے تو وہ اپنے آپ کو ان خداؤں اور چلن سے الگ کر کے اپنے سوالوں کے جواب چاہنے کے لیے اسی تنہائی میں آیا کرتے تھے.. جو ”حلیف“ کہلائے رسول اللہ کی پیدائش سے پیشتر.. ہزاروں برسوں سے یہی دستور تھا.. جو بھی ناخوش اور نا مطمئن تھا وہ اسی غار کا رخ کرتا تھا..

چنانچہ یہی توجیہ ممکن تھی..

یہی سبب ہو سکتا تھا..

جیسے شمال میں کوہ نور دی کے دوران دُور افتادہ وادیوں کے گرد جو چٹانوں کے حصار تھے وہاں میں نے مشاہدہ کیا تھا کہ ٹھوس لوہے سے بھی سخت چٹانوں پر سینکڑوں برسوں سے اُن کے سینے پر روزانہ جو قدم پڑتے تھے.. اُن کے تسلسل نے اُن چٹانوں میں واضح راستے ثبت کر دیئے تھے.. یہاں بھی ہو بہو ایسی ہی شکل ثبت ہوئی تھی..

جانے کتنے ہزاروں برسوں سے اس غار میں آنے والے اُن گنت متلاشی جب گیان دھیان میں گم کبھی تھکاؤٹ کا احساس کرتے ہوں گے تو ذرا سا پہلو بدل کر نزدیک ترین اسی مقام سے ٹیک لگا کر اپنی کمر کو آرام دیتے ہوں گے.. جیسے پتھر پر پانی کے قطرے مسلسل گرتے رہیں تو اُس میں بھی ایک گھاوا جنم لے لیتا ہے.. تو کچھ ایسے ہی کمر ٹیک کر آرام کرنے والوں کے ہزاروں برس کے تسلسل سے اس چٹان میں ایک دباؤ وجود میں آ گیا تھا..

ایک انسان چاہے وہ کتنا ہی غرق اور گمن ہو تلاش میں بے خود ہو.. غار کے درمیان میں پہروں بے آسرا نہیں بیٹھ سکتا.. اُسے سہارے کی حاجت ہوتی ہے.. اور اسی حصے میں سہارے کی آسرا کی جگہ تھی..

اُن کی جستجو کی گرمی نے... بدنوں کی حدت نے اس دیوار کو تھوڑا سا پگھلا کر ٹیک لگانے کے لیے یہ جگہ بنائی تھی..

لیکن یہ عمل ہزاروں برسوں کے تسلسل کے ساتھ جاری رہا تب جا کر یہ دیوار میں ایک دھاوا لگ گیا.. ہوا جسے رات کے اندھیرے میں تو گیان کی روشنی میں بھی بے شک وہ ایک دیدہ دینا ہو تب بھی نہیں دیکھ سکتی تھی.. اُسے محسوس نہ تھا تو یہی بات ہے..

کیا یہ نقش.. پتھر میں ثبت شدہ.. یہ نشان تاریخ کے کسی تذکرے میں آج تک آیا ہے.. یہاں نہیں جاتا.. کیا یہ.. چودہ سو برسوں میں.. پہلی بار.. یہ میری دریافت ہے.. میرا بیان ہے.. میں یہ بھی نہیں جانتا کہ جائے نہ جائے سے یہاں کیا فرق پڑتا ہے..

شاید اس دریافت کا سبب محض یہ ہو کہ یہاں آج تک جتنے بھی آئے.. کامل یقین والے اور رام راستہ چلنے والے آئے اور اگر ایک ذہل یقین والا اور بھٹک جانے والا شخص آیا تو تقدس میں غرق ہو جانے کی بجائے.. گناہ اور ثواب سے یہ کجست بیگانہ.. انہی بکھیڑوں میں الجھا رہا کہ بابا کہاں ہاتھ رکھتے تھے اور کہاں ٹیک لگا کر آرام کرتے تھے..

ویسے میری شدید تمنا ہے کہ اگر کوئی اب تک ایسا آیا نہیں تو اب کوئی نہ کوئی.. کبھی نہ کبھی کوئی آئے.. بہتر یہی ہے کہ رات میں آئے.. اور میری طرح ہر شے سے بیگانہ ہو کر بیکار جستجو کرتا رہے.. چٹانوں اور پتھروں پر ٹیٹاؤں کی مانند ہاتھ پھیرتا رہے.. کوئی ایسا آئے جو میرے بیان کی تصدیق کرے..

اگرچہ مجھے ایسی تصدیق کی چنداں حاجت نہیں ہے.. کہ میں بابا کے گھر کے اندر.. ایک چٹان میں ثبت نامعلوم نقش کو تخلیق کرنے سے تو رہا.. محض ایک سلسلہ وجود میں لانے کے لیے تو ایسا کرنے سے رہا.. میرے اس بیان میں کہیں بھی ممکنات سے اُلجھے ہوئے ذہن کا عمل دخل نہیں کہ یہ ایک علیحدہ بیان ہے..

یہ تو ایک توجیہ ہوئی.. دوسری توجیہ جو میرے دل کو لگتی ہے بے شک بے سبب لگتی ہے یہ بھی تو ہو سکتی ہے کہ میرے اُلانے اپنے جتنے کو آرام دینے کی خاطر یہاں ٹیک لگائی تو پتھر موم ہو گئے..

جب میں مطمئن ہو گیا کہ ہاں بے شک چٹان میں ایک نقش دبا ہوا ہے اور میں اپنے شانے اس نقش کے سانچے میں ڈھالے ٹیک لگائے بیٹھا تھا تو لامحالہ وہی خیال آیا.. جو دل کے دھڑکنے کا وارہا سبب بنتا تھا وہی سوال آیا جس نے یہاں اس مقام پر آنا تھا.. کہ جہاں میرے شانے ہیں یہیں بابا کے روشن شانے بھی آرام کیا کرتے تھے..

جہاں جہاں میرا بھڑا وجود چٹان کے ساتھ لگا ہوا ہے تو یہیں وہ مناسب کسا ہوا مہکتا بدن بھی چھوٹا تھا..

یوں تو غار حرا کا کون سا چہرہ کون سا مسام ہے ایسا جس پر بابا کے ہاتھ نہ چھوٹ ہوئے ہوں

آنکھوں میں اتارنا تھا۔ اس کا لمس محسوس کرنا تھا اُسے جاننے کی سعی کرنا تھی۔ چنانچہ میں اپنے بابا کی ٹپک سے ٹپک لگا کر بھی بہت دیر نہ بیٹھا۔ وہاں سے اُٹھا اور جب تک کمرہ میں آ گیا۔

اتنی مکمل خاموشی۔

ایک سنانا ٹھہرا ہوا، ازل تا ابد۔

شرنگ کا دہانہ ایک مہیب غلاہ لگتا تھا۔

غار حرا بھی اتنی تاریک دکھائی دے رہی تھی کہ اُس کے وجود کا احساس بھی گم ہو رہا تھا۔

نیا ز کا خوابیدہ بدن چٹان کے سائے میں جا چکا تھا۔ بالکل گم۔ ناموجود ہو چکا تھا۔

بابا جب غار سے باہر آتے تو نیچے پھیلے ویرانے کو، اُن پر جو آسمان تھا اُس میں حرکت کرتے

ستاروں کو، اور چاند کی بارہویں کو اسی چاند کو اسی مقام پر ٹھہرا ہوا دیکھتے تھے اور غور کرتے تھے۔ یہ کیا ظلام

ہے۔ کیا یہ خود بخود چل رہا ہے یا اسے چلانے والا کوئی ہے۔ وہ کیا ہے۔ کون ہے۔ کہاں ہے۔

میں نے اپنا رخ بدل کر غار حرا پر نظر ڈالی، غور کرنے سے ہموار پتھر پر رکھے میرے جو گرز

پھولی ہارچ، شمع اور دودھ کی بوتل نظر آ جاتی تھی۔ البتہ تپتی تھیلیاں تاریکی میں روپوش تھیں۔

میں غار میں داخلے پر واقع تمام پتھروں کو پرکھ چکا تھا، چھو چکا تھا، داخلے کے دائیں جانب

چاند پتھر جو کھائی کی جانب تھے اور غار کے وجود کا حصہ تھے اُن کی پسمان بین البتہ میں نے ابھی نہیں کی

تھی۔ یہ وہی پتھر تھے جن پر ترک مائیاں منڈلاتی صحن میں کود گئی تھیں۔ میں انہیں ہاتھوں سے چھو لے لگا۔

ان کی بناوٹ اور گھیر کا اندازہ لگانے لگا۔ زاویے بدلتا دراڑوں میں جھانکتا ان کی ساخت اور موجودگی کا

آپس کرنے لگا۔ اور تب ان پتھروں کے اندر مجھے ایک شکاف نظر آیا جو اس سے خوشتر مجھے دکھائی نہ دیا

تھا۔ اس لیے بھی کہ میں نے اس زاویے سے پتھروں کے ساتھ لگ کر اس کی کھوج نہ کی تھی۔ یہ اُن

دکانوں میں سے نہ تھا جن کے راستے چاندنی غار میں اُترتی تھی۔ یہ غار سے باہر کھائی کی جانب جو پتھر

ایک دوسرے کے سہارے آرام کرتے تھے اُن میں تھا۔ اور صرف تب ظاہر ہوتا تھا جب آپ اپنے

زخار کو اُس پتھر سے جوڑ کر۔ اپنے بدن کو ذرا دھرا کر کے اپنے آپ کو تھوڑی سی اذیت میں مبتلا کر کے

اُدھر جھانکتے تھے۔

یہ محض ایک شکاف نہ تھا ایک در تھا جو شانہ کعبہ پر کھلتا تھا۔

پتھروں کا ایک چمکھٹا تھا جس میں شانہ کعبہ کی مکمل تصویر جڑی ہوئی تھی۔

چاندنی چال سے میں اندازہ لگا سکتا تھا کہ اُس سے شاید دو بجے ہوں گے جب میں نے اُس

شکاف میں اپنی کاملیت میں روشن شانہ کعبہ کو ظاہر میں دیکھا۔

اُن کے بدن کی قربت میں نہ رہا ہو لیکن یہ گوشہ چٹان میں مثبت شدہ نامعلوم سادہ پاؤ ایسا تھا جس کے حصے میں اُن کا لمس جڑا ہوا تھا۔

ایسے کہ اگر میں ویدہ بینا رکھتا احساس کی معراج کا اہل ہوتا تو جہاں میرے شانے لگے تھے وہاں اُن کے شانوں کے درمیان جو مہر تھی جسے دیکھ کر سلمان فارسی ایمان لائے تھے میں اُس مہر کو بھی اپنے شانوں پر محسوس کر لیتا۔

میں اپنے شانوں میں اُن کے شانوں کی حدت محسوس کرتا ہاتھ سینے پر باندھے اُس گھپ اندھیرے میں بیٹھا۔ کچھ نہیں بہت سادہ یوانہ ہو گیا اور مسکرانے لگا۔ میرے اندر ایک تقاضا کا جذبہ جاگا کہ یہ میں ہوں جس نے یہ مقام دریافت کر لیا ہے۔ میں ہوں۔ لیکن یہ دیوانگی فوراً ہی پانی کے بلبلے کی طرح بیٹھ گئی۔ میرے ہاتھ تو سینے پر بندھے ہوئے تھے تو میں نے رب کعبہ سے معذرت کی۔ اگرچہ اُس کا گھر میرے بائیں رخسار کی جانب غار کے آخری شکاف کی جانب تھا اور میرا رخ سامنے کی دیوار کی جانب تھا لیکن میں نے شرمندگی کا اقرار کیا اور دریافت کے اس تکبر اور تقاضا کے لیے تہہ دل سے معافی کا خواستگار ہوا۔

ویسے اُس مقام پر شاید تھوڑا سا تکبر کر لینا بھی کچھ برائہ تھا۔

اس حساب کتاب میں۔ ان تو جیہات میں بہت دیر تک الجھا رہا اور شکافوں میں سے اُترتی چاندنی کے حصوں سے پھر ذرا غافل ہو گیا۔

وہ غار کے فرش سے رخصت ہو کر اب غار کی دیواروں پر ٹھہرے ہوئے تھے۔ چاندنی کے یہ جزیرے میری عارضی غفلت کے دوران اپنے مقام بدل کر۔ آگے ہو چکے تھے۔ جیسے جیسے رات آگے جاتی تھی ویسے ویسے وہ سرکتے جاتے تھے۔

سفر میں تھے۔

اور میں وہیں ٹپک لگائے سحر زدہ چاندنی کے اُن جزیروں کو نکلتا رہا جو اندرون کی تاریکی میں سفر اگرچہ آہستہ آہستہ۔ مگر کرتے تھے۔

باہر چل کر پرب چاند و چلنے لگا تھا اور غار حرا کا صحن پہلے کی مانند چاندنی سے بھرنا ہوا تھا بلکہ چٹانوں کے سائے صحن میں رہتے ہوئے تقریباً نصف حصے تک آچکے تھے۔

مجھ میں اس شب کا جو بھان تھا وہ مجھے ایک مقام پر نکلنے نہ دیتا تھا۔ غار حرا ایک کائنات تھی اور

میرے پاس گزرتی، دلی شہ کی اُس چمکند اور صاف تھیں جن میں مجھے اس کائنات کے اڑے اڑے کو

مجھے یہاں بلا لیا۔ اپنے گھر میں شب بھر بھر لیا۔ میں ایک شک کا مارا۔ مگر کارا۔ مونا سا بھدا سا آہو تھا جو بھٹکتا تھا۔ اُسے کوئی بھی شکاری آسانی سے شکار کر سکتا تھا کہ وہ قلعہ نہیں بھرنے کے قابل نہ رہا تھا۔ تو جنہوں نے پھالیا۔ بلا لیا۔ اپنے نخلستان میں بلا لیا اور اپنی اوک میں سے پانی پلا کر مجھے ہرا بھرا کر دیا۔ تو ایسے بے مثال بابا کو سلام کیے جائیں۔۔۔ بے شک اربوں لوگ انہیں روزانہ سلام کرتے تھے لیکن غار حرا میں بیٹھے ہوئے شب کے اس پہر تو بہت کم نے سلام کیے ہوں گے۔

میں درود بھیجتا رہا۔

کبھی صرف اُن کے نام کا ورد کرتا رہا۔

کبھی اقرار کرتا رہا۔

اور کبھی گواہی دیتا رہا۔

بے شک ساقیا تجھے نیند نہیں آئے گی۔

اور بے شک تیری محفل میں رت جگا ہے۔

لیکن میرا عمر رسیدہ بدن اتنی برا بیختی اور دکھاوت کی تاب نہا سکتا تھا۔ تھک چکا تھا۔

انہیں سلام کرتے۔ اُن پر درود بھیجتے نہیں تھکتا تھا کہ یہ تو خون میں گردش کرتے چلے

جاتے تھے۔

میں اپنے کہولت زدہ بدن کو آرام دینے کی خاطر لیٹنے کو تھا کہ حکم نے پھر بھوک کی دوہائی دی۔

روحانی خوشی اور الوہی پہچان میں بھی پیٹ پکارتا ہے کہ اب مجھے دو روٹیاں دو۔

میرے پاس روٹیاں تو نہ تھیں۔ چند کھجوریں اور دودھ تھا۔ اور مجھے خدشہ تھا کہ دودھ اتنا نہیں

تھا جتنا میں پی چکا ہوں۔ لیکن بوتل کے اندھے پلاسٹک میں وہ اب بھی چھلکتا تھا۔

نیند تو خیر کہاں آئی تھی۔

بہت پکپکارنے اور منت سماجت کرنے پر وہ کچھ مائل ہوئی پر مجھے مدد ہوش کرنے میں ناکام

والی۔

میں آدھا سوتا آدھا جاگتا تھا۔

میری نگاہ کی آنکھ بند تھی لیکن اندر کی آنکھ پلک بھی نہ جھپکتی تھی کھلی تھی۔

میں ایک عارضی فطرت میں اتر گیا۔

جانے رات کا کون سا پہر تھا۔

جانے میں کہاں تھا۔

میں اپنے رخسار کو ذرا آرام دیتا تھا۔ بدن کو ڈھیلا چھوڑتا تھا تو وہ شکاف خانہ کعبہ کی تصویر سمیت پتھروں میں اوجھل ہو جاتا تھا۔ اور میں پھر تر و ذکر کے چٹان کے ساتھ جڑ جاتا تھا۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہاں جان بوجھ کر اس شکاف کو عیاں نہیں کیا گیا تھا کہ جس کو طلب ہو جستجو ہو وہی اسے تلاش کرے اور رب کے سوئے گھر کی تصویر پتھروں کی نیم تاریکی میں جڑی دیکھ لے۔

روشن اور تابندہ۔۔۔ غار کے آخری شکاف میں سے تو بہت مشقت سے مینار کا صرف ایک حصہ دکھائی دے جاتا تھا لیکن یہاں صحن میں سے۔۔۔ باہر کھلی فضا میں۔۔۔ اس روزن میں سے خانہ کعبہ کی روشن شکلیں چلی

آتی تھیں۔

اس حیرت بھرے پوشیدہ منظر میں کسی اور کو کیسے شامل کیا جائے۔ اس کے لیے ایک راستہ چاہیے۔ اور وہ بھی جبل نور پر۔ غار حرا کے صحن میں اترتی اور دھیرے دھیرے سمتی مدھم ہوتی کچھ چاندنی

چاہیے۔ ایک بڑی تنہائی اور اُس سے بھی بڑا ذہنی خلل چاہیے۔ تب جا کر یہ درکھلتا ہے۔ ایک دروازہ ہوا ہوتا ہے جو سنگ صفت ہے۔ اور پھر اُس میں سے خانہ کعبہ نظر آتا ہے۔

یہ نظر کا دھوکا بھی لگتا ہے۔

کیونکہ ذرا سی حرکت سے گم بھی ہو جاتا ہے۔

کوئی آپ کو اس پوزیشن میں۔۔۔ چٹان سے رخسار جوڑے۔۔۔ بدن کو دوہرا کیے مہبت دیکھے تو یہی سمجھے کہ یہ کوئی دیوانہ ہے جو پتھروں کے ساتھ پتھر ہو جانا چاہتا ہے یا شاید کان لگائے اُن سے باتیں

کرتا ہے اور اُن کی سرگوشیاں سنتا ہے۔

مجھ سے پہلے بہت سے لوگوں نے اس زاویے کو دریافت یقیناً کیا ہوگا۔ نیاز بھی شاید آگاہ ہو۔ لیکن ایسی شدہ تنہائی میں شاید ہی کسی نے یہ تصویر دیکھی ہو۔ میں نے شاید پہلی بار ایک کیمرے کی کمی

محسوس کی۔ کہ کیسی مدھ بھری مست کر دینے والی تصویر وجود میں آتی۔

لیکن کیمرہ ہوتا تو میں اُس کی آنکھ سے ہی اس تصویر کو دیکھتا رہتا اور میری اپنی آنکھ محروم رہتی۔

میں نے اس منظر کو۔۔۔ تاریک پتھروں کے شکاف میں سے روشن ہونے والے رب کے گھر کو۔ اس کے بے مثال منور نقش کو اپنے اندر نقش کیا اور کچھ دیر بعد پھر اپنے گھر کو لوٹ گیا۔

واپس اپنے مصلیٰ پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور سوچا کہ کھونج اور جستجو اپنی جگہ لیکن انہوں بھی

سلام کو لیا جائے۔ اُن کو درود بھیجا جائے جن کی یہ ہر بایاں ہیں۔ اُنہیں اور عنایتیں ہیں جنہوں نے

کو تپا پسند کرتی ہے۔

میں نے اپنے آپ کو اسی حالت میں رکھا۔ ہلا جانا نہیں، اُسے نکلتا رہا اور مجال ہے جو اس نے مجھ سے آنکھیں ہٹائی ہوں۔

میں بھی اُس کی موجودگی کو پسند نہیں کر رہا تھا۔ وہ مجھے بے آرام کر رہی تھی، لیکن میں اس کا کروں کیا۔ یہ سوچا کہ یکدم اسے خوشو کر کے بھگا دوں۔ پھر فوراً ہی مجھے خیال آیا کہ یہ کوئی عام سی میاؤں جی نہیں ہے، حرم کعبہ کی حدود میں رہنے والی بلی ہے، قابل احترام بلی ہے۔ وہ بھی جانتی ہے کہ وہ حفاظت میں ہے۔ اور کون جانتا ہے کہ اس کا باپ وہ ہو۔ اصحاب صفہ کے تھڑے پر بیٹھے والا بوسیدہ اور دامن دریدہ پیرا بن والا۔ بھوک سہنے والا۔ ایسا کہ بلی بھر کے لیے بابا کی جدائی نہ سہتا تھا۔ صفہ کے تھڑے پر ہمہ وقت بیٹھا اُن کو ہمہ وقت نظروں میں رکھتا تھا۔ اور بابا نے جتنا کہا وہ اوروں نے کم بیان کیا۔ اب سے زیادہ اُس نے بیان کیا۔ بابا نے جو کچھ کہا اسی بے گھر بھوک سہنے والے فقیر نے یاد کیا اور بعد میں بیان کیا اور وہ ہمارے پاس پہنچا اور ہمارے عقیدے کی پختگی کا سبب بنا۔ میں اُس فقیر کے فقیروں کا بھی فقیر تھا اور حج کے دوران مسجد نبویؐ میں بس اُسی تھڑے پر کچھ دیر بیٹھ جانے کی خواہش میں مرا جاتا تھا جہاں یہ بے آسرا، یہ بلیوں کا باپ، ابو ہریرہؓ بیٹھا کرتا تھا۔

تو میں اُس کی ایک بلی کو خوشو کر کے کیسے بھگا سکتا تھا۔

اسی بلی کے آباء اجداد ہی تو اُس صحابی رسولؐ کے گرد میاؤں میاؤں کرتے پھرتے تھے، وہ اللہ سے اتنی اُلفت کرتا تھا کہ بابا نے اُسے بلیوں کے باپ کا لقب دے دیا اگرچہ اُس کا خاندانی نام تو کچھ اور تھا۔

وہ جو نامور تھے اور بابا کی قربت میں تھے اُن کی نسبت میں بلیوں کے باپ کو شاید اپنی ناگہمی میں زیادہ اپنا جانتا تھا۔ میں اُن کے آگے سر تعظیم خم کرتا تھا عقیدت کے مارے اُن کی جانب دیکھتا تھا لیکن اس کی جانب میں اپنائیت اور عشق میں مبتلا دیکھتا تھا۔ اگر ایک اور جہم کا امکان ہوتا تو شاید میں بھی اصحاب صفہ میں سے ایک ہونے کی خواہش کرتا۔ یہ ممکن نہ ہوتا تو کم از کم میاؤں میاؤں کرتی ابو ہریرہؓ کی ایک بلی ہو جاتا۔

نوقت تو کسی کو نہ تھی۔ بابا کے گرد جو رفیق جو چاہنے والے قربان ہونے والے تھے اُن میں سے کسی ایک کو دوسرے پر نوقت تو نہ تھی۔ اگر تھی تو اُسے ہی ہو سکتی تھی جس نے بابا کے پیکر کو، اُن کے اچھے بیٹے اُن کی حال کو، اُن کے وجود اور اُن کی عبادتوں کو، اُن کی مسکراہٹوں کو اور اُن کی آپس میں بڑی ہونی بہنوں کو کبھی صحت میں اور کبھی علالت میں، کبھی خوشی میں اور کبھی الم میں ڈوبے ہوئے، کبھی

اور سوال یہ ہے کہ کیوں تھا۔

جب میں نے اُس غفلت میں سے بلی دوپل کے لیے باہر آتے ہوئے آنکھ کھولی، آگے کھولی۔ تو میری آنکھوں کے سامنے دو آنکھیں تھیں۔ مجھے گھورتی ہوئی۔

جیسے دو الوداعی بلیوں ایسے جلتی ہوئی۔ دھکتے ہیروں کی مانند تاریکی کے زیور میں جڑی ہوئی۔

وہاں جہاں گھپ اندھیرا تھا وہاں۔ مجھے دیکھتی ہوئی۔ زندہ اور سیال آگ کی مانند بھڑکتی ہوئی۔

یہ ایک بلی تھی۔

لیکن یہ احساس ہونے سے لمحہ بھر پہلے جب میں نے آنکھیں کھولیں اور یکدم اُن آنکھوں کو عین اپنے سامنے گھورتے دیکھا تو ظاہر ہے کچھ گھبراہٹ ہوئی۔ نا معلوم کا خوف لمحہ بھر کے لیے بدن میں تیرا۔ اُسے تھوڑا سا بے جان کیا کہ یہ ہے کیا۔ آسب ہے رُوح ہے اور کیا میری جان کے درپے ہے شاید کوئی ایسی شے جو غار حرا کی محافظ ہے۔ کیا ہے۔ میں نے اپنے خوف پر قابو پایا۔ نہیں اس مقام پر ایسا کچھ نہیں ہو سکتا۔ کچھ ایسا نمودار نہیں ہو سکتا۔ بابا کے گھر میں نہیں۔ اور تب تاریکی میں اُس کی بقیہ ہر گز واضح ہوئی تو یہ ایک بلی تھی۔

وہ اطمینان سے سنگ مرمر کے سلوں سے ذرا آگے پتھر پر براجمان تھی اور مجھے ٹٹنگی باندھ کر گھورے چلی جا رہی تھی۔

ہو سکتا ہے وہی بلی ہو جو جبل نور کے تھڑے پر لیٹے ہوئے کبڑی ہوتی میری ناگہم سے لٹکتی تھی۔

میرا خیال ہے وہی تھی یا اُس جیسی تھی۔

لیکن وہ یہاں کیوں تھی؟

کیا کرنے آئی تھی۔

غار حرا وہاں آگے کی عادی تھی۔ یہ مقام اُس کے لیے اجنبی نہ تھا۔ شاید وہ ہر رات، اسی جگہ یہاں آتی تھی۔ ایک پوشیدہ جگہ پر رات بسر کرتی تھی اور اب آئی تھی تو اُسے حیرت ہوئی تھی کہ جہاں کبھی کوئی نہیں ہوا یہ کون ہے جو یہاں ہے۔ میری سب سے بڑی کے مقام پر یہ بیٹھا ہے تو اس سے ہمت کرا کے حاصل کروں۔ میں اُس کے مسلسل گھومنے سے اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ یہاں میری موجودگی

زردہ بکتر سینے پر سجائے ہاتھ میں تلواریں لیے... اور کبھی چادر اوڑھے حالت وحی میں.. حالت کلام میں.. دن رات دیکھا تھا.. انہیں مسلسل اپنی نظر میں رکھا تھا.. تو ایسے بھوک سے مارے ہوئے.. تار تار ہلکا سا والے.. کو فوقیت تو حاصل ہے..

اُسے تو کیا اُس کی بلیوں کو بھی فوقیت حاصل ہے.. ہم سب پر.. کہ انہیں بابا بھی پسند کرتے تھے اُن کی پشت سہلاتے اُن سے پیار کرتے تھے.. اگر ایک بار اُن کے کبل پر ایک بلی سوئی ہوئی تھی تو انہوں نے اُسے جگایا نہیں تھا پاس بیٹھے انتظار کرتے رہے تھے کہ یہ اپنی نیند پوری کر لے تو میں اپنا کبل اوڑھوں.. اُسے ٹھوکر کے بھگایا نہیں تھا تو میں کیسے اس بلی کو جو بابا کے گھر میں بیٹھی تھی ٹھوکر کے ہٹا سکتا تھا..

میں نے اجتناب کیا..

اُسے بیٹھا رہنے دیا..

بے شک یہ وادی مکہ تھی اور ابو ہریرہؓ کی بلیاں مدینے میں تھیں.. لیکن جانوروں کی نسل کا تسلسل تو وہی رہتا ہے.. خاص علاقوں اور خطوں میں اُن کی نسل ایک ہی ہوتی ہے.. وہ کہیں باہر سے تو نہیں آتے.. بلی پاکستان میں بھی ہو تو بھی اُسے دیکھتے ہوئے ابو ہریرہؓ کی ذہن میں آتے ہیں..

عین ممکن ہے کہ اس ایک بلی کا ابو ہریرہؓ کی بلیوں سے دور کا بھی واسطہ نہ ہو.. اور عین ممکن ہے کہ یہ انہی کی نسل میں سے ایک ہو..

تو میں نے اُسے ٹھوکر نہ کیا..

اُسے بیٹھے رہنے دیا..

بہر طور یہ ایک بلی وادی مکہ کی باسی تو تھی.. حرم کی حدود میں تھی.. اس پر ہاتھ اٹھانے سے گزند پہنچانے کی منافی تھی.. حج کے دوران اسے نقصان پہنچائے تو آپ کا حج خطرے میں پڑ جاتا ہے.. یہ بلی برگزیدہ بلی تھی.. ویسے بھی آثار یہی تھے کہ یہ جبل ثور کی گھاٹیوں میں اور پتھروں میں اور شاید اسی غار میں پلے بڑھی ہوگی تو اس کا حق بنتا تھا.. میں تو ایک شب کا مہمان تھا.. مجھے تو چلا جانا تھا.. میرے جانے کے بعد بھی اس نے یہاں آتے جاتے رہنا تھا.. تو اس کا حق بنتا تھا اس مقام پر..

میں تو آیا تھا چلا جاؤں گا.. پھر کہاں آؤں گا..

اس نے اس نصیب والی نے آتے جاتے رہنا تھا..

مجھے تب تو احساس نہ ہوا بعد میں خیال آیا کہ بے شک محترم ہے لیکن ہے تو بلی.. اور اس نے میری تکیہ چیلنے میں پہچانی ہوئی وہ میری بلی کی خوشبو نہ گھلی ہے اور اس لیے تجھے سبک دیتی ہے کہ پھر نہیں

مجھ سے نظر ہٹائے تو میں دودھ سے اپنی مونچھیں گیلی کر لوں.. جب احساس نہ ہوا.. وہ مجھے بہت دیر تک ٹنگی باندھ کر دیکھنے کے بعد آرام سے لیٹ گئی.. لیکن ایسے رخ پر کہ وہ مجھے نظر میں رکھ سکے.. اُس نے آنکھیں کھلی رکھیں جو غار میں جلتی رہیں.. میں بھی اسی طور حرکت کیے ہٹا ہٹا کر اُس پر نگاہ رکھے لیکن ہر مہمان کو یہ مجھے دشمن جان کر حملہ آور نہ ہو جائے مجھے پہچان نہ سکے کہ میں اُس کے باپ کی بھوک اور غربت کا غلام ہوں.. اُس کے فقیروں کا فقیر ہوں..

وہ حملہ آور ہو سکتی تھی کہ میں نے اُس کی آرام گاہ میں موجود ہونے کی جسارت کی تھی.. تھوڑی دیر بعد ہم ایک دوسرے کی موجودگی کے عادی ہو گئے.. ہم دونوں نے سمجھوتہ کر لیا کہ ہم نے نہیں رہنا ہے.. لیکن اعتماد نہ کیا اور ایک دوسرے کو گھورتے رہے..

یہ بلی ہٹاؤں سے اور ہٹاؤں آکھیں جھپکے تقریباً تیس منٹ تک غار حرا کے ایک پتھر پر آرام کرتی رہی اور پھر جانے اُس کے جی میں کیا آئی.. اٹھی اور باہر نکل گئی..

اُس کے رخصت ہو جانے پر مجھے کچھ قلق ہوا کہ اُس نے میری تنہائی میں شرکت کی تھی.. ملاقات کی تھی.. اور وہ واحد رفیق تھی اُس شب تنہائی میں.. اُس کے ٹھہر جانے کا مجھے افسوس ہوا..

ویسے جس انداز میں وہ گئی تھی ناراض نہیں گئی تھی.. جان گئی تھی کہ یہ تو پل دوپل کا مہمان ہے اُٹھ کر چلا جائے گا.. میں پھر آ جاؤں گی.. اور مجھے دیکھ کر خواہش کرتا ہے کہ اگلے جنم میں میں اُس کے باپ کے گرو میاؤں میاؤں کر رہا ہوتا تو کچھ ایسا برا شخص نہیں ہے.. قدرے حواس باختہ ہے کہ بلی ہو جانا چاہتا ہے..

اُس کی رخصتی پر میں کچھ دیر حالت ملال میں رہا.. پھر اٹھا.. صبح میں جا کر دیوار سے پیچھے کھائی میں چھپا ہوا.. کہ وہ رفت شروع ہو گئی ہے.. کہیں وہ مکہ کے مار موٹ اور بندر وغیرہ بھی ادھر آنے کا قصد کر رہی ہیں..

ہر سو پچھپ تھی..

کوئی سرسراہٹ.. آہٹ کوئی موجودگی نہ تھی..

وقت آدمی رات کو ہو کر کے بہت آگے جا چکا تھا..

جبل ثور کی چوٹی کی چٹان کا سایہ گمن میں بچھ کر نصف سے زیادہ حصے پر سایہ دوہرا ہوا تھا.. اور لہار

پہلے کہاں دکھائی دیتا تھا اب اتنی تاریکی میں دکھائی دے جاتا..

کہاں میں گمن میں سے کچھ ٹکڑے نکل لوں..

ہے کہ مجھے دفن کرتے ہوئے وہ ڈرے۔ ٹشو پیپر سے چمٹے ہوئے چند ڈرے میرے چہرے کے قریب رکھ دیے جائیں۔ لیکن پڑھراج اور فاطمہ اقل خواہش یہ بھی ہے کہ یہ چینی نژاد جو گرو بھی میرے ڈسٹاروں سے چھو رہے ہوں جب مجھ پر مٹی ڈالی جائے۔

میں واپس آ گیا۔

دو نفل ادا کیے اور پھر تہمتی تھیلے پر سر رکھ کر لیٹ گیا۔

رات گزرتی جاتی تھی۔

اور مجھے یہ بھی قلق ہوا کہ یہ گزر جائے گی۔

آج، نہیں یہ تو کل کی بات ہے۔ کل شام کا قصہ ہے کہ مجھ میں یہ ڈر پھیلتا تھا کہ اس مقام پر

ساری کی ساری ایک پوری رات جو بہت ہی طویل ہوتی ہے کیسے گزرے گی۔

اور اب اس ڈر میں تھا کہ یہ تو گزر رہی ہے۔ گزر جائے گی۔

گزر گئی تو پھر کیا کروں گا۔ مجھے تو اور کوئی کام ہی نہیں آتا سوائے غار حرامیں رات گزارنے

کے۔

میں اسی آرزوگی میں اُلگھ گیا۔

پھر جانے رات کے کس پہرے آکھ کھل گئی۔

”الامین“ میں درج ہے کہ۔

”غار حرا کا مطلب ہے تلاش و جستجو کا غار

اور جبل نور کے معنی ہیں روشنی کا پہاڑ۔

پتھر کی بڑی بسلوں سے بنے اس غار کی لمبائی بارہ فٹ کے قریب ہے۔ اور چوڑائی چھ فٹ

ہے۔ اونچائی اتنی ہے کہ آدمی آسانی سے کھڑا ہو سکے۔ اندر صرف ایک آدمی کے نماز پڑھنے، ٹیبلے یا

اپنے کی گھٹائش ہے۔“

یہ ایسا ہی تھا۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے۔ اپنے قدم سے۔ کھڑے ہو کر۔ بیٹھ کر لیٹ کر یہ جان

لا تھا کہ لمبائی چوڑائی اور اونچائی اتنی ہی ہے جتنی کہ بیان کی گئی ہے۔ میرا پورا بدن وہ بیات تھا جس نے

اس غار کو اپنا گھر بنا لیا تھا۔ جہاں نے جہاں کی قسم اور اس جہاں کے ڈر سے میرے لباس پر ٹانگے ہوئے

تھے اور ہاں بے شک گن لطف سے زیادہ سائے میں آچکا تھا لیکن ہر شے پر چاندنی معلق تھی۔

اس شب کی یادگار کچھ تو ساتھ لے چلوں۔

جب میں اُس رات میں تھا تب بے شک میں آگاہ تھا کہ میں کہاں ہوں۔ ایک بار ہوں

اس حیات میں دوبارہ نہ ہوں گا لیکن اس کے باوجود کسی نشانی کو حاصل کرنے کی خواہش نہ ہوئی کہ جب تو

وہ سب کچھ میرا تھا۔ کوئی بھی اپنے گھر کی کوئی شے تو نہیں اٹھاتا کہ یادگار رہے۔ لیکن اب تقریباً ایک برس

بعد مجھے رہ رہ کر خیال آتا ہے کہ میں ایک دو کنکری چٹن لیتا۔ غار حرامیں تھا تو کسی بھی پتھر پر ضرب لگا کر

اُس کا ایک حصہ اپنے ہمراہ لے آتا۔ مجھے اب تھوڑا سا قلق ہوتا ہے کہ اس شب کی کوئی بھی نشانی میرے

پاس نہیں... ہاں ایک نشانی تو ہے جس کا تذکرہ بعد میں کروں گا۔

اُس نشانی کے سوا اور بھی بہت کچھ ہے۔

وہ کچھ جو میں اپنے ساتھ لے گیا تھا جو کچھ بھی نہ تھا۔ غار حرامیں ایک شب رہا تو میرے لیے

معتبر ہو گیا۔

وہ مصلے جو میری بہو نے مجھے دیا تھا جسے میں نے غار حرامیں بچھے پرانے مصلے پر بچھا یا تھا۔

وہ تسبیح جس کے دانے میں نے اُس رات متعدد بار اپنی پوروں سے چھو کر گرائے۔

اور سب سے بیش قیمت وہ جو گرز۔ جن کے تسمے نہیں تھے آسانی سے بجز جانے والے لالچ

تھے۔ بہت ہلکے اور سیاہ اور سفید رنگ کے۔ جو میرے پاؤں میں تھے جبل نور پر چڑھتے ہوئے۔ اور

جو غار حرا کے اندر ایک ہموار پتھر پر شب بھر پڑے رہے۔ اور جب کبھی میں غار سے نکلتا۔ صبح میں جا

تو ننگے پاؤں جاتا۔ البتہ اوپر چھت پر جاتا تو انہیں پہن کر۔ سوائے ان موقعوں کے وہ میرے ساتھ

غار حرامیں میرے رفیق رہے۔ وطن واپسی پر میں انہیں کبھی کبھار صبح کی سیر کے لیے استعمال میں لاتا

رہا۔ اور میری سیر کے ساتھی نہیں جانتے تھے کہ یہ ہلکے پھلکے چینی نژاد جو گرز کہاں سے ہو کے آئے

ہیں۔ ابھی چند روز پیشتر میں نے محسوس کیا کہ وہ شکستہ ہو رہے ہیں۔ جب میں گھاس پر قدم رکھتا ہوں

تو اُس پر سویر کی شبہم اُن میں سرایت کر کے میری جرابوں کو گیلنا کرتی ہے۔ اور ایک صبح میرے والی

پر میں نے غور کیا کہ وہ ادھر نے کو ہیں۔ ناکارہ ہونے کو ہیں تو میں نے انہیں پہننا موقوف کیا اور

بہشت کے لیے انہیں سنبھال لیا کہ وہ ایک قیمتی متاع بھی تھے اور ایک متاع غرور بھی تھے کہ میں ایک

شب غار حرامیں تھا۔

اب میں آپ کو ایک نہایت ہی عجیب و غریب اور شاید عوام الناس کے لیے ایک نئے مزاج

خواہش میں شریک کرنا چاہتا ہوں۔ اگرچہ میرے پاس سلوک کی مٹا کر وہ ایک ٹشو پیپر پر جمع شدہ اُس کی

یادداشتیں ہیں جو غار حرام کی کئی عکاسی کے لیے جو تقریبی وہاں کے ہیں اور میں نے سوچی رکھا

وہ بے ٹھکانہ ہو چلی تھی کہ فجر کی قربت میں تھی اور بے ٹھکانہ روشن رات تھی اور اس رات کا پچھلا پہر تھا اور میں تھا۔

”روشن رات کے پچھلے پہر غار حرا میں اچانک ایک آدمی کہیں سے نمودار ہو گیا۔“ پڑھئے۔“
اس آدمی نے حضورؐ سے کہا ”میں پڑھنا نہیں جانتا“ حضورؐ نے کہا

میں خالص علمی جستجو کرنے کے لیے مناسب ذہانت نہیں رکھتا اسی لیے میں جب بھی اس ”پڑھ“ پر غور کرتا تو شش و پنج میں پڑ جاتا۔ مجھے یہ سوال سنا تا کہ رب کعبہ خوب جانتا تھا کہ اس کا محمدؐ آدمی ہے۔ دنیاوی معنوں میں پڑھنا یا لکھنا نہیں جانتا تو کیوں حکم دیا گیا کہ ”اقراء“۔ پڑھو۔
کیا اس شخص نے.. جو بعد میں کھلا کہ جبریل علیہ السلام تھے میرے بابا کے سامنے کوئی لوح رکھی جس پر کچھ درج تھا کہ اسے پڑھ.. یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ پڑھ نہیں سکتے تو کیوں کہا کہ.. پڑھ! اگر لوح نہ تھی تو انہوں نے یہ کیوں نہ کہا کہ.. ”دوہرا.. جو میں کہتا ہوں“ اور ہا ہا دوہرا دیتے۔ لیکن جب وہ اقرار کرتے ہیں کہ میں پڑھ نہیں سکتا تو ان کے سامنے پڑھنے والی کوئی نہ کوئی شے تو ہوگی۔

البتہ نیکل کی ”حیات محمدؐ“ میں سے مجھے یہ سراغ مل گیا۔

”نزل وحی کی مبارک ساعت آ ہی گئی.. آنحضرتؐ غار حرا میں محو خواب تھے۔“

تو یہاں بھی دو روایتیں ہیں۔

ایک تو یہ کہ حضرت جبریلؑ کا نزول بیداری کے اوقات میں ہوا۔

اور دوسری یہ کہ آنحضرتؐ محو خواب تھے۔

نیکل لکھتے ہیں۔

”ایک فرشتہ جس کے ہاتھ میں لکھا ہوا ایک ورق تھا اور اس نے رویا.. خواب میں ہی یہ ورق

آپؐ کے سامنے کھول کر کہا ”اقراء“۔ آپؐ گھبرا گئے اور فرمایا ”ما اقرأ“ (میں اس میں کیا پڑھوں)
آنحضرتؐ نے محسوس کیا کہ فرشتے نے آپؐ سے زور کے ساتھ معائنہ کرتے ہوئے پھر اقرأ (اسے

روشن ذروں کا غبار ہر شے کی ہیئت بدلتا تھا۔

”رات کے وقت جب چاند کی روشنی کوہ و دمن پر پھیل جاتی تو حضورؐ غار کی تنہائی میں اور فضا کی خاموشی میں اسی شگاف میں سے اللہ کے گھر کو دیکھتے“

ہاں.. میں شہادت دیتا ہوں کہ چاند کی روشنی کوہ و دمن پر پھیلی ہوتی تھی جیسے کہ وہ میری نظروں کے سامنے اب بھی پھیلی ہوئی تھی.. البتہ زمانوں کے تغیر نے پتھروں کی ریلوں کو ذرا سرکا دیا ہے اور اس شگاف سے اللہ کا گھر آسانی سے نظر نہیں آتا۔

”رمضان کا چاند نظر آیا تو حضورؐ غار حرا کی جانب چل دیئے.. اہل خانہ بھی آپؐ کے ہمراہ ہو گئے.. سیدہ خدیجہؓ بھی بچوں اور خدام کے ساتھ حضورؐ کے ہمراہ ہو جاتیں اور پہاڑ کے پاس کھلے میدان میں خیمہ زن ہو جاتیں اور حضورؐ جبل نور کی بلندی پر چڑھ کر غار میں اتر جاتے“

ان دنوں تو جبل نور کے دامن میں ویرانے اور صحرا تھے.. تو اماں خدیجہؓ شاید اس پر سٹور کے آس پاس خیمہ زن ہوتی تھیں جہاں سے میں نے دودھ اور پانی کی بوتلیں خریدی تھیں۔

”ماہ رمضان کے دو عشرے گزر چکے تھے.. چاند اب پوری رات کا نہیں ہوتا تھا۔“

اور آج چاند کی بارہویں تھی.. چودھویں کے بعد پانچ چھ روز کے بعد چاند نے پوری رات کا نہیں ہونا تھا.. تقریباً ایسا ہی ہوتا تھا جیسا آج کی شب تھا.. شاید اس سے کچھ زیادہ مدہم لیکن تقریباً ایسا ہی.. جیسا آج کی رات میں ہے اور میں اس رات میں ہوں۔

”چاند کچھ تاخیر سے نکلنے لگا تھا لیکن جب طلوع ہوتا تھا تو کوہ و دمن اس کی ٹھنڈی روشنی سے چمک اٹھتے.. ایسی ہی ایک ٹھنڈی اور روشن رات کے پچھلے پہر۔“

بے شک میں ان ملائمتوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا.. انہیں محسوس کر رہا تھا.. چاند کی گزرگاہ اور روشنی تقریباً انہی زاویوں پر تھی اگرچہ ماہ رمضان نہ تھا ماہ شعبان تھا اور رات ٹھنڈی نہ تھی

اماں نے انہیں ایک کبل میں پیٹ دیا اور یہی وہ کالی کملی تھی جس کے عشق میں کل جہان کھلا ہو گیا۔ اور پھر اپنے عزیز ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں جو عیسائی تھے اور بائبل کا ترجمہ عبرانی زبان میں کر رہے تھے۔ جنہوں نے گواہی دی کہ یہ جبریل امین تھے اور بابا کو آخری پیغامبر کی کا پیغام دیا تھا۔

چنانچہ حضورؐ کی وحی کی تصدیق سب سے اول اماں خدیجہؓ نے کی اور پھر ایک عیسائی ورقہ بن نوفل نے۔

ہیکل لکھتے ہیں۔

ایک روز حضورؐ چلے جا رہے تھے کہ آسمان کی طرف سے آواز آئی۔ وہی فرشتہ تھا جو غار حرا میں آپؐ کے پاس آیا تھا۔ حضورؐ پر لرزہ طاری ہو گیا۔ گھر آئے اور اماں خدیجہؓ سے کہا: ”مجھے چادر اوڑھا دو۔“

آپؐ لیٹ گئے۔

سیدہ خدیجہؓ نے فوراً چادر اوڑھا دی تو وحی نازل ہونے لگی۔

”اے چادر اوڑھ کر لیٹنے والے۔“

اٹھئے اور خبردار کیجئے۔

اپنے رب کی بڑائی کا اعلان کیجئے۔

اپنا لباس پاک رکھئے۔

اور گندگی سے دور رہئے۔

اور اپنے رب کے لیے صبر کیجئے (سورہ مدثر)

ہشام ”سیرت النبی کامل“ میں اس رات کو یوں بیان کرتے ہیں۔

”رسول اللہؐ رمضان کے مہینے میں حرا کی جانب نکلے۔ آپؐ کے ساتھ آپؐ کی اہلیہ بھی

تھیں۔“

ہشام کے مطابق اماں خدیجہؓ بھی غار حرا میں آپؐ کے ساتھ عبادت میں شریک ہوتی تھیں

لیکن جس شب وحی کا آغاز ہوا ساتھ نہ تھیں۔

پڑھئے) کہا اور آپؐ نے پھر وحی جواب دیا ”ما اقراء“۔ فرشتے نے دوسری مرتبہ پھر اسی زور سے معائنہ کرنے کے بعد ورق سامنے رکھ کر ”اقراء“ کہا۔ اس مرتبہ آپؐ ڈر گئے مبادا پھر معائنہ کی تکلیف سے دوچار ہونا پڑے لیکن وحی فرمایا کہ ”ماذا اقراء“ (میں اس میں کیا پڑھوں۔) فرشتے نے کہا۔

”اقراء باسم ربك الذي خلق ۝ خلق الانسان من علق ۝ اقراء و ربك الاكرم الذي علم بالقلم ۝ علم الانسان ما لم يعلم ۝“

”پڑھئے اپنے رب پیدا کرنے والے کا نام لے کر جس نے انسان کو ”جئے ہوئے لبو“ سے پیدا کیا“ ہاں پڑھئے کہ آپؐ کا پروردگار صاحب کرم ہے جس نے قلم کے ذریعے انسان کو ایسا علم سکھایا جسے وہ پہلے سے نہ جانتا تھا۔“

تو بابا کو ایک لوح نہیں ایک ورق دکھایا گیا کہ یہ پڑھ۔

تو یہ کتنی سلجھ گئی۔ کہ پڑھنے کے لیے سامنے کچھ رکھا گیا تھا۔ بیداری میں یا عالم خواب میں۔

اور قلم کے ذریعے انسان کو ایسا علم سکھایا جسے وہ پہلے سے نہ جانتا تھا۔

میں نے شاید پہلے تذکرہ نہیں کیا کہ اپنے تہمتی تھیلے میں سامان رکھتے ہوئے جس شے کو

لرزتے ہوئے ہاتھوں سے اندر رکھا تھا وہ ایک قلم ایک بال پوائنٹ تھا کیونکہ میں اس آیت سے آگاہ تھا

اور جانتا تھا کہ وہاں قلم کے ذریعے انسان کو علم سکھایا جاتا ہے۔ اس میں خود غرضی بھی شامل تھی کہ شاید

بال پوائنٹ غار حرا میں ایک رات بسر کر کے اس قابل ہو جائے کہ اس کی روشنائی میں سے بھی پہلی بار کچھ

علم نکلے۔ اظہار اور بیان کا کوئی ایسا درکھل جائے جواب تک مجھ تا تو اس سے کب کھلتا تھا۔

زندگی کی چالیسویں منزل تھی جب وہ شخص ظاہر ہوا اور وہ نہ جانتے تھے کہ وہ کون ہے۔

وہ اتنے ڈر گئے کہ اس بوجھ سے نجات حاصل کر لینے کے لیے اپنی جان کو بھی منقطع کر کے

کے بارے میں خیال آیا۔

اپنے گھر لوٹے۔ اہلیہ خدیجہؓ سے کہا ”مجھے جلدی کپڑا اوڑھا دیا جائے“

بدن میں کچھ تھی جیسے بخار آ گیا ہوا۔

کہیں یہ درج ہے کہ گھر لوٹے اور کہیں یہ روایت ہے کہ جبل نور کے دامن میں مقیم اماں

خدیجہؓ کے گھنے میں پہنچے۔ قرین از قیاس تو یہی لگتا ہے کہ وہ ان کے ہمراہ گئی تھیں اور پہاڑ کے دامن میں

خیمہ لگا دیا تھا۔

UrduPhoto.com

لیتے۔ تو میں آسمان نہ ہوتا تھا۔ اور پھر بھی میں کیسی ڈھنائی سے اُنہی موسموں میں۔ چاند کی تقریباً اُنہی راتوں میں۔ اُنہی ہواؤں کی زد میں جو رات کے اس پہر خاموشی سے میرے بدن کو چھوتی ہیں اور کبھی ان کے زخموں سے مس ہوتی تھیں میں اُسی جگہ پر بیٹھا تھا۔ جہاں صرف ایک آدمی بیٹھ سکتا ہے یا لیٹ سکتا ہے۔ تو میں وہی آدمی تھا۔ تو آپ کو یقین کرنا ہوگا کہ اُس شب میں پہلی بار مجھے اس بے ادبی کا احساس ہوا۔ میں جو اپنے نصیب پر نازاں یہ رات گزارتا تھا پہلی بار میں نے اسے نصیب نہ جانا۔ انتہائی بدتمیزی اور بے ادبی جانا اور اپنے آپ کو مطمئن کیا کہ یہاں کیوں آئے تھے۔ آئے تھے تو وہ لعل ادا کر کے چلے جاتے۔ یہاں کیوں بیٹھے رہے تھے۔ اُنہی موسموں میں اُسی نشست پر کیوں بیٹھے رہے تھے۔ آگ لینے آئے تھے اور گھر کے مالک بن بیٹھے۔ اور کس ڈھنائی سے بیٹھے ہو۔ کبھی مجھے احساس ہوتا کہ میں بھی ایک رویا میں ہو۔ ایک خواب میں ہوں۔ یہ غار یہ گمن اور یہ آڑے ترچھے ایک دوسرے سے جوئے ہوئے پتھر دراصل میرے ذہن کا کرشمہ ہیں۔ میں نے اپنے تصور میں انہیں تخلیق کیا ہے۔ یہ سب کچھ اصل نہیں ہو سکتا۔ اصل ہے تو میں یہاں نہیں ہو سکتا۔ اگر میں یہاں ہوں تو یقیناً خواب میں ہوں۔

ویسے یہ سب ہے کیا۔ پتھر ہیں۔ معمولی پتھر اور ان میں پوشیدہ ایک عام سی کھوہ۔ یہ تو کچھ وقعت نہیں رکھتے۔ ان کی کوئی حیثیت نہیں۔ ان میں رات گزارنا کوئی معنی نہیں رکھتا کہ ان میں تو ایک لمبی بھی رات گزار سکتی ہے۔ بندر بھی ادھر آ نکلتے ہیں۔ تو ان معمولی پتھروں کے درمیان جس ہستی نے گمان و حیان میں گمن اپنے آپ کو فراموش کیا تو وہ ہے جو ان پتھروں میں جان بھرتی ہے۔ انہیں زندہ کرتی ہے۔

ایسے ان پتھروں کو زندہ کرتی ہے کہ انہیں پوچھنے کو جی چاہے۔

ان کے صنم تراشنے کو دل کرے۔

اور پھر ہر صنم بولے۔ خود بخود کلام کرے۔ اقراء کہتا چلا جائے۔

میں نے تو اک عمر پتھروں سے عشق کیا ہے۔ ان کے جنون میں رُسا ہوا ہوں اور جانتا ہوں کہ ان پتھروں سے کہیں زیادہ متاثر کرنے والے۔ شان اور جلال والے پتھر دنیا میں بہت ہیں۔ اس کھوہ کی نسبت دنیا کے بلند ترین پہاڑوں کے دامنوں میں پوشیدہ ہزاروں غاریں ہیں جو حیرت کی وادیاں ہیں۔ تو اگر میں وصال کے لیے بے قرار تھا اور شدت کی تمنا رکھتا تھا تو بے قراری اور تمنا ان معمولی پتھروں اور کھوہ کے لیے تو نہیں تھی۔ اُن کے لیے تھی۔ دراصل یہ ایک وسیلہ تھے اُن سے وصال کر لے گا۔ اُن کے قریب ہونے کا۔ صرف اس لیے بھی نہیں کہ اُن نے ہزاروں ان پتھروں کے درمیان سانس لیے۔ وقت

ہشام اس کے بعد براہِ راست رسول اللہ کا بیان درج کرتے ہیں۔ اُنہوں نے فرمایا ”میرے پاس جبریل اُس وقت آئے جب میں سو رہا تھا۔ اور ایک ریشمی کپڑا لائے جس پر کچھ لکھا ہوا تھا پھر کہا ”پڑھئے۔“ میں نے کہا ”میں پڑھتا نہیں (مجھے پڑھنا نہیں آتا)۔“

مارٹن لنگز ابو بکر سراج الدین کہتے ہیں کہ حضورؐ نے اس پہلی آیت کے بارے میں کہا ”یوں لگتا تھا جیسے یہ حرف میرے دل پر کندہ ہو گئے ہیں“

عبداللہ یوسف علی قرآن کا جس انداز میں انگریزی میں ترجمہ اور تفسیر کرتے ہیں۔ ایسے کرتے ہیں کہ اس ترجمے پر بھی ایک الہامی کتاب کا شبہ ہونے لگتا ہے۔ اور وہ ”اقراء“ کا ترجمہ READ کے علاوہ PROCLAIM بھی کرتے ہیں۔ یعنی ”اعلان کرو“۔ اور یوں حرف ”پڑھ“ سے جو سوالات ذہن میں جنم لیتے ہیں وہ ”اعلان کرو“ سے واضح طور پر مل ہو جاتے ہیں۔

وہ کہتے ہیں ””اقراء“ کا مطلب ”پڑھ“ بھی ہو سکتا ہے یا ”زبانی پڑھنا۔ زبانی ادا کرنا۔ یا دوبارہ کہنا۔ دوہرانا۔ دوبارہ سنانا“ بھی ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ”اعلان کرنا۔ مشتہر کرنا“ بھی اس کا ترجمہ ہو سکتا ہے۔

چنانچہ ”اقراء“۔۔۔ پڑھ۔۔۔ زبانی پڑھ۔۔۔ زبانی ادا کرو۔۔۔ دوبارہ کہو۔۔۔ دوہراؤ۔۔۔ دوبارہ سناؤ۔ اعلان کرو۔۔۔ مشتہر کرو۔۔۔

یہ رات۔۔۔ غار حرا کی تنہائی میں یہ رات تقریباً اُسی احساس۔ شکل و شہادت اور مدہم چاندنی کی رات تھی۔ گئی رات تھی۔ جب چودہ سو برس کی ایک رات۔ ایسی ہی مدہم چاندنی کی گئی رات میں۔ جب چاند بھی اسی کیفیت میں تھا۔ یہی پتھر تھے۔ یہی گمن تھا۔

اور جہاں میں تھا۔ یہیں عین اسی جگہ پر بابا تھے۔ بیدار تھے یا خواب میں تھے جب کہا گیا کہ۔۔۔ پڑھ!

اور میں۔۔۔ اُس اُنہی کی اُس کے ہاتھوں کی کاغذی ہوئی پیوند زدہ چپلوں تلے جوڑی آتی تھی اُس کا بھی ایک ذرہ نہ ہو سکتا تھا۔ میں تو شخص اُس کی ذہنی قسمی کے پیچھے پیچھے چلنے والا اُس کی یلگنیاں سہیلے والا تھا جس کی جانب جتنا بھی مڑ کر بھی نہ دیکھتا تھا۔ تو مجھے پہچان نہ سکتے تھے۔ اگر کبھی مڑ کر دیکھ

بہت دیر میں سویرے میں بیدار ہوتے تھے تو اس لمحے ہوا کس رخ سے پہلو بدلتی ہوئی آتی تھی اور ان کے گوشوں کو چھوٹی تھی۔ رات کو جب پڑاؤ کرتے تھے تو اوپر آسمان کیسا ہوتا تھا۔ صرف یہ محسوس کرنے اور دیکھنے کی خاطر انہوں نے انہی موسموں میں انہی راستوں پر یہ سفر اختیار کرنے کی سعی کی جن میں بابا نے اپنے بار بار کے ہمراہ یہ سفر اختیار کیا۔ انہوں نے ہجرت کا پورا راستہ تو طے نہ کیا صرف ایک دوروز کے لیے مدینے کی جانب اسی راستے پر چلنے کی اجازت ملی اور وہ چلے۔ اور جب کبھی وہ اس سفر کا قصہ سناتے اور کہتے... مستنصر جب میں نے تقریباً اسی مقام پر رات کا پڑاؤ کیا جہاں میرے حضور نے کیا۔ اور پھر اگلی سویرے بیدار ہوا تو اپنے گالوں پر ایک ہلکی ٹھنڈک والی ہوا بکھرتی محسوس کی اور یکدم مجھے احساس ہوا کہ حضور کے چہرے کو بھی اسی ہوائے... ایسی ہی سویرے میں مس کیا تھا تو مستنصر اس کے آگے وہ بیان نہ کر پاتے۔ ان کے سپید گالوں پر آنسوؤں کے دھارے بہنے لگتے اور وہ مسکرانے لگتے۔

غار حرا میں رات بسر کرنے کے لیے میں اتنی بار کیوں میں نہ گیا تھا۔ اتنا حساب کتاب نہیں کیا تھا۔ کہ جب پہلی وحی نازل ہوئی تو ذیقعد کی سترہ تاریخ تھی تو مجھے یہاں اسی تاریخ کو قیام کرنا چاہیے۔ موسم کا حساب کرنا چاہیے کہ ان زمانوں میں اس تاریخ کو آب و ہوا کیسی تھی۔ تعین تو ممکن تھا لیکن میں اتنی تفصیل میں چلا جاتا تو شاید جبل نور پر نہ پہنچ پاتا۔

لیکن ہوتا تعین کیے۔ میں ایک ایسی رات میں یہاں تھا۔ جو شب اقراء کے آس پاس تھی۔ جب سترہ ذیقعد تھی اور آج شعبان کی بارہویں تھی۔ یعنی تب چودھویں کے پورے چاند کو تین راتیں گزر چکی تھیں اور آج ابھی وہ دوراتوں کے فاصلے پر تھا۔ چنانچہ چاند اسی زاویے سے جبل نور کے پہلو میں سے نمودار ہوا تھا اور اس کا سفر جو غار کے اندر روشن دھنوں کی آہستہ آہستہ سرکاہٹ سے طے ہو رہا تھا تقریباً اسی راستے پر تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ موسم بھی ہو بہو دیا ہی ہو۔

تب بھی رات اتنی ہی گزر چکی تھی۔ یہی پہر تھا۔ تو رات کے اس پہر۔ ذہلی چاندنی میں۔ جبل نور کی گھاٹی سے لگ کر اوپر صحن میں آ جانے والا کوئی جھونکا جب غار کے اندر ہولے سے آ جاتا تھا اور میرے بدن کو چھو لیتا تھا۔ تو یہ جھونکا بھی وہی تھا جسے بابا نے رات کے اسی پہر اسی انداز میں اپنے چہرے پر محسوس کیا تھا۔ اور شاید یہی لمحہ ہے جب غار میں ایک شخص نمودار ہوا۔

کیا یہی لمحہ ہے؟ میں نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ یاد وہ گزر چکا ہے۔ یاد وہ آنے والا ہے۔ اگر یہی لمحہ ہے تو میں اسے کیسے محسوس کر کے گرفت میں لے لوں۔ وہ آواز تصور کروں کہ کیسی تھی۔ گہری تھی یا تار تھی یا سرگوشی تھی۔ وہ بولتا تھا کچھ اور تھی کہ ایک انسان کی نہیں ایک فرشتے کی تھی۔ جو آواز

اور زمانہ کچھ اہم نہیں ہے۔ اگر بابا ان پتھروں کے درمیان ایک سانس بھی لیتے۔ تب بھی میں اسی چاہت اور جنون سے یہاں آتا۔

تو یہی کوہ و دمن کو روشن کرنے والی چاندنی تھی۔

غار حرا کے صحن میں جیسے وہ اب اتر رہی تھی ویسے ہی انہی زاویوں پر اس شب اتر رہی تھی جب اقراء کا حکم سنائی دیا تھا۔

اور غار کے شکافوں میں سے ہوا کا چلن شب گزرنے سے زیادہ ہو چلا تھا۔ تو ان میں سے جو خفیف سا جھونکا در آتا اور میرے بدن پر اپنے آپ کو بکھیر دیتا تو یہ اسی انداز میں میرے نبی کے بدن پر بکھرتا تھا۔ چاندنی کے جزیرے جو فرش سے اٹھ چکے تھے اور اب غار کی دیواروں کے روشن جھومر ہوتے تھے اس شب بھی انہی جگہوں پر بکھیرے ہوئے تھے۔

صحن کی جانب سے جو ہلکی آہستہ خرام ہوا آتی تھی اس میں ٹھنڈک تھی اور اس شب بھی اس کا یہی چلن ہوگا۔

مجھ پر۔ جہاں بابا بیٹھتے تھے۔ وہیں بیٹھے ہونے کا۔ جو ہوائیں جس انداز میں شب کے اس پہر بابا کے بدن کو مس کرتی تھیں انہی ہواؤں کو اپنے بدن کو چھوتے جانے کا۔ چاندنی کے جزیروں کا۔ باہر صحن کے منظر کا۔ اندر غار کی تاریکی کا۔ اور اقراء کے اترنے کا ایک ہیجان طاری تھا۔

ایسا ہیجان کہ مجھے ڈر لگتا تھا۔ کہ جبریل امین تو اس کھوہ میں اترنے کے عادی ہیں تو کہیں بھولے ہوئے پھر نہ ادھر آ لگیں... اپنے محبوب کی یاد میں ادھر نہ آ جائیں۔ آگے تو پھر میں کیا کروں گا۔

آگے تو مجھے دیکھ کر وہ کیا کہیں گے۔ کیا کریں گے۔ مجھے اسی مقام پر بیٹھا ہوا دیکھ کر پسند تو نہیں کریں گے کہ اس کی اپنے ہاتھوں سے گانٹھی ہوئی پیوند زدہ جوتیوں تلے آنے والا ایک ذرا یہاں کیوں آن بیٹھا ہے۔ کہیں مجھ سے معاف نہ کریں۔ کہ میں تو ایسا پتھر تھا جو ان کے معافنے کے باوجود پتھر ہی رہتا۔

مجھے ہر آہستہ سے ڈر لگتا تھا کہ کہیں وہ آ ہی نہ جائیں۔

عجب اضطراب تھا۔ ڈر تھا۔

مجھے صلاح اللہ بن محمود یاد آ گئے۔ وہ صرف اس لیے مکہ سے مدینہ تک اونٹ پر سفر کرنا چاہتے تھے اور انہی راستوں پر کرنا چاہتے تھے جن راستوں پر قصویٰ کے نمونوں کے نشان ثبت ہوئے تھے۔ کہ ہجرت کے دوران میں اور پھر ان کے بعد ان کے گزرنے۔ وہ راتیں کسے بسر ہوئیں۔ کسے

"پڑھئے... اپنے رب... پیدا کرنے والے کے نام پر..."

جبل نور کے تقریباً ہر پتھر پر... ہر چٹان کے ماتھے پر یہاں تک کہ غار حرا کے اندر جو دیواری چٹانیں تھیں ان پر بھی یہ آیت کا رو باری حضرات نے سرخ پینٹ سے تھوپی ہوئی تھی اور میری نظر جب اس تک جاتی تھی میں اسے پڑھتا تھا تو مجھے کچھ نہ ہوتا تھا... مجھے پڑا نہ کرتی تھی... صد شکر کہ اس تاریکی میں وہ اوجھل ہو چکی تھی... لیکن اب وہ میری شریانوں میں تیرتے لمحے کی کشتی کے بادبانوں پر درج تھی اور اس کی اثر اندازی کی کوئی مثال نہ تھی...

اُس لمحے کو... اگر وہ بیت چکا تھا تب بھی... اور اگر وہ موجود میں تھا تب بھی اور اگر اُس نے ابھی نزل ہونا تھا تب بھی کائناتوں پر محیط کر دینے میں کچھ کمال چاندنی کے جزیروں کا بھی تھا... وہی موسم... رات کا وہی پہر اور چاندنی کے دھبے بھی یقیناً غار کے انہی پتھروں پر... انہی سلوں اور چٹانوں پر... اُن میں سے ایک دھبہ ایسا تھا اور میں اُس کی موجودگی کا احساس نہ کر سکا تھا جو ابھی تک فرش پر تھا... میں کروٹ بدلتا تو وہ میری دائیں پسلی پر آ ٹھہرتا اور بابا اس لمحے... یعنی اُس لمحے اس انداز میں غار کے صحن کی جانب پہرہ کیے لیٹے ہوں گے... یونہی سگریزوں پر تو نہیں شاید اپنی کھد کی چادر پہ... کالی کملی پر... یا شاید اماں خدیجہؓ نے انہیں غار کے فرش پر بچھانے کے لیے اونٹ کے سیاہ بالوں سے بنا ہوا کوئی گھیس دیا ہو... وہ لیٹے ہوں گے تو رات کے اس پہر... چاند کی اسی منزل میں بابا کے وجود پر بھی یہی چاندنی میں نہایا ہوا ایک دھبہ ٹھہرا ہوگا جو میری دائیں پسلی پر رکھا ہوا تھا...

یہی دھبہ... جو بابا کے بدن پر تھا... اُس لمحے مجھ پر تھا... اور اس دھبے کو میرا شکر گزار ہونا چاہیے تھا کہ وہ میرے بدن پر واضح اور روشن دکھائی دیتا تھا... بے شک وہ اپنے آپ کو کوستا ہوگا کہ چودہ سو برس پیشتر میں کس بدن پر تھا اور آج میں کیسا سیاہ بخت ہو گیا ہوں...

اُس دھبے کو میرا شکر گزار اس لیے ہونا چاہیے تھا کہ تب وہ میرے بابا کے نور بدن پر اُترا ہوگا تو کہاں دکھائی دیتا ہوگا... وہاں روشنی اتنی تھی کہ اُس میں بجھ گیا ہوگا... یہ میرا احسان تھا کہ میں نے اُسے اپنے بدن کی گناہوں بھری سیاہ چادر مہیا کی جس کی مکمل سیاہی کے پس منظر میں وہ نمایاں ہو گیا... میں اس دھبے سے واقف ہونا چاہتا تھا...

جیسے لوگ اپنی ملکیت کے نویشوں کو گرم لہجے سے دانت دیتے ہیں تاکہ جو کوئی بھی اُس

کبھی کانوں میں نہ اُتری ہو اُسے تو بیان نہیں کیا جاسکتا... اگر وہ لہجہ گزر چکا ہے تو کیا مجھے بھی کسی تہذیبی سے دوچار کر گیا ہے اور اگر آنے والا ہے تو میں اُس کے لیے اپنے آپ کو کیسے تیار کروں...

تو ایک کم علم کے علاوہ کم فہم والا انسان ایسی صورت میں کیا محسوس کر سکتا ہے... بس ایک مسلسل اضطراب... ایک بے چین کیفیت لیکن گجراہٹ سے عاری... ایک اضطراب بھرا اطمینان بھی کہ میں کیسے تجربے میں سے گزرنے والا اچھے نصیب والا شخص ہوں... اگرچہ میں اس کا اہل نہیں ہوں... میں تو یونہی ایک صبح شہر میں داخل ہونے والا فقیر تھا جس کے سر پر حرا کا تاج رکھ دیا گیا...

اور پھر ایک غم... ایک گہرا غم کہ وقت یہاں ٹھہرے گا نہیں گزر جائے گا... یہ لمحے گزرتے جاتے ہیں تو میں کیسے ان لمحوں کے گرد لپٹ جاؤں ان کے پاؤں پر سر رکھ دوں ان کو بوسے دوں ان کی قدر کیسے کروں... کیا کروں...

میں اس دوران... رات کے اُس پہر... اپنے آپ سے کچھ کلام نہ کرتا تھا... ذہن کے کینوس پر کوئی تصویر پینٹ نہ کرتا تھا... جان بوجھ کر یہ خیال کرنے سے اجتناب کرتا تھا کہ دیکھو تار و تم انہی لمحوں میں غار حرا کے اندر سانس لیتے ہو جب چاندنی کی اسی بجھی ہوئی کیفیت میں... جب کہ صحن کے اوپر علق جبل نور کی چوٹی تک پہنچتی چٹان کا سایہ بس اُسی طور صحن میں آگے ہو رہا ہے... جو تم دیکھ رہے ہو یہی منظر تمہارے بابا کی آنکھیں دیکھتی تھیں... اُس بیداری میں یا اُس خواب میں اُترنے سے پیشتر جس میں اقراء کا ورق اُن کے سامنے لایا گیا تھا... نہیں... یہ سب کچھ تو میں اب تحریر میں لا رہا ہوں اُس پہر میں نے کوئی تصویر نہ بنائی نہ اپنے آپ سے کچھ کلام کیا... اگر میں ایسا کرتا یہ سب کچھ تصور میں لاتا تو میں برداشت نہ کر پاتا... ہرگز سہہ نہ سکتا... میرا کلیجہ پھٹ جاتا بھلا جس کیفیت کو میرے بابا بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے میں اگر محض اُس کا تصور کرتا تو دیوانہ ہو جاتا... حرا کے پتھروں سے سر پھوڑنے لگتا...

بے شک میں کوئی تصویر نہ بناتا تھا... اُس اقراء کے لمحے کو جان بوجھ کر تصور میں نہ لاتا تھا... اپنے آپ سے یہ نہیں کہتا تھا کہ تار و سوچو... محسوس کرو کہ تم کہاں ہو اور کس لمحے میں ہو... یہ کہنے سے اجتناب کرتا تھا اور اس کے باوجود وہ لہجہ میرے بدن کی ہر شریان میں تیرتا تھا... ایک ایسی بادبانی کشتی کی مانند تیرتا تھا جو گہرے سمندروں میں راستہ بھول چکی ہو اور پھر ایک سویرا بھرتے سورج کی پہلی زرد کرنوں میں آکر ایسے روشن ہو جائے جیسے نور سے تخلیق کی گئی ہو... اُسے راستہ نظر آجائے... وہ خود بخود بادبانوں کے بغیر چڑھ چلائے بغیر تیرنے لگے اُس راستے کی جانب... جیسے غار کے آخر میں واقع شکاف میں سے سرائت کرتی ہو امیرے بدن میں تیرتی تھی... جیسے چاندنی کے دھبے میرے بدن کو دھسنے رہے تھے... وہ

لہجہ بھی واقف تھا... اور میری شکر گز کی قربت میں اُترتا تھا...

میرے حواس کسی حد تک بحال ہوئے تو پھر غار کے اندر لوٹ آیا۔

پڑھنے کا حکم آچکا تھا اس لیے میں نے تعمیل کی۔ اور کعبے کی جانب رخ کر کے پڑھا۔ بہت کچھ پڑھا۔ اور پھر اپنے مصلے پر تفتی تھیلے پر سر رکھ کر لیٹ گیا۔ تھکاوٹ بہت نمایاں ہو رہی تھی۔ میری شریاٹوں میں جو نور کی کشتیاں رواں تھیں شہ رگ کی قربت میں چاندنی کا جو دھبہ دھڑکتا تھا ان کے اظہار نے مجھے تھکا دیا تھا۔ میرا بدن تو آرام کا طالب تھا لیکن آنکھیں بند ہونے سے کتراتیں تھیں۔ وہ مسلسل دیکھنا چاہتی تھیں۔ ان لمحوں کے بیش قیمت ہونے سے آگاہ تھیں جانتی تھیں کہ یہ دوبارہ دیکھنے کو نہیں ملے گا۔ ان میں تھکاوٹ تو تھی میند نہ تھی۔

شاید میں سو گیا۔

شاید میں سویا۔ شاید نہیں۔

شاید میں ایک اونگھ میں تھا۔ سوتا جاگتا تھا۔ پہلو بدلتا تو میرا رخسار اس پتھر ملی سطح پر جا لگتا جس کے ساتھ فیک لگا کر مجھے آرام ملتا تھا۔

پھر میں سیدھا ہو کر لیٹ گیا۔

مجھے اندازہ نہیں۔ نہ میں قیاس کر سکتا ہوں کہ اس سونے جاگنے میں کتنی گھڑیاں بیت گئیں۔

نہ میں سوتا تھا۔ نہ جاگتا تھا۔

نہ غفلت میں تھا اور نہ آگاہ تھا۔

نہ ہوش میں تھا اور نہ بے ہوش تھا۔

میں خود بھی نہ تھا اور کوئی اور بھی نہ تھا۔

میرا چہرہ بھی نہ تھا اور کوئی غیر بھی نہ تھا۔

اس ہونے اور نہ ہونے کی کیفیت میں کچھ اور وقت گزر گیا۔

مجھے سونا نہیں چاہیے۔ یہ لمحے سونے کے لیے نہیں۔ انہیں ضائع نہیں کرنا۔ دیکھنا ہے۔ محسوس

کرنا ہے۔ کچھ نہ کچھ کرتے رہو۔

میں سیدھا لیٹا ہوا تھا اور میرا چہرہ چھت کو ٹکاتا تھا۔ ہایاں ہاتھ اٹھاتا تھا تو وہ غلام میں رہتا تھا۔

سنگ مرمر کی سطحوں کے آگے جو دیوار تھی وہاں تک تو نہ پہنچتا تھا تو بیکار تھا اس لیے میں نے ہایاں ہاتھ

چھت کر سر اور تفتی تھیلے کے درمیان رکھ لیا۔ اور دایاں ہاتھ۔ یہ کار آمد تھا۔ میرے بدن کا پورا دایاں حصہ

پتھر ملی دیوار کے ساتھ لگا تھا اور دیوار میرے بدن کے ساتھ لگی تھی کہ ایٹلے سے یہی حالت ظہور میں آتی

تھی تو میں نے اپنا دایاں ہاتھ اٹھایا۔ سیدھا کیا اور قطعی محسوس کر چنانچہ پھر نے لگا۔ بائیں اس کی

نشان کو ثبت دیکھے تو جان جائے کہ ان کا مالک کون ہے۔ ایسے اگر چاندنی کا یہ دھبہ سنگ مرمر سے بدن کو داغ دے۔ بے شک اذیت ہوگی ماس کے جلنے کی لیکن بعد میں جو کوئی بھی اس نشان کو دیکھے گا اسے فوری طور پر علم ہو جائے گا میں کس کی ملکیت میں ہوں۔ میں کس کا غلام ہوں۔ جس نے مجھے اپنے گھر لایا کر چاندنی سے داغ دیا تھا۔ بے شک میری بائیں پسلی کے قریب کوئی نشان نہیں۔ یعنی کسی اور کو دکھائی نہیں دیتا۔ لیکن ہے۔ میں اب بھی اُسے وہیں پاتا ہوں جہاں وہ اُس رات غار حرام میں تھا۔

کئی لوگ پوچھتے ہیں جاننا چاہتے ہیں کہ کیا میں سفر محض اس لیے اختیار کرتا ہوں کہ والہی پر سفر نامہ لکھ سکوں۔ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ میں نے زندگی کے بیشتر سفر ان زمانوں میں کیے جب میں والہی پر کچھ بھی نہ لکھتا تھا۔ میں ایک ادیب نہ بھی ہوتا تو بھی اتنے ہی سفر کرتا جتنے کہ میں نے کیے۔ کہ میرے لیے آوارگی جذبہ اول ہے اور اُس کی روئیداد قلمبند کرتا ہوں تو لوگوں کو اپنے سفر میں شریک کرنے کے لیے اور۔ اُس سفر کو پھر سے زندہ کرنے کے لیے۔ گویا میں ایک اور سفر پر نکل جاتا ہوں۔ اور یہاں ایک سفر نامہ نگار دوسرے مسافروں سے کہیں زیادہ بخت والا ہو جاتا ہے کہ وہ دوبارہ اُنہی کیفیتوں میں متروتوں اذیتوں اور مشقتوں اور خوبصورتیوں میں سے گزرتا ہے۔ کچھ اسی طور میں نے غار حرام میں تو صرف ایک شب بسر کی لیکن اُسے بیان کرتے ہوئے سینکڑوں راتیں میں نے اُس غار میں بسر کیں۔ جو سرسری دیکھا تھا اُس کی تفصیل میں گیا۔ جو اُن دیکھا تھا وہ بھی سٹڈی کی تنہائی میں نظر آنے لگا۔ ایک شب کا یہاں اور کیفیت سینکڑوں شبوں پر محیط ہو گیا۔ تو گویا اب بھی۔ اس لمحے۔ جب کہ اُس شب کو گزرے ہوئے ایک برس ہو چکا ہے۔ میں ہنوز غار حرام کی رات میں ہوں۔

وہ دھبہ چاندنی کا جس سے میں داغا جانا چاہ رہا تھا وقت کے بہاؤ میں تھا۔ سرکتا ہوا میرے بدن سے اُترا۔ کچھ دیر فرش پر پڑا رہا اور پھر آہستگی سے دیوار کے پتھر پر چلا گیا۔ مجھے خالی کر گیا۔ شاید دو بج رہے تھے۔

میں اقراء کے اُس لمحے کی شدت کو مزید سہارا نہ سکا۔ اور اُنھ کر محض میں چلا گیا۔ کھائی سے پرے وہی پہاڑ تھا جس پر بابا کو وہی شخص دوبارہ نظر آیا تھا۔ اُسے میں نے بہت دیر تک دیکھا۔ گھر سے سانس لیے۔ کوشش کر کے اپنی توجہ کو پہلی وحی کے نزول کے لمحے سے الگ کیا۔ مجھے یہاں رہنے ہوئے ایک عذرت ہو چکی تھی۔ جانتے بے خبر ہوں یہاں تھا۔ یہی میری کل حیات تھی۔ ایک کھوہ اور اُس کے آگے یہ گھن۔ میں یہاں کب آیا تھا؟ جانے کن زمانوں میں آیا تھا۔ وہ زمانے مجھ سے کس بچے

میں نے اپنی حسیات میں ہم لوگ بچے تھے۔ غار حرام میں تھا

کچھ قیاس کیے بغیر کہ میں یہ کیوں کر رہا ہوں... کچھ سوچے کچھے بغیر کچھ غنودگی میں کچھ غفلت میں میں ہاتھ پھیرتا تھا... اور بال پوائنٹ کے آہنی وجود کے لمس سے چٹان پر ٹھہر ٹھہر کر آگے بڑھنے اور سرکنے سے رگڑ کی جوا واز آتی تھی وہ غار کی اتھاہ خاموشی میں گونجتی تھی... واضح اور بلند ہوتی تھی... جیسے کسی گہرے متروک شدہ کنویں میں پتھر گرایا جائے تو پانی سے ٹکرانے کے بعد کنویں کی گولائی میں سے ایک مرطوب لے کی مانند اٹھتی آواز گونجتی ہے...

اُس خاموشی میں جائیں اتنے بلند نالے...

میرے کانوں میں اترتی واحد آواز... گر... گر... پتھر سے اُچلتی رگڑ کھاتی ایک آواز... خاموشی میں بلند ہوتی...

ایک میکانیکی انداز میں... کچھ غنودگی میں اور کچھ غفلت میں... جب میں سوتا تھا جاگتا تھا اپنے ہاتھ کو قلم کو تھامے ہوئے ہاتھ کو حرکت دیتا رہا... ایک نیم دائرے میں... سر کے مین اوپر ہاتھ حرکت کرتا اور میری کمر تک آتا تھا نیم دائرے میں... اور میں اُسے پھر سے اٹھا کر چٹان کے ساتھ لگا کر حرکت دیتے لگتا تھا...

کبھی میں اپنے بازو کو آرام دینے کی خاطر اپنے پہلو میں لٹا دیتا قلم سے جدا ہونے بغیر... اور پھر کچھ لمحوں بعد وہی سلسلہ شروع کر دیتا...

میں ایسا کیوں کر رہا تھا... قلم کو ایک دو بار ان پتھروں سے چھو کر بھی تو حاضری لگوائی جاسکتی تھی... میں بار بار ایسا کرتا تھا کہ غار کی تنہائی میں قلم اور چٹان کا ملاپ جو سر بلند کرتا تھا وہ مجھ کو بھٹے لگتے تھے... تنہائی کا توڑ بنتے تھے...

اُس خاموشی میں جائیں...

بعض اوقات یہ نالے... قلم کے کھروری چٹانی سطح پر سرکنے کے نالے اتنے بلند محسوس ہوتے جیسے یہ صحن میں ٹھکت نیاز... جہل نور کی گھائی جہاں ہوا لگتی ہے وہاں سونے والے بابا بنگالی کو بھی جگا دیں گے...

اور پھر...

چٹان کی سطح پر نیم دائرے میں حرکت کرتا ہوا میرا ہاتھ اور قلم ایک مقام پر لچھ بھر کے لیے رکا تو میرا بازو بے اختیار کانپنے لگا... جیسے ریشہ زدہ ہو گیا ہو... میرا بقیہ بدن تو سکوت میں تھا لیکن میرا بازو لرزش میں آ گیا... کپکپانے لگا میرے اختیار سے باہر ہو کر دھڑکنے لگا...

میں نے اُس مقام سے ہاتھ کو الگ کیا اور اُسے دروازے کے سر کا یا تو بقیہ بدن کی مانند وہ بھی

کھروری سطح کو محسوس کرتا ہاتھ پھیرنے لگا... پھر وہی تشویش کام آئے گی کہ جیسے تاجدار بریل لکھائی پر ہولے ہولے ہاتھ پھیرتے ہیں اُسے پونوں پر محسوس کرتے ہوئے... پڑھتے ہیں... اور مجھے خیال آیا کہ تاجدار لوگ جب بریل میں قرآن پاک کو چھو کر پڑھتے ہیں اور اُن کے پونوں تلے... اقراء باسم ربک الذی خلق... ابھرا ہوا محسوس ہوتا ہے تو وہ کیسی عجیب سی کیفیت سے دوچار ہوتے ہوں گے کہ وہ بھی تو پڑھ نہیں سکتے... دل میں کیا کہتے ہوں گے کہ میں پڑھ نہیں سکتا...

کافی دیر تک بے دھیانی میں میں چٹان پر اپنی تھیلی آہستہ آہستہ پھیرتا رہا... ایک لمبے دائرے میں جیسے کار کے واہر ہولے ہولے چلتے ہیں... اور تب مجھے اپنے جاپانی بال پوائنٹ کا خیال آیا... جو خصوصی طور پر میں اپنے ساتھ لایا تھا... لکھنے کے لیے یا نوٹس بنانے کے لیے نہیں محض اس لیے کہ جہاں پہلا حرف نازل ہوا تھا... جہاں وہ پڑھا گیا تھا اور جہاں قلم کے ذریعے پڑھانے اور سکھانے کی نوید دی گئی تھی تو اُس مقام پر ایک قلم تو ہونا چاہیے... میں نے اٹھ کر اپنے سر ہانے یعنی تہتی تھیلی کی جیبوں کو ٹٹولا اور وہ بال پوائنٹ نکالا... نارنج جلائے بغیر اندھیرے میں محسوس کر کے تلاش کیا اور پھر لیٹ گیا... قلم کو میں نے دائیں ہاتھ میں یوں پکڑا کہ میرا انگوٹھا اُسے سنبھالتا تھا اور وہ میری کھلی تھیلی پر کھٹا تھا...

اسے عقیدے کا ضعف قرار دیا جاسکتا ہے... رومان پسندی کو بھی مورد الزام ٹھہرایا جاسکتا ہے اور اسے ایک وہم بھی شمار کیا جاسکتا ہے کہ میں یہ قلم خصوصی طور پر اپنے ہمراہ صرف اس لیے لایا تھا کہ اسے غار حرا کے پتھروں سے چھوؤں گا... اُن پر رکھوں گا... اُن کے لمس سے اسے روشناس کرواؤں گا کہ انہی پتھروں نے اقراء سنا تھا تو اُن کے ساتھ چھونے سے شاید اسے بھی کچھ لکھنا پڑھنا آ جائے... یہ پتھر اس پر مہربانی کر دیں... عنایت کر دیں... یہ یقیناً عقیدے کا ضعف تھا...

وہیں لیٹے لیٹے بال پوائنٹ کو انگوٹھے سے سنبھالے تھیلی واکیے ایسے کہ جب میں نے چٹان کی سطح پر ہاتھ رکھا تو پورا بال پوائنٹ اُسے چھوتا تھا... اُسی طور اپنا ہاتھ چٹان پر ہولے ہولے میں لے پھیرا... ایک نیم دائرے میں... ایک سست واپس کی مانند...

جب میرا ہاتھ خالی تھا اور میں اُسے چٹان پر پھیرتا تھا تو ظاہر ہے لمس بے آواز تھا... اب تھیلی اور چٹان کے درمیان بال پوائنٹ تھا اس لیے اُس کے چھونے سے... اُس آئینہ اتھاہ اور کھائیوں میں اترنے والی خاموشی میں اس کی رگڑ سے ایک ہلکی آواز جنم لیتی تھی... گر... گر... جیسے کوئی گمراہی رک رک کر چلتی ہو...

میں بال پوائنٹ کو خاص لمحوں پر چٹان کی سطح پر ہاتھ رکھتا تھا...

میں نے اسے لرزے دیا۔

ہاتھ اُس مقام سے ہٹایا نہیں۔

میں نے کچھ کوشش نہ کی، جب تو نہ کی کہ یہ لرزش ختم جائے۔ میں نے اُس بازو کو اُس کے حال پر چھوڑ دیا۔ جیسے وہ میرے بدن کا ایک حصہ ہی نہ ہو۔ کسی اور کا بازو ہو اور میں محض تماشا دیکھنے والا ہوں۔

اور جیسے جیسے لرزش میں اضافہ ہوتا تھا اُسی تناسب سے قلم کا دھاتی وجود پٹھان کے ساتھ رگڑ کھاتا جاتا تھا۔ اور اُس کی رگڑ کی آواز غارجا میں ہولے سے گونجتی تھی۔

میں نے اُسے گونجنے دیا۔

میں تو صرف اپنے قلم کو اقراء کے پتھروں سے روشناس کروانا چاہتا تھا۔ کچھ دیر تک چھونا چاہتا تھا لیکن یہاں ایک اور سلسلہ شروع ہو گیا۔

شعوری طور پر میں نے اس کیفیت سے باہر آنے کی کوشش نہ کی۔ دم سادھے لیٹا رہا۔ چھت کو ٹکتا رہا۔ بازو کی رعشہ زدگی کو محسوس کرتا رگڑ کے تسلسل کو غور سے سنتا رہا۔

کیونکہ میں اک انوکھی حالت انبساط میں تھا۔

ایک کیف اور بے پروائی کی حالت میں تھا اور لطف لے رہا تھا۔

میں نے اس حالت کو اپنے اوپر طاری ہونے دیا۔ اس سے باہر آنے کی کوشش نہ کی۔ اپنے بے اختیاری سے کاہتے بازو کو اختیار میں لانے کی سعی نہ کی۔ بے شک اس کی کوئی نہ کوئی منطقی توجیہ تھی لیکن اسے فی الحال قبول نہ کر کے اسے جاری رہنے دینے میں بھی کچھ حرج نہ تھا۔

پھر ایک اور تبدیلی وارد ہوئی جس کی کوئی توجیہ نہ تھی۔ میرے بازو میں جو تھر تھراہٹ اور لرزش تھی وہ میرے کندھے تک آئی اور پھر میرے اُس بدن میں جو حالت سکون میں تھا سرایت کرنے لگی۔ اترنے لگی۔ اور میں نے باقاعدہ اُس کا راستہ محسوس کیا کہ وہ اتر رہی ہے اور میرے بدن میں پھیل رہی ہے۔ سرایت کر رہی ہے۔ جیسے ریت میں پانی سرایت کرتا جاتا ہے۔ اُسے گھٹا کر تاجلا جاتا ہے۔

میں نے یہاں بھی مدافعت نہ کی۔ اُسے سرایت کرنے دیا۔ یہ لرزش میری ریڑھ کی ہڈی تک گئی اور پھر دونوں ٹانگوں میں اتر گئی یہاں تک کہ میرے دونوں پاؤں بھی اس کی زد میں آ کر ہولے ہولے چلنے لگے۔ میرا ہر سراپا بازو میں ہر لرزش تھی اس سے ہم آہنگ ہو کر کانپنے لگا۔

البتہ فرق یہ تھا کہ بازو کی کانپاہٹ میری جیسے ہلکے رنگ رہا اور بقیہ بدن قدرے دھکے

سکوت میں چلا گیا۔ نارمل ہو گیا۔

لیکن مجھے چٹا لگ گئی کہ کیا یہ محض اتفاق تھا یا وہ مقام کوئی خاص مقام تھا جہاں میرا ہاتھ ٹھہرا تو لرزش میں آ گیا۔

یہ جاننے کے لیے میں نے اپنی ہتھیلی پیچھے کر کے پھر اُسی جگہ پر رکھ دی تو بازو خزاں رسیدہ پٹے کی مانند لرزے لگا۔

میں اگر غنودگی اور غفلت میں تھا تو فوراً باہر آ گیا۔ یہ کیا ہے کہ سر کے عین اوپر جب میں اپنا بازو بلند کر کے ایک خاص مقام پر ٹھہرا رہے دیتا ہوں تو وہ قلم سمیت لرزے لگتا ہے۔ ذرا آگے سر کاٹا ہوں تو نہ کانپتا ہے نہ لرزتا ہے۔ شکھ چین کے سکوت میں چلا جاتا ہے۔ کیوں؟

اس میں کوئی اسرار کوئی راز کوئی بھید نہ تھا۔ کوئی رمز نہ تھی۔ غالباً صرف یہ تھا کہ جب میں اپنے بازو کو بلند کر کے ہتھیلی اُس مقام پر دھرتا تھا تو کہیں کاندھے میں کوئی شریان دب جاتی تھی۔ کسی رگ پر بوجھ پڑتا تھا تو ہاتھ لرزے لگتا تھا سادہ اور آسان سی توجیہ۔

ورنہ اور کیا سبب ہو سکتا ہے۔ بس یہی۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ اگر میں غنودگی اور غفلت میں تھا تو باہر آ گیا تھا۔ جو اس میں تھا اور جاگتا تھا۔ اس آسان سی توجیہ کو قبول کرتے ہوئے میں نے ہتھیلی اور قلم کو اُسی مقام پر رہنے دیا جو سرزنش کا باعث بنتا تھا۔

اس کپکپاہٹ کا آغاز بہت ہلکے انداز میں ہوتا تھا۔

میں نے ایک مرتبہ پھر اپنے آپ کو تسلی دینے کی خاطر ہتھیلی اُس مقام سے ذرا پیچھے سرکائی تو کپکپاہٹ یکسر ختم گئی۔

دوبارہ اپنی ہتھیلی اور قلم کو اُسی مقام پر سرکا کے رکھا تو ہاتھ کانپنے لگا۔ میں نے اُسے وہاں رہنے دیا۔

لیئے ہوئے میرے پاؤں صحن کی جانب۔ چہرہ چھت کو ٹکتا ہوا۔ بایاں بازو بدن کے برابر میں آرام کرتا اور دایاں بازو اٹھا ہوا ہتھیلی اور قلم اُس خاص مقام پر۔

بے شک یہ کسی رگ پر زور پڑنے سے۔ بازو کے ہاتھوں کے کھینچے جانے سے یا کسی اور وجہ سے ہی تھی لیکن میرے ہاتھ کی لرزش میں ہولے ہولے اضافہ ہونے لگا۔ بلکہ کبھی کبھی ایک جھٹکا سا بھی لگتا۔ اور پھر ایسا ہوا کہ میرا بازو ہواؤں کی زد میں آنے والے خزاں رسیدہ پٹے کی مانند ایک

بائی ہے آہستہ کی طرح لرزے لگتا ہے۔

مجھے کچھ حساب نہیں کہ کتنے زمانے گزرے، وقت کے پیمانے میں کتنی ریت ڈھری ہوئی۔
سرکلی ماضی ہوئی۔

شاید چند سیکنڈ نہیں کم از کم کچھ منٹ۔

میرا خیال ہے کہ تقریباً چار پانچ منٹ تک مجھ پر یہی کیفیت طاری رہی۔

شاید میں اسے جاری رہنے دیتا۔ لیکن اس مسلسل پہچان کو برداشت کرنا سہل نہ تھا۔ اسے سہتے جانا ممکن نہ تھا۔ مجھے خدشہ ہونے لگا کہ یہ لرزش جاری رہی تو شاید میری کوئی نہ کوئی رگ اسے سہہ نہ سکے۔ کچھ نہ کچھ کہیں تھم نہ جائے۔ اور بالآخر جب مجھ سے سہانہ گیا تو میں نے اپنا ہاتھ اُس مقام سے ہٹا لیا۔ چاہا۔ لہجہ بھر کے لیے میں ایک عجیب دہشت میں آ گیا وہ وہاں سے ہٹا نہ تھا۔ جیسے میری ہتھیلی اور قلم چٹان پر ثبت ہو گئے ہوں لیکن حقیقت میں ایسا نہ تھا۔ کانپتے ہوئے پورے بدن میں سے صرف ایک ہتھیلی کو حرکت دینے کی سعی کی جائے تو بعض اوقات وہ لرزش سے جڑی رہتی ہے۔ انفرادی طور پر الگ نہیں ہوتی۔ چنانچہ میں نے بازو کے ساتھ اپنے بدن کو بھی شامل کیا اور ذرا ہمت کر کے اُس مقام سے اپنا ہاتھ ہٹا لیا۔

ایسا ہو گیا تو۔ ایک سکون نازل ہوا۔ نہ کوئی لرزش تھی اور نہ رگڑ کی کوئی آواز۔ سکوت ہو گیا۔
قرار آ گیا۔

کچھ دیر میں اسی قرار میں رہا۔

ذہن سرا سراسر خالی۔ نہ کوئی توجہ نہ جواز۔

ایسا سکوت اور ایسا قرار کہ یقین ہی نہ آئے کہ چند لمحوں میں تڑپنا تھا۔

میں نے ایک مرتبہ پھر اپنا ہاتھ بلند کر کے اُسی مقام پر رکھا۔ ہتھیلی اور چٹان کے درمیان بھپا ہال پوائنٹ پھر سے جل ترنگ بجانے لگا۔ لیکن اب اُس شدت سے نہیں جو پہلے وجود میں آئی تھی اور نہ ہی یہ لرزش کندھے تک اتر کر میرے بدن میں پھیلی۔

میں نے ہتھیلی اور ہال پوائنٹ کو چٹان کے لمس سے الگ کیا۔ ہال پوائنٹ کو تھقی تھیلے میں سنبھالا اور پھر لیٹ گیا۔

اُس مقام پر۔ غار کی چٹانی دیوار کے ایک خاص حصے پر جب میں اپنا ہاتھ رکھتا تھا تو لرزہ طاری ہو جاتا تھا تو کیا یہ کوئی خاص مقام تھا۔ نہ کسی رگ کے دبنے کی توجہ نہ فہم میں نہیں آتی تھی۔ ویسے تو فہم میں کچھ بھی نہیں آتا تھا۔ تو پھر یہ کیسا خاص مقام تھا۔ وہاں کیا تھا۔ چٹان میں کچھ ایسی خاصیت تھی۔ کوئی کرکٹ تھا۔ کیا تھا۔ شاید ایک ہاتھ اُن کا۔ اُن کا اکثر اسی مقام پر رکھا رہتا تھا جب وہ غار میں لیٹے

سُروں میں تھا۔ جیسے ایک ٹکلی شاخ پر بیٹھا ہو امرغ زریں اُڑ جائے تو وہ شاخ دیر تک ہولے ہولے کانپنے چلی جاتی ہے۔ جیسے ستار کے تار چھینرنے سے دھلر لڑتے رہتے ہیں۔

پورے کا پورا بدن ماسوائے بائیں بازو کے کانپ رہا تھا۔ لرزش میں تھا۔

کچھ گھبراہٹ سی ہونے لگی۔ جیسے میں عالم برزخ میں ہوں۔

جان نکلی جاتی ہے۔

یہ کیا ہو رہا ہے؟ میں نے اپنے آپ سے پوچھا۔

اور وہی شمس تبریز والا جواب آیا۔ یہ وہ ہے جس کی تمہیں خبر نہیں۔

میں نے سوچا کہ صرف بازو کی لرزش کی توجہ تو تلاش کر لی تھی لیکن اس کے ساتھ اب پورا وجود کیوں تھر تھرانے لگا ہے ایسے کہ اس پر تمہارا کچھ اختیار نہیں۔ جیسے تمہاری جان نکلنے کو ہے اس کا تو کچھ جواز نہیں۔۔۔

میرا دایاں بازو بلند حالت میں۔ ہتھیلی اور چٹان کے درمیان میرا قلم۔ سب لرزش میں۔ اور رگڑ کا مسلسل شور۔ پورا جھنجھ۔ سارا وجود۔ اُس کی شریانوں میں جو نور کی کشتی تھی وہ بھی ڈوبتی ہوئی۔

میرے بدن کا زواں زواں تھر تھرا تا لرزش میں تھا۔ جیسے میں سنولیک کی رات میں برہنہ پڑا برف پر ٹھٹھرتا ہوں۔ جیسے تھم چکے دل کو حرکت دینے کے لیے بجلی کے جھکے دیئے جاتے ہیں تو بدن پہ اختیار لرزتا ہے۔ ایسے۔۔

بے شک تحریر میں مبالغہ در آتا ہے۔ داستان گوئی کی جس حقائق کو اپنے رنگ میں رنگ دیتی ہے۔ بھلا ایسے مقام پر میں مبالغے کے جرم کا مرتکب ہو سکتا ہوں۔ حقائق کو اپنا رنگ دینے کی جسارت کر سکتا ہوں۔ وہ کچھ بیان کرنے کی حماقت کر سکتا ہے جو ظہور پذیر نہیں ہوا۔ میں تو اُس بدنی کیفیت کو سینکڑوں صفحوں پر محیط کر سکتا ہوں صرف وہی بیان کرتے ہوئے جو مجھ پر گزری اور پھر بھی اختصار اختیار کر رہا ہوں۔ غار حرا میں اُس رات میرے ساتھ یہی سلوک ہوا۔ ایسے ہی ہوا۔ اور میں آپ کو اس پر یقین کر لینے کی گزارش نہیں کر رہا۔ کیوں کروں۔ ایسا ہوا اور میرے ساتھ ہوا۔

میں شاید کوشش کر کے اس کیفیت کو روک سکتا تھا لیکن میں نے اس کا سوچا بھی نہیں۔ آپ کو اس لرزش کے حوالے کر دیا۔

اور میں اُس رات میں غار حرا میں اپنے پورے سراپے کو مسلسل کانپتے لرزتے۔ کیا حسوس کر رہا تھا۔ کبھی مجھے خدشہ ہوتا کہ میرا دل تھم جائے گا۔ یا میں مفلوج ہو جائے گا۔ یا شاید اسی طور

اُسے دوبارہ سنبھلنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

ایک ہی بار کافی تھا۔

بہت دنوں بعد جب میں نے اس سٹیج زندگی سے اُسکتائی ہوئی۔ اس زندگی سے اسی ہوئی جو بقول اُس کے داتا گنج بخش سے براہ راست سوال جواب کرتی تھی اور مدینے جا کر بھی اُس کا رابطہ ہوتا تھا۔ ایک صوفی منش خاتون سے میں نے غار حرائیں جو بیٹا تھا اُسے بیان کیا تو وہ کہنے لگیں "الکل" آپ کیوں شعوری طور پر کوشش کرتے ہیں کہ اُس رات کی لرزش کی توجیہ کریں۔ دلیلیں تلاش کر کے اُسے منطق کی رو سے ثابت کریں۔ جو کچھ آپ پر بیٹا ہے اُسے ایک رگ کے دبے یا پٹلوں پر زور پڑنے کے کھاتے میں ڈال دیں۔ آپ یہ کیوں نہیں مان لیتے کہ یہ ایک محض جسمانی نہیں زودحالی واردات تھی۔"

بھلا میں ماننے والا کہاں تھا۔

ہاں! قراری وہ ایک لفظ ہے جو میری اُس کل کیفیت کو بیان کرنے پر قادر ہے۔

وجود کی تروتازگی اور بیجان سے یکسر آزاد ہونے کی کیفیت نے میرے اعصاب کو یوں سکون دیا کہ میرے ہونٹوں پر ایک بے وجہ مسکراہٹ آ گئی۔ یہ کیا تھا۔ میرے اندر پہلے سے کچھ موجود تھا۔ دگوں میں تیرتے پھرتے لہو کے سوا بھی کچھ تھا جس سے میں آگاہ نہیں تھا۔ میرا ہاتھ اُس مقام پر ٹھہرتا تھا تو اُس "کچھ" کا کسی اور "کچھ" سے رابطہ ہو جاتا ہے۔ تاریں مل جاتی تھیں اور سرکٹ مکمل ہو جاتا تھا۔ اور یوں ان دونوں کے ملنے سے کوئی انہونی ازجی جنم لیتی تھی جو میرے بدن کو گرفت میں لے کر اُس میں دوڑنے لگتی تھی۔ کیا یہ توجیہ ہو سکتی ہے۔

میرے اعصاب آرام میں آئے۔ بائیں ڈھیلی ہونٹیں تو میں سست ہو گیا۔ جیسے شدید سردیوں میں گرم شاور کے بعد ہلکی سی غنودگی طاری ہونے لگتی ہے۔

چاند اب ڈوبنے کے ڈھل جانے کے کسی ایسے زاویے پر تھا کہ میرے سین اور ہوا ایک مختصر شکاف تھا اُس پر سے چاندنی نے اپنی روا سمیٹ لی تھی اور وہ تاریک ہو چلا تھا۔ اُس میں سے کبھی بکھار کچھ ہوا اترتی تھی تو اُس کی موجودگی کا موہوم سا احساس ہوتا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو ڈھیلا چھوڑ دیا اور اوتھ میں چھا گیا۔

اُس لمحے ڈھالی یا تین کے درمیان کی رات تھی۔

کئی ہی دیر تک میں غفلت اور آسودگی میں پاؤں پھیلائے چلا رہا۔

ہوتے تھے شاید!

صرف چند لمحے پشتر قلم کے دھاتی وجود کی چٹان کے ساتھ رگڑ اور بے قراری تھی جو غار کے اندر گونجتی پتھریلی دستکیں دیتی تھی۔

وہ نہ رہی تو ایسی چپ ہوئی۔ ایسی کہ بس چپ ہی چپ۔

شدید خاموشی جس کی اپنی ایک بولتی ہوئی موجودگی ہوتی ہے۔ جس کے حصار میں آئی ہوئی ہر شے اُس کا احترام کرتی ہے اور سانس روک لیتی ہے۔ جیسے پتھروں کے مسام بھی سانس نہ لیتے تھے۔ باہر چٹان کے سائے میں خوابیدہ نیاز بھی دم رو کے ہوئے تھا۔ میرے اوپر جو کھر دری چھت تھی جس کے ایک ایک پتے پر میں نے متعدد بار ہاتھ پھیرا تھا اس لالچ میں کہ غار میں سے اُٹھتے ہوئے شاید کبھی بابائے بھی اس پر ہاتھ رکھ کر سہارا لیا ہو۔ اُس چھت میں بھی پتھر یا سانا بھرا تھا۔

مجھے توقع یہی تھی بلکہ یقین تھا کہ اتنی بیجان خیز لرزشوں اور بے اختیاریوں کے ختم جانے سے۔ رعشہ زدگی کی حالت سے باہر آ جانے پر۔ میرے بدن کا ہر ٹوٹھ کاوٹ اور پڑ مردگی سے مر جھا جائے گا۔ میں نڈھال ہو جاؤں گا۔ مجھ میں کچھ سکت نہ رہے گی۔ جیسے محبوب کے وصال کے بعد کا حال ہوتا ہے۔

پرایسا بھی نہ ہوا۔

اس سے برعکس ہوا۔

میرا بدن لطیف ہو گیا۔

کونج کے اُس پردے کی مانند ہلکا اور لطیف ہو گیا جو پرواز کی تیزی کے دوران اُس کے گرم جے سے الگ ہو کر۔ کونج کہیں آگے چلی جاتی ہے اور وہ ہولے ہولے جھولتا ہوا کے دوش پر ہلکورے کھاتا آسمان سے نیچے آتا ہے۔

جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آ جائے۔

ہاں! قراری وہ ایک لفظ ہے جو میری اُس کل کیفیت کو بیان کرنے پر قادر ہے۔

میں ایک حالت قرار میں تھا۔
تروتازہ۔ اوس میں بھیگی ایک کوئیل کی مانند۔

سبے شک جب میں اُس حالت میں قرار میں بیٹھا تھا۔ میں اُس کے انبساط میں تھا۔ بیجان کے باوجود کسی ڈر میں نہ تھا۔ لطف اندوز ہوا تھا۔ لیکن میں اُس کیفیت کو دہرائے کی۔ اُس میں پھر سے بیٹھا ہونے کی کوئی خواہش نہ تھی۔ اسی بڑے دیباوی انعام کی تلاش بھی رو کر دیتا۔ میں

میں نے نارنج بھادی تو وہ مکمل طور پر تاریکی میں مدغم ہو گیا۔
وہ پچھلے چھ سات گھنٹوں کے دوران پہلا ذی روح تھا جو میری تنہائی میں مُخل ہوا تھا۔ میری
غار کے صحن میں بن بلائے آ گیا تھا۔
مجھے صرف یہ خدشہ تھا کہ کہیں وہ پولیس سے متعلق نہ ہو اور مجھے بے دخل کرنے نہ آ گیا ہو اس
کے سوا مجھے اُس سے کچھ خوف نہ آیا۔

میں نے پہلے تو بلند آواز میں... السلام علیکم پکارا اور پھر غیر شعوری طور پر انگریزی میں اچھپا۔
جو اردو سیر؟

میں تارکی میں بھی اندازہ کر سکتا تھا کہ میری آواز سن کر وہ شخص یکدم خوفزدہ ہو گیا ہے۔ کچھ نہ بولا نہٹ بنا کھڑا رہا۔ شاہریک ہاتھ میں لٹکائے۔ میں اُس کی جگہ ہوتا تو خوف کی حالت میں نہ ہوتا کھڑا نہ رہتا بلکہ چیخیں مارنے لگتا کہ آپ رات کے اس پہر تنہا تاریک سڑک میں سے برآمد ہو کر غارِ حرا کے نیم تاریک صحن میں قدم رکھتے ہیں تو ایک تیز روشنی آپ کی آنکھوں کو چند سیادیتی ہے۔ پھر یکدم بجھ جاتی ہے اور پھر اندھیرے میں سے کوئی شخص یا بھوت پریت شاید آپ کو بلند آواز میں السلام علیکم کہتا ہے اور پھر انگریزی بولنے لگتا ہے تو آپ کا ردِ عمل کیا ہوگا۔

اُس نے اپنا شاہ پر بیگ زمین پر رکھ دیا لیکن آگے نہیں آیا وہیں کھڑا رہا اور تب میں نے ایک اور نرودار السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ بلند کیا اور اُس کے قریب ہو گیا۔ وہ ذرا پیچھے ہوا اور پھر ذرا جھک گئے ہوئے علیکم السلام کہا اور پھر بہ زبان فارسی کچھ گویا ہو گیا۔ اور خاصا باتونی ہو گیا لیکن پھر بھی میرے نزدیک ہونے سے گریز کرتا رہا۔

میں نے ماسٹر دین محمد قصائی سے سیکھی ہوئی۔ است معنی ہے اور بُدو معنی تھا قسم کی شدہ فارسی سے کام چلا تا چاہا لیکن نہ چلا۔ پھر میں نے انگریزی آزما لی اور وہ کچھ ہوں ہاں کرنے لگا اور پہلا فقرہ جو مجھے بوجہ آیا وہ یہ تھا۔ کہ آغا قاسم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔ اور پہلا فقرہ جو میں نے اُسے سمجھایا وہ یہ تھا کہ ہالے ہالے لیکن آغا قاسم نے مجھے اپنے شاہچہیک کو نرنگ میں کھینچے ہوئے زیادہ ڈرایا تھا۔

اور دوسرے قمرے کے لیے میں تجار تھا "آغا آپ یہاں رات کے اس چہر کیا کر رہے

کامل غفلت میں پھر بھی نہیں.. کہ خیند کی مدد ہوشی سے مکمل طور پر آشنا تو اس رات میں کبھی نہ ہوا.. لیکن تیرے خیال سے غافل نہیں رہا..

خیال بابا کے گھر میں رات کرنے کا.. اور بابا کا.. ان سے غافل نہیں رہا..

کچھ دیر تک میں اُس نیم غفلت میں مبتلا رہا.. جس میں آپ کی آنکھیں نیند میں اترنے سے گریز کرتی ہیں لیکن بوجھل ہوتی جاتی ہیں.. صحن میں سے جو خفیف سی ہوا آرہی تھی اُس میں واضح طور پر ٹھنڈک کے آثار تھے.. صبح ہونے میں ابھی بہت دیر تھی لیکن اُس کی ٹھنڈک کے سندیے آنے لگے تھے.. کچھ اندازہ نہیں کہ اُس حالتِ قرار میں کتنے پل بیت گئے.. شاید بیس پچیس منٹ گزرے ہوں گے جب اس ملکوتی سناٹے اور پُچپ میں میرے کانوں میں ایک عجیب سی ناقابلِ فہم آواز آئی.. ایک سرسراہٹ رگڑ کھاتی.. کبھی رُک جاتی کبھی کھڑکھراتی رواں ہوتی کوئی ایسی آواز جس سے میرے کان واقف نہ تھے.. کیا جبل نور کے چھتر تلے کوئی جانور پلانٹس کی بوتلوں اور خالی ڈبوں پر چلتا ہے.. یا کوئی پرندہ ہے جو غارِ حرا کی چھت کی رسلوں کو چونچ سے کریدتا ہے.. عام حالات میں اور ایسے مقام پر میں یقیناً دہشت زدہ ہو جاتا.. سراپہ ہو جاتا کہ یہ پتہ نہیں کیا آفت ہے.. لیکن میں مکمل قرار میں تھا مکمل ایمان میں تھا کہ اِس گھر میں اِس غار میں کوئی آفت کوئی بلا آ ہی نہیں سکتی.. میں ایک ایسی پناہ میں ہوں.. آواز کچھ دیر کے لیے ختم گئی اور پھر وہی گھسنٹی ہوئی کسی کنویں کی تہہ میں سے برآمد ہونے والی عجیب سی صدا آنے لگی..

ظاہر ہے مجھے تجسس تھا کہ یہ ہے کیا۔

میں اُنھ کو بیٹھ گیا۔ آواز صحن میں سے آرہی تھی۔ میں نے ٹول کر مارچ تلاش کی۔ اُسے جلایا لیکن صحن میں نہیں گیا غار کے دہانے پر کھڑا ہو کر اُس کی روشنی کو جبل نور کی چوٹی کی جانب کیا۔ وہ اتنی بلندی تک گھنی حالت میں جانے سے قاصر تھی۔ پھیل گئی اور کچھ واضح نہ ہوا۔ اُس کی روشنی کو نیچے لایا تو چٹان کے برابر میں نیاز کو حسب سابق مدھوش پڑے دیکھا۔

میں محن میں آ گیا۔ ذرا غور سے کان لگا کر سنا تو یہ نامانوس اور کھردری آواز سُرنگ کی تارنگی میں سے آرہی تھی اور قریب آ رہی تھی۔ میں نے مارچ کا رخ سُرنگ کی جانب کر دیا۔ اُس کی روشنی میں بڑی چٹان واضح نظر آنے لگی۔

چند مہینوں کے بعد سرنگ کے انتہاء اندر پیارے میں سے ایک انسانی بیکر نمودار ہوا اور گھن میں قدم رکھتے ہی میری نارنج کے روشن دائرے کی زد میں آ کر نمایاں ہو گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بڑا شعلہ جگمگا رہا تھا۔ اس نے اپنے انسانی کی زبان پر شعلہ ٹھیک جہیزوں و سرنگ میں ٹھیک ہوا سا لہ لہا تھا۔

میں فراخ دل ہو چکا تھا۔ غار میں جو کچھ میں نے کمانا تھا کما چکا تھا۔ اس لیے فراخ دل ہو چکا تھا۔ کہ اس شخص کے جذبے کی شدت تو مجھ میں نہ تھی کہ وہ رات کے اس پہر جبل نور کی چڑھائی پر جانے کن مصیبتوں اور کٹھنائیوں سے دوچار ہوتا اندھیرے میں ٹھوکریں کھاتا یہاں تک آن پہنچا تھا تو اُسے اُس کا حصہ ملنا چاہیے تھا۔

”رضا۔ پلیز آپ غار میں بیٹھے رہنے۔ عبادت کیجیے۔ میں اپنا مسئلہ محن میں بچھالیتا ہوں۔“
تو ڈاکٹر رضاعلی کہنے لگا۔ اُس کے بال گھٹکھریا لے اور سیاہ تھے وہ خوش شکل تھا یہ میں تاریخ کی روشنی میں جان چکا تھا لیکن اب تاریکی میں اُس کے خدو خال دکھائی نہ دیتے تھے اور میں صرف اُس کی دھیمی اور سلجھی ہوئی آواز سن سکتا تھا۔ فارسی اور انگریزی سے جنم لینے والی آواز میں۔ ”نہیں براور۔ آپ کو فوقیت حاصل ہے۔ آپ پہلے آئے۔“

”میں بہت بیٹھ چکا۔ آپ بیٹھے۔“
”نہیں براور۔ اس غار سے بڑھ کر یہاں ایک اور مقام ہے جس کی چاہت میں میں یہاں اس سے آیا ہوں۔ میں وہاں جاؤں گا۔“

”بالے بالے۔“ میں نے یونہی سر ہلکرتا سید کی لیکن دل میں کہا کہ رضاعلی اس مقام سے بڑھ کر اور کون سا مقام ہوگا۔ کیا آسمان پر جاؤ گے۔

”اس غار کی چھت پر۔ جبل نور کے آخری سرے پر۔ جہاں سے وادیِ مکہ کے درمیان خانہ کعبہ روشن نظر آتا ہے۔ یہ پوری وادی میں سب سے بلند ترین مقام ہے تو میں جب وہاں بیٹھتا ہوں تو وہاں اللہ میرے قریب ہو جاتا ہے۔ سامنے اُس کا گھر ہوتا ہے اور اوپر وہ ہوتا ہے۔ یہاں رسولؐ نزدیک ہے اور وہاں اللہ۔ میں وہاں بیٹھوں گا۔“ میں جب اپنے آبی دہاؤ سے مجبور ہو کر اوپر گیا تھا تو میں نے بھی وہاں ایک قربت محسوس کی تھی۔ غار حرا کی چھت پر۔ آسمان نیچے آتا لگتا تھا۔

”ویسے آپ کے شاہر میں کیا کیا ہے جو پتھروں پر لگنے سے شور کرتا تھا۔“
”یہ سنا اُسے شور کرتا تھا۔ ورنہ کچھ شور نہ تھا۔ ایک سو میٹر ہے۔ منرل وائر کی دو ٹولیں ہیں۔“

جس کا ایک ڈبہ ہے۔ ایک خصوصی تاریخ ہے اور قرآن پاک ہے۔
رضاعلی اب بار بار ہو چکا تھا۔ بے تکلف یا رہو چکا تھا اور ہم ملی جلی فارسی اور انگریزی میں نیاز کی موجودگی سے بے نیاز ہاتھیں کرتے تھے۔

وہ ایسے حال ہے اس دوران لازم نے ایک گروٹ بھی بدلی ہو۔
”میں دوسری بار سمیٹ کر آ رہا ہوں۔ پہلی بار دن کی روشنی میں ہزاروں دائرین کے ہمراہ

ہیں؟“ پہلے تو سوچا کہ اس کے جواب میں ایک داستانوی توجیہ پیش کی جائے کہ آغا میں تو غار حرا کا رکھوالا ہوں۔ سُرنگ کے باہر بیٹھ کر لوگوں کو راستہ دکھاتا ہوں۔ چودہ سو برس سے یہیں ہوں۔ باہا آئے تھے تو اُن کے لیے سُرنگ کو روشن کرنے کی سعی کرتا تھا لیکن اُن کے منور وجود کے سامنے میری تاریخ بچھ جاتی تھی۔ میں نے انہیں ایک چکن سینڈوچ بھی آفر کیا تھا اور انہوں نے میری دودھ کی بوتل سے ایک گھونٹ بھرا تھا اور شب بھر میں بھی اُس میں سے گھونٹ بھرتا رہا ہوں اور وہ ابھی تک بھاری ہے۔ دودھ ختم ہونے میں نہیں آ رہا۔ یقین نہ آئے تو غار حرا کے داخلے کے دائیں جانب جو پتھر ہے اُس پر رکھی ہے خود چپک کر لو۔ میں نے یہاں کیا کرنا ہے۔ میں تو یہیں ہوتا ہوں۔

لیکن یہ تو میرے تصور تھے۔ میری خوش فہمیاں تھیں اس لیے یہ داستان سنانے سے گریز کیا اور صرف اتنا کہا۔۔۔ نئے فہمیدم۔۔۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں یہاں کیا کر رہا ہوں۔

وہ ظاہر ہے ایک ایرانی تھا۔ رضاعلی!
تہران کے خمینی انٹرنیشنل ایئر پورٹ پر ایک ڈاکٹر تھا۔ اور عام ایرانیوں کے مقابلے میں خاصا خوش شکل تھا۔

یہ نہیں کہ وہ اندھیرے میں ٹھوکریں کھاتا اپنا شاہر بیک گھسیٹتا سُرنگ میں سے باہر آیا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں بھی ایک تاریخ تھی جو اُس نے میری تاریخ کی روشنی میں آنے پر ہراساں ہو کر بھادی تھی۔ اگرچہ وہ مفلح ہوا تھا۔

ایک بن بلایا مہمان تھا۔
جسے میں نے گھر بنا لیا تھا اُس گھر میں آگیا تھا لیکن اُس کی غیر متوقع آمد نے مجھے مسرت سے دوچار کیا۔ بے شک یہ غار حرا کی کم کم نصیب میں آنے والی تنہائی تھی لیکن میں اس تنہائی میں کسی اور کی آمد کی خواہش رکھتا تھا کہ کوئی آئے اور میں اُس سے باتیں کروں۔ غار حرا کے پتھروں سے کب تک باتیں کروں۔ کوئی انسان آئے اور میں اُسے شریک کروں۔

میں نے سب سے پہلے اس ایرانی مہمان کو ایک ایسی پیشکش کی۔ جو روئے زمین پر اُس لیے میں ایک یکتا پیشکش تھی۔ بے شک کوئی نصف دنیا پر راج کرنے والا ہو لیکن وہ بھی ایسی پیشکش کی ہمسری نہ کر سکتا تھا۔ آغا آپ آئیے۔ غار حرا کے فرش پر میرا مسئلہ بچھا ہوا ہے۔ آپ اطمینان سے جی بھر کے وہاں نفل ادا کیجیے۔ اور پھر بے شک سویر تک وہیں قیام کیجیے۔ میں محن میں بیٹھ جاؤں گا۔

رضاعلی نے شکرے کے طور پر فارسی میں کوئی قصیدہ سا پڑھا۔
غار حرا میں داخل ہوا اور کھڑکوں کو کھولا اور سلام پھیر کر باہر آ گیا۔

گو بجے گئی.. اس میں اتنی دلجمعی شدت اور محبت تھی کہ میری توجہ بھٹک گئی..

آپ ہی منصف ہو جائیے کہ رات ہو.. غار حرا میں ایک رات ہو آپ تنہا ہوں اور اس رات میں کوئی شخص غار کی چھت پر بیٹھا اور وہ بھی تنہا ہو خوش الہانی سے قرآن کا ورد کر رہا ہو تو کیا آپ بھی بھٹک نہ جائیں گے.. ایک ایسا قاری جو غار حرا میں قیام کرنے پر ترجیح دیتا ہو اس کی چھت پر بیٹھ کر اپنے سامنے خانہ کعبہ کو دیکھتے ہوئے.. اپنے آپ کو فراموش کر کے جبل نور کی بلندی پر اللہ تعالیٰ کو اپنی شہ رگ سے بھی نزدیک محسوس کرتے ہوئے قرأت کرنے کو..

حضورؐ سے کسی نے کہا کہ ایک شخص ایسا ہے جو قرآن پاک کی قرأت اس انداز اور جذبے سے کرتا ہے جیسے وہ اس پر اتر رہا ہو.. اور یہ شکایت کے لہجے میں کہا گیا.. آنحضرتؐ نے دریافت کیا کہ وہ کون ہے؟.. جواب ملا عبداللہ بن مسعود.. فرمایا ہاں وہ بے شک ایسا کر سکتا ہے.. مجھے علم نہیں کہ قرأت کے مرتبے کا تعین کیسے کیا جاتا ہے.. اس کے درجات مقرر کرنے کے پیمانے کیا ہیں.. میرے لیے صرف تاثیر اہم ہے.. اور رضاعلیٰ کی قرأت میرے دل پر اثر کر رہی تھی اور اس کی تاثیر میں وہ مقام اور وہ تنہائی بھی رس گھولی تھی..

نوافل سے فارغ ہو کر میں نے سوچا کہ اللہ کی قربت میں بیٹھے ہوئے اُسے اُسی کا کلام سناتے ہوئے اس شخص کے پاس جا بیٹھنا چاہیے.. غار سے باہر آ کر میں نے بائیں ہاتھ پر بلند ہوتے عمودی پتھروں پر ایک تفصیلی نگاہ ڈالی جن پر رضاعلیٰ ابھی پاؤں جماتا آسانی سے اُپر چلا گیا تھا اور پھر کبھی گیا کہ نہیں یہ میرے بس کی بات نہیں میرے بدن اور برسوں کے بس کی بات نہیں..

مجھے اُس لمحے خیال آیا کہ شاید رضا مکمل تنہائی کا متمنی ہو وہ کسی اور کی موجودگی کی خواہش نہ رکھتا ہو.. براہ راست اُس سے باتیں کرنا چاہتا ہو بکسر تنہا.. تو میں رک گیا.. صحن میں کھڑا اُپر سے اترتے حروف کو اپنے کانوں میں اترنے دیا اور عجیب غماز میں آیا..

قرأت میں وقفہ آیا تو مجھ سے نہ رہا گیا..

میں نے اُسے پکارا ”رضا.. میں آ جاؤں؟“

تاریکی میں اُس کا چہ لہا سا دکھائی دیا.. وہ نیچے جھانک رہا تھا.. پھر اُس نے اپنا ہاتھ بڑھایا

”آ جاؤ“

”نہیں.. یہاں سے نہیں“

”میں تمہیں تھاں ہوں.. آ جاؤ“

جبل نور کی چوٹی پر ہانپتا سانس کھینچتا پہنچا.. یہاں اتنا ہجوم اور شور تھا کہ غار حرا نظر نہ آتی تھی لوگ نظر آتے تھے.. میری کچھ تشفی نہ ہوئی تو اگلی شب رات کے اس پہر میں جبل نور کے واسن میں آیا.. میں نہیں جانتا تھا کہ تاراج کی روشنی میں میں اُپر تک پہنچ سکوں گا یا نہیں.. شاید پابندی ہو اُپر جانے پر.. اور اگر نکلیں کیا تو کیا پتہ وہاں سعودی شرطے تعینات ہوں جو مجھے کافر جان کر گرفتار کر لیں کہ سعودی ہم ایمانوں کو برداشت نہیں کرتے.. لیکن جب میں یہاں آیا.. تو یہاں کوئی نہ تھا.. رات کا یہی پہر تھا.. میں نے غار میں عبادت کی.. اور پھر یہیں سے.. صحن سے ہی چٹانوں پر قدم جماتا اُپر چلا گیا.. غار کی چھت پر.. اور وہاں اللہ موجود تھا.. اتنا قریب تھا کہ میں اُس سے کلام کر سکتا تھا.. یہ پچھلے برس کا قصہ ہے.. اس برس آیا ہوں تو ایک بار پھر دن کی روشنی میں چند روز چشتز آیا.. اور پھر ہجوم کی یلغار میں تشفی نہ ہوئی.. تو آج رات پھر آ گیا ہوں.. لیکن برادر تم نے مجھے بہت ڈرا دیا تھا..“

”تم نے مجھے زیادہ ڈرا دیا تھا“ میں نے پھر کہا..

”ویسے میں تمہاری ہمت کی داد دیتا ہوں کہ تم شب بھر یہاں ٹھہرے رہے ہو.. میں تو اس غار میں داخل ادا کرنے کے بعد ٹھہر نہیں سکتا.. تم یہیں ٹھہرو.. میں اُپر جاتا ہوں“

رضاعلیٰ مجھ سے رخصت ہوا اور غار کے دہانے کے برابر میں جو چٹانیں بلند ہوتی تھیں اُن پر جانے کیسے قدم جماتا.. اپنے شاہریک سمیت اُپر چلا گیا.. کہ اُس کے مطابق اُپر اللہ تھا.. اور نزدیک تھا.. میں پھر تنہا ہو گیا..

ہمت والا تو رضاعلیٰ تھا جو تنہا رات کے اس پہر جبل نور کی مشکل اور کسی حد تک خطرناک چڑھائی چڑھ کر آیا تھا اور پھر بے خطر تاریک سُرنگ میں داخل ہو کر صحن میں آ نکلا تھا.. میں تو سر شام یہاں آن پہنچا تھا اور نیاز کی منت سماجت کر کے اُسے یہاں سونے پر راضی کیا تھا.. وہ یقیناً ایک نڈر شخص تھا اور اُس کا ایمان میری نسبت کہیں مضبوط تھا..

میں بھی غار کے اندر جا بیٹھا.. کچھ دیر بیٹھا اور پھر نفل ادا کرنے کے لیے نیت کرنے کو تھا تو سوچا کہ صرف ایک وضو تو شب بھر کے لیے قائم ہونے سے رہا تو ایک بار اور کر لینے میں کچھ

مضائقہ نہیں..

رضا مجھے منرل واٹر کی ایک بوتل تحفے کے طور پر دے گیا تھا.. میں اُسے کام میں لایا..

میں نفل ادا کرنے کے بعد اپنی توجہ کو کراچی کی طرف موڑ دیا.. وہاں کچھ دیر کے لیے فراموش کر دیا کہ میں

کہاں کھڑا رہا ہوں.. میں کہیں بھی ہو سکتا تھا.. اپنے گھر میں.. سٹوڈنٹس کی گاؤں کی مسجد میں.. کہیں بھی

چاند ڈھلتا ہوا.. وادی مکہ کی اُن پہاڑیوں میں روپوش ہونے کو تھا جن میں سے کسی ایک میں غار ثور تھا..

میں نے وہاں تک جانے کا بھی تہیہ کر رکھا تھا لیکن اطلاع ہوئی کہ بلندی تک پہنچنے کے لیے ایک سڑک تعمیر ہو رہی ہے اس لیے راستہ فی الحال بند ہے.. اور یہ بھی بتایا گیا تھا کہ غار حرا کی چڑھائی بہت کٹھن ہے لیکن طویل نہیں جب کہ غار ثور کا راستہ نسبتاً زیادہ ہے مگر آسان ہے..

میں نے محسوس کیا کہ رضا مجھ سے گفتگو تو کر رہا ہے لیکن وہ میرے دھیان میں نہیں ہے.. قرآن تھا میرے وہ مجھ سے باتیں تو کرتا ہے لیکن کبھی اوپر آسمان کی جانب نگاہ کرتا ہے اور کبھی روشن کہے کو نظروں میں لاتا ہے.. وہ تخلیق چاہتا تھا.. کسی اور کی موجودگی میں اللہ سے باتیں نہیں کرنا چاہتا تھا.. میں نے کوئی بہانہ کیا اور اُنہی قدموں پر اپنی غار میں لوٹ آیا..

نیاز.. بے نیاز تھا.. صحن کا ایک بالکل مختصر سا حصہ بچھی ہوئی چاندنی کی زد میں تھا.. باقی تمام جبل نور کی چٹان کے سائے میں جا چکا تھا..

میں صحن کی جانب چہرہ کیے آلتی پالتی مار کر مصلے پر براجمان ہو گیا.. دودھ کی بوتل.. نارچ اور جوگرز کے درمیان دھری تھی اور اُس کا پلاسٹک نمایاں نظر آتا تھا.. ہموک تو نہیں لیکن پیاس.. حلق سوکھ رہا تھا..

میں جن کیفیتوں میں سے گزر رہا تھا.. تجربے کے جن جہانوں کی میر کر رہا تھا اور جن کائناتوں کا مشاہدہ کر رہا تھا.. اُن میں سے کوئی ایک کیفیت.. کوئی ایک جہان اور بس ایک کائنات ہی کافی تھی مگر بھر کے لیے پیاسا رکھنے کے لیے.. پہچان در پہچان کا اثر تھا کہ میرا حلق سوکھ رہا تھا..

میں نے دودھ کی بوتل کا ڈھکن کھول کر اُس کے مُنہ سے مُنہ لگا کر تین چار آبشار گھونٹ بھرے.. ٹھنڈک اور سفیدی کو اپنے بدن کے صحرا میں سرایت کرتے محسوس کیا.. اب حساب کرتا تو جتنا دودھ میں پی چکا تھا اس بوتل کو کب کا خالی ہو جانا چاہیے تھا.. اور وہ نہ ہوئی تھی.. کیوں نہ ہوئی تھی.. اس میں اس غار کے پتھروں نے بھی کچھ برکت بھری تھی کہ میں ان کا بھی تو مہمان تھا اور یہ میزبان پتھر نہیں چاہتے تھے کہ جب تک میں اُن کے ہاں قیام کرتا ہوں یہ ختم ہو جائے.. یہ آداب میزبانی کا تقاضا تھا کہ مہمان پیاسا نہ رہے.. اور وہ پتھر یہ بھی جانتے تھے کہ جو کبھی اُن کا مہمان ہوا کرتا تھا اُس نے بھی اس بوتل سے ایک گھونٹ بھرا تھا..

دکانوں میں سے سڑک پر چاندنی بھی مددگار تھی اور اُس کے جزیروں سے بچے بچے تھے.. پہلے کی مانند پتھروں کی کھدائی میں آسمان کے سائے میں کام لے رہے تھے..

”نہیں میں گرجاؤں گا.. میں صراطِ مستقیم سے آؤں گا“ میں نے ہنس کر کہا..

وہ پھر تاریکی میں چلا گیا.. اور قرأت کی آواز دوبارہ بلند ہونے لگی.. میں اپنی نارچ کی مدد سے سُرنگ کے آشنا اور دوست پتھروں میں سے ہوتا ہوا پابانگالی کے چھترتے نمودار ہو کر گھائی کے ساتھ قدم دھرتا پتھروں پر چڑھتا رضا کے پاس آ گیا جو قرآن پڑھنے میں لگن تھا..

اندھیرے کے سیاہ برش سے پینٹ کی ہوئی یہ ایک عجیب تصویر تھی.. اس میں آس پاس کی چٹانیں اور پس منظر تاریک تھا لیکن قرآن پر جھکا ہوا ایک چہرہ روشن تھا قرآن کے اوراق روشن تھے اور اُن کے سامنے وادی مکہ کی سیاہی کے بیچ اللہ کا گھر روشن تھا..

میں جان بوجھ کر قرآن پاک اپنے ہمراہ نہ لایا تھا کہ قیام تو رات میں ہے.. تاریکی میں پڑھنا تو ممکن نہ ہوگا اس لیے نہ لایا تھا..

لیکن رضا علی مجھ سے سیانا تھا.. وہ اُس شدہ تاریکی میں کہ چاند تقریباً بجھ چکا تھا.. قرآن کھولے.. اپنی گود میں رکھے اُس کے اوراق پر ایک خصوصی اور تیز روشنی والی چھوٹی سی نارچ جمائے آنکھیں تقریباً نارچ کے ساتھ لگائے بڑی آسانی سے پڑھ رہا تھا..

بعد میں اُس نے مجھے بتایا کہ یہ نارچ اُس نے بہت چھان بین کر کے اسی مقصد کے لیے خریدی تھی..

مجھے اس کا خیال نہ آیا تھا اور نہ غار حرا میں بیٹھ کر قرآن پڑھنا بھی تو کیسا کیف ہوتا.. میں دم رو کے اُس کے قریب بیٹھا رہا اور وہ سر ہلاتا بلند آواز میں قرآن پڑھتا رہا.. مجھے کہیں کہیں سے کسی آیت کا کوئی حصہ سمجھ میں آ جاتا.. تو میرے بدن سے ایک سرسراہٹ سی چھوڑنے لگتی.. جیسے تلیوں کے ایک غول کے پڑ چھوڑتے ہوں..

اُسے احساس ہوا کہ کوئی اس کے قریب آ بیٹھا ہے.. مجھے دیکھ کر اُس نے نارچ بچھا دی.. ”اوپر آسمان کی طرف دیکھو“ وہ کہنے لگا ”یہ وادی مکہ میں سب سے قریب ترین آسمان ہے.. یہاں اللہ نزدیک نہیں ہوگا تو اور کہاں ہوگا“

”تم پڑھتے جاؤ.. میں سنا چاہتا ہوں..“ میں نے کہا.. ”نہیں.. میں جسے سنانا چاہتا ہوں اُسے سنا رہا تھا.. تمہاری موجودگی میں نہیں سنا سکتا.. اب تم پڑھنا شروع کرو.. میں سننے میں آ جاؤں گا..“

نامکمل سی نا آشنائی اس کیف کے راستے میں حائل نہ ہوتی تھی۔ اس سرور میں رخنہ نہ ڈالتی تھی۔ اس خمار کو کم نہ کرتی تھی جو رضا کی قرأت مجھ پر طاری کرتی تھی۔

ابھی خمار سرمست کرتا تھا اور ابھی یہ ہوا کہ اتر گیا۔ چپ ہو گئی۔ غار حرا کے پتھر جو میری طرح سرور میں تھے ہوش میں آ گئے۔

رضا کی قرأت تھم گئی، خاموشی چلی آئی۔

میں نے محن میں نکل کر اسے پکارا "رضا، کیا وقت ہوا ہے؟"

اس کا سایہ چھت پر دکھائی دیا۔ پھر اس کی نارچ نے روشن ہو کر اس کی کھائی پر بندگی گھڑی کو نمایاں کیا۔ "تمیں بچ رہے ہیں"

"آپ.. رک کیوں گئے ہو.. پڑھ کیوں نہیں رہے؟"

"اب میں سوچنا چاہتا ہوں اس کے بارے میں جو کچھ میں نے پڑھا ہے۔" اس نے

جواب دیا۔

پھر فوراً ہی کہنے لگا اور یہ گفتگو، ملی جلی فارسی اور انگریزی میں ہو رہی تھی "تم قرآن پڑھنا چاہتے ہو؟"

"نہیں.. تم پڑھو۔"

"میں تو پڑھ چکا ہوں۔" وہ چھت سے آگے ہو کر ایک پتھر پر احتیاط سے اتر ا اور بھکا۔ اس کے ہاتھ میں قرآن پاک تھا جسے وہ مجھ تک اتار رہا تھا "پلیز آپ پڑھ لو.. یقین کرو میں نے جتنا پڑھا تھا پڑھ چکا۔" یہ اس نے اس لیے کہا کہ میرے لہجے میں جھجکتھی یہ اس کی متاع تھی۔ اگرچہ میں خواہش کرتا تھا کہ یہاں غار حرا میں کچھ تو قرآن پڑھوں لیکن میں اس کی متاع قبول کرنے سے ہجکتا تھا۔

"پلیز.. اس نے پھر کہا۔

"تو رضا، تم رہنمائی کرو کہ میں کون سی آیت پڑھوں"

"جو تمہارا جی چاہے.. جہاں سے جی چاہے پڑھو.. یہ قرآن ہے"

"تم کوئی سی آیت نکال دو جو تمہیں پسند ہو.. پلیز"

اس نے وہیں پتھروں پر قدم جمائے مجھ سے دو چار ہاتھ اوپر قرآن کھولا اس پر نارچ کی روشنی کا دائرہ قریب کیا اور قیاساً ایک ورق کا کونہ مڑ کر قرآن جھک کر مجھے ہمدان دیا۔

میں اس کا فکر نہ کیا کہ اسے اپنی غار میں آ بیٹھا۔ وہ غار حرا میں بیٹھ کر رات سے قرآن

اور وہ تعداد میں گھٹ بھی چکے تھے۔

صرف تین باقی تھے بقیہ چاند کے ڈھلنے سے ڈھل چکے تھے رخصت ہو گئے تھے۔

یہ دھبے غار کی کائنات میں آہستہ رویاروں کی مانند حرکت کرتے رہے تھے اور اب وہ کسی اور مدار میں چلے گئے تھے روپوش ہو گئے تھے۔ اگرچہ میرے بدن پر باقی تھے۔

وہ.. جو چھت پر بیٹھا تھا رضا علی وہ پھر سے ہم کلام ہو گیا۔ قرأت کی مدھر راگنی چھت سے ڈھل کر محن میں اپنا سحر پھیلاتی غار کے اندر جادو جگانے لگی۔

بے شک رضا کی آواز مترنم نہ تھی نہ ہی وہ مکمل سر میں تھا۔ جیتنا تو کیا وہ قرأت کے کسی مقابلے میں شاید شامل بھی نہ ہو سکتا لیکن جس مقام پر وہ براجمان تھا.. وہ جگہ.. اور آسمان کی قربت.. خانہ کعبہ کی ہمہ وقت دید.. اور سب سے بڑھ کر اس کی دنیا جہان سے بے خبری اور استغراق اسے ایسا ترنم عطا کرتا تھا ایسے سر میں لاتا تھا جو کسی اور قاری کے نصیب میں کہاں تھا۔

دنیا بھر میں کتنے قاری ہوں گے جنہوں نے یوں غار حرا کی چھت پر کسی تاریک رات میں ایک نارچ کی روشنی میں قرآن پڑھا ہوگا.. وہاں پڑھا ہوگا جہاں پڑھنے کا حکم آیا تھا اور جہاں اس ام الکتاب کا پہلا حرف نازل ہوا تھا۔

میں بھی اسی بے خبری میں جا چکا تھا.. اسی عالم استغراق میں تھا.. رضا سے الگ نہ تھا.. اور ابھی میں بھول جاتا کہ اس کلام اور میرے درمیان رضا ہے.. اُن لمحوں میں معاملہ براہ راست ہو جاتا.. یہی محسوس ہوتا کہ یہ آسمانی کلام آسمان سے مجھ پر ہی اتر رہا ہے۔

کیا یہ جادو گری عربی زبان میں ہی ممکن تھی.. یہ تاثیر صرف اسی زبان کی مرہون منت تھی.. اگر یہ کسی اور زبان میں فرانیسی میں سندھی یا پنجابی میں اترتا.. کہ ایک عظیم صوفی شاعر سے جب یہ دریافت کیا گیا کہ آپ تو مفت زبان ہیں تو پنجابی میں ہی کیوں کلام لکھتے ہیں تو انہوں نے کہا.. اس لیے کہ پنجابی میں اللہ تعالیٰ سے باتیں کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔

تو کیا فرانیسی، سندھی، پشتو یا پنجابی میں.. اردو، بنگالی، تالگو یا سواحیلی چینی یا انگریزی میں بھی قرآن اترتا تو اتنا ہی بڑا اثر اور ہوش رکھتا.. یقیناً.. بغیر کسی شک کے.. ایسا ہی ہوتا.. کہ یہ زبان نہ تھی اس کا کلام تھا جو اس زبان کو بڑا اثر اور ہوش رکھتا تھا قرآن کسی بھی زبان میں اترتا تو یونہی

دل پر اثر کرتا.. میں پہلے بھی انہما کر چکا ہوں کہ میں بدقسمتی سے معافی سے کہاں آشنا تھا.. البتہ تراکیب اور

پھر مرنے والے کوئی آسمانی میں.. لیکن وہ کون سا کلام ہے کہ پڑھنے پر ہمارے دل لگتے تھے.. لیکن

جار ہے تھے اور کسی بھی لمحے بے جان ہو سکتے تھے اور اس لیے بھی کہ میں سویر ہو جانے کے خوف میں مبتلا ہو گیا تھا۔

اُس لمحے پھر رضا علی کی آواز سنائی دینے لگی۔

وہ فارسی میں کچھ پڑھ رہا تھا یا شاید گارہا تھا۔ کچھ الپ رہا تھا اور اُس کی آواز اس قابل نہ تھی کہ اُس میں کچھ بھی الپا جاسکے یا گایا جاسکے۔ اس سے پیشتر جو وہ خوش الحان اور پُر اثر تھا تو یہ قرآن کی جادو بیانیات تھیں وہ نہ تھا۔

میں نے اُس سے مستعار شدہ قرآن سنبھالا اور اُسے سینے سے لگائے غار سے باہر صحن میں آ گیا۔ وہی سُرنگ جس میں داخل ہونے سے میرا جی گھبراتا تھا اُسی سُرنگ میں داخل ہو کر تاریج چلائے بغیر میں ایک خرگوش کی مانند پتھروں کو اندھیرے میں ٹاپتا چلا گیا جیسے ہر حائل چٹان اور قدموں میں اُبھرے پتھروں کو میں عمر بھر یونہی بنا دھیان دیئے عبور کرتا رہا ہوں۔ جیسے بجلی چلے جانے کے باوجود اندھیرے میں اپنے گھر کی ہر میز، ہر صوفے، ہر گلدان اور ہر کاوٹ سے آگاہ ہوں۔ اُن سے ٹھوکر کھائے بغیر بے فکر چلتا ہوں۔ پھر بابا بنگالی کے چپتر سے نکل کر عمودی چٹان پر قلائعیں بھرتا رضا علی کے پاس جا پہنچا جو میری آمد سے بے خبر سر جھکائے اپنے الپ میں مشغول تھا۔

”رضا، شکریہ“ میں نے قرآن اُس کے حوالے کر دیا ”اب تم یہ کیا گانے کی کوشش کر رہے ہو؟“

”وہ شرمندہ نظر آنے لگا۔“

کچھ نہ بولا۔

”یہ فارسی میں کیا الپ رہے ہو؟“

”میری آواز بہت بری ہے۔ مناسب نہیں ہے میں جانتا ہوں۔“

”لیکن تم جو کچھ بھی پڑھ رہے تھے بہت گن ہو کر پڑھ رہے تھے۔ کیا پڑھ رہے تھے؟“

”ہمارے ہاں ایک گلوکار ہیں محمد رضا افتخاری میں اُن کی گائی ہوئی ایک نعت رسولؐ پڑھنے کی

کوشش کر رہا تھا جو مجھے بہت پسند ہے۔ مستنصر میری آواز بہت بری ہے۔“

وہ کچھ زیادہ ہی شرمندہ ہو رہا تھا۔ جیسے کسی جرم کا ارتکاب کیا ہو۔ لیکن میں کیا کروں۔ مجھے وہ

نعت یہاں یاد آگئی تو میں کیا کروں۔ میرا جی ہاں کہ اُسے یہاں غار حرا کی چھت پر بیٹھ کر اللہ کی قربت

میں پڑھوں۔ اُسے بھی سلاؤں اگرچہ میری آواز اس قابل نہیں ہے۔“

پڑھنا۔ واہ! رضا کی نشانی قرآن کے آخری صفحوں کے قریب تھی میں نے اپنی تاریج جس کی روشنی پہلے کی نسبت مدھم ہو گئی تھی اُس ورق کے قریب کی۔ اقراء باسم ربک الذی خلق

یہ آیت میں بار بار دوہرا چکا تھا۔ پڑھ چکا تھا۔ یہ تو ازبر تھی۔

میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے رضا کو پکارا ”رضایہ تو میں کئی بار پڑھ چکا ہوں۔ کوئی اور آیت؟“

”اس مقام پر یہی پڑھو۔ بے شک بار بار پڑھو۔ اسی کا اثر ہوتا ہے“ اُس کی آواز

اُتری۔ تو میں نے یہی کیا۔ اگرچہ یہ آیت مجھے ازبر ہو چکی تھی لیکن اس کے باوجود تاریج کی روشنی

میں اور وہ روشنی قرآن کے اوراق سے پھیل کر غار حرا کی چھت پر اور اُس پاس کے پتھروں کو ظاہر

کرتی تھی جب میں سر جھکائے اُسے پڑھتا تھا اور بار بار پڑھتا تھا تو ہر بار یہی محسوس ہوتا تھا کہ پہلی

بار پڑھ رہا ہوں۔

ہر بار۔ پہلی بار ہو جاتی تھی۔

میں پڑھ نہیں سکتا تھا اور میرے سامنے ایک ورق ہے جسے پڑھنے کے لیے کہا جاتا ہے اور

میں اُسے۔ پہلی بار پڑھتا ہوں کوئی بھی تحریر پہلی مرتبہ پڑھ رہا ہوں۔

پہلی بار میرے سامنے رب کا نام لیا جا رہا ہے کہ اُس کے نام پڑھ۔

اور پہلی بار مجھے بتایا جا رہا ہے کہ میری تخلیق کیسے ہوئی۔

اور پہلی بار میں آگاہ ہو رہا ہوں کہ اس دنیا میں قلم نام کی بھی کوئی شے وجود میں ہے جس کی قسم

وہ رب کھاتا ہے جس نے ابھی ابھی مجھ سے کہا ہے کہ۔ پڑھ!

اقراء۔ دوہرا۔ اعلان کر۔

اور پھر میں نے یونہی ورق گردانی شروع کر دی۔ جو ورق سامنے آیا اُسے پڑھنے لگا۔ بے شک

اُس کے مکمل مفہوم سے بے خبر رہا لیکن حرفوں پر نظریں پھیرتا رہا جیسے دیہات میں میرے جیسے اُن پڑھ

لوگ قرآن پر صرف اُلگلیاں پھیرتے ہیں۔ میں ایسے ہی حرفوں پر اپنی نظریں پھیرتا رہا۔

چاندنی کے صرف دودھے پتھروں پر تھے اور وہ بھی مدھم ہو رہے تھے۔

رات گزر رہی تھی۔ گزر چکے تھے۔ فجر کی اذان پانچ بجے کے آس پاس سنائی دینی تھی اور اب

تک یقیناً ساڑھے تین ہو چکے تھے۔

جس وقت کہ نہ گزرنے کی توثیق تھی اُس کے گزر جانے پر توثیق ہونے لگی۔ ایک

سراسیمگی بدن میں پھیلی کہ سویر ہو جائے گی۔

میں نے قرآن الپ کیا۔ اس لیے بھی کہ میری تاریج کے تیل کمزور پڑے

چاند اٹھنا کی کیفیت میں تھا۔ تھک چکا تھا اور ڈھلتا جا رہا تھا۔
 شاید میری حیات کی یہ پہلی مکمل رات جگے کی رات تھی۔ میں اونگھ میں چلا گیا۔۔۔ چند لمحوں کے
 لیے غفلت میں چلا گیا لیکن اُس کے خیال سے ایک پل کے لیے بھی غافل نہیں ہوا۔ نیند کی عارضی موت
 میں مکمل طور پر نہیں گیا اور یہ ماہتاب تو جب سے کائنات وجود میں آئی تھی تب سے سویا نہ تھا۔ مسلسل سفر
 میں تھا اس لیے اب ڈھلتا چاہ رہا تھا۔

رضا جس حالت جذب میں تھا اُسے میری خبر نہ تھی۔

اور میرا اشتیاق۔۔۔ عالم شوق کا ایسا تھا کہ میں اُس سے بے خبر تھا۔

ہم دونوں ایک دوسرے کی موجودگی سے غافل تھے لیکن ایک دوسرے میں بندھے ہوئے تھے۔
 ہم دونوں ایک ہی شکاری کی کنڈی میں پھنسے ہوئے تھے اور وہ لگ مچھپ ڈور کھینچتا تھا۔
 صرف ایک فرق کے ساتھ کہ رضا ترپتا بہت تھا اور میں کنڈی میں پھنسا اپنے آپ پر جبر
 کر کے راضی بہ رضا تھا۔

اور رضا تھا جو اپنے جذب میں مجھ سے لا تعلق افتخاری کی نعت پڑھتا 'گاتا تھا'۔

عربی کی نسبت میں فارسی زبان سے زیادہ قربت میں تھا۔

چنانچہ کبھی تو مجھے۔۔۔ "عاشقاں را با غم عشق" کی ترکیب سمجھ میں آ جاتی اور کبھی "حکمت قلب" کی
 کیفیت سیدھی قلب میں اتر جاتی اور پھر مجھے "اگر عشقت گناہ است" کا پورا مصرعہ پلے پڑ جاتا تو میں
 "واہ جی واہ سبحان اللہ" پکارا اٹھتا اور داد کے انداز میں اپنا ہاتھ بلند کر دیتا۔

وہ جواب میں شاعروں کی مانند آداب نہ بجالاتا کہ وہ مجھ سے میری داد سے سراسر غافل

اپنے آپ میں غافل تھا۔

اور یہ مصرعہ طبلے کی تھاپ پر۔۔۔ ہارمونیم کی لے پر میرے بدن میں توالی کرنے لگتا کہ اگر
 عشقت گناہ است۔۔۔ گناہ است۔۔۔ گناہ است۔۔۔ عشقت عشقت۔۔۔

ہاں آخراً اُس نے نعت مکمل کی اور جب میری موجودگی سے آگاہ ہوا تو میں نے فرمائش کی رضا
 یہ اشعار تم مجھے لکھ کر دے سکتے ہو۔ یہ مجھے بھول جائیں گے۔

"پہرہ چشم"۔۔۔ وہ بولا "تمہارے پاس کوئی کاغذ ہے؟"

"نہیں۔۔۔ البتہ ایک قلم ہے جو غار حرام میں رکھا ہے۔ کاغذ اس لیے نہیں ہے کہ جب میں یہاں

آیا تھا تو لکھتا پڑھتا تھا۔ تمہارے پاس کوئی ورق ہو تو یہ نعت لکھ دو۔"

"قلم لکھ لے آؤ"

نہ اُس کی انگریزی اتنی اچھی تھی اور نہ میری فارسی کہ میں اُسے بتا سکتا کہ اس میں شرمندگی کی
 کوئی گنجائش نہیں۔ میں بھی اپنے بابا کے آستانے پر جب پہلی بار حاضری بھرنے کے لیے باب السلام
 میں داخل ہوا تھا تو درود و سلام کے تسلسل میں بہت سی فلمی نعتیں خارج ہونے لگی تھیں۔ کبھی "بھجنور میں
 آن پھنسا ہے دل کا سفینہ شاہ مدینہ" اور کبھی "آیا ہے بلاوا مجھے سرکار نبی سے"۔ تمہاری تو آواز بری ہے
 میری تو آواز ہی نہیں ہے ورنہ میں بھی انہیں گانے کی کوشش ضرور کرتا۔ تو تم شرمندہ نہ ہو۔

"رضا آپ پلیز میرے لیے اس افتخاری کی نعت ضرور پڑھو۔ اسے گاؤ۔ یہ میری فرمائش ہے

پلیز۔"

رضا کو بھی دراصل کسی ترغیب کی ضرورت نہ تھی وہ ایک موج کے عالم میں تھا ایک حضوری کی
 حالت میں تھا۔ اُس کے من مندر میں سے جو آواز اٹھتی تھی وہ اُسے دیا نا نہیں چاہتا تھا۔ اظہار کے لیے
 بے چین تھا۔

اور اُس لمحے جب وہ پڑھتا تھا 'گاتا تھا'۔

ہمارے پاس کیا تھا۔

کوئی بھی نہ تھا۔

رات گئے جبل نور کی چوٹی سے ذرا نیچے پہاڑ کے آخری کنارے پر صرف دو ہیولے تھے۔

اور کوئی نہ تھا۔ اور اُن کے سامنے واوی مکہ کی نیم تاریکی میں اُس کا گھر منور تھا تاہاں تھا۔ اُن میں سے
 ایک گھنٹوں پر سر رکھے بیٹھا تھا اور دوسرا گاتا تھا۔ اور کوئی نہ تھا۔

چاند ڈھلنے کو تھا۔

ایک ٹھنڈک بھرا جھونکا آیا اور میرے بدن میں سرایت کرتا میرے اندر ہر یاد بھرتا مجھے
 زندہ کر گیا۔ تھوڑی دیر بعد پھر ہلکی خنکی کی چادر اوڑھے پہلو بدلتی ہوا آئی اور یہ چادر میرے جسم کو چھونے
 لگی۔ یہی موسم تھے۔ رات کے اس پہر اگر بابا غار کی تنہائی سے تنگ آ کر اگر بیٹھتے تھے تو ادھر آ کر بیٹھتے
 تھے کہ یہاں کھلی فضا تھی ہوا تھی اور سامنے محبوب کی حویلی تھی۔ رانجن کا ڈیرہ روشن تھا۔ جب تو روشن نہیں
 ہوتا ہوگا۔ تاریکی میں ہوتا ہوگا۔ شاید چند قدمیں روشن ہوتی ہوں۔ کچھ دیے چلتے ہوں۔ دو چار
 مشعلیں بھڑکی ہوں۔ اور پھر چٹان کے آخری سرے پر دائیں جانب نیچے۔ جرا کے پہاڑ کے دامن
 میں وہ نظر کرتے ہوں تو انہیں اماں خدیجہ کے خیمے کے باہر ایک چراغ جلتا نظر آتا ہو۔ جسے اماں نے
 بطور خاص روشن کر کے وہاں رکھا ہوتا کہ بلندی پر ایک غار میں تنہا بیٹھا اُن کا محبوب خاوند یہ جان لے

کہ وہ تنہا نہیں ہے۔

گہرے سندر نہیں ہیں لیکن تصور میں یہ لانا ہے۔ اصل معاملہ یہ ہے کہ انہیں پڑھا کہاں جا رہا ہے۔ انہیں کسی مقام پر۔ کسی رات میں کسی بلندی پر۔ کسی یکتا تنہائی میں پڑھا جا رہا ہے۔ ویسے اگر غار حرا کی رات میں مجھے کہیں سے کسی شخص کی یہ آواز سنائی دے جاتی۔ بے شک یہ آواز بے سُرئی اور بھڑی ہوتی ہے کہ... کتھے مہر علی کتھے تیری ثنا۔ تو شاید میں اس کی تاب نہ لا سکتا۔ میں اپنے آپ کو سنبھال نہ سکتا۔

لیکن اس رات بخت... شکستہ قلب جانا بہ خود وفا کُن... کو سرفراز کرتا تھا۔ میں بے شک غار حرا کا کلین تھا۔ اُس میں بسیرا کرتا تھا لیکن میں اُس معراج کو چھو بھی نہیں سکتا تھا جس پر رضاعلی کا وجد تھا۔

کچھ دیر بعد اُس نے خاموشی اختیار کر لی۔

میں بھی پُچپ بیٹھا رہا۔

پھر وہ اپنی کیفیت سے باہر آیا اور کہنے لگا۔ مستنصر تم جو کچھ کرنا چاہتے ہو کرلو جو کچھ پڑھنا چاہتے ہو ابھی پڑھ لو۔ ابھی کچھ دیر بعد فجر ہو جائے گی اور ایرانی زائرین کی یلغار شروع ہو جائے گی اور وہ غار حرا اور جبل نور پر قابض ہو جائیں گے تو تم نے جو کچھ کرنا ہے کرلو۔ جو پڑھنا ہے پڑھ لو! اُس شب تنہائی میں یہ ممکن تو نہیں لگتا تھا کہ کوئی ایک فرد بھی نکل ہو۔ لیکن رضا مجھ سے سیانا تھا اور وہ جو کچھ کہتا تھا وہ مجھے ہوش میں لے آیا کہ وقت کم ہے۔ جو کچھ کرنا ہے کرلو۔

”اور اب تم کیا کرو گے رضا؟“

”میں کچھ بھی نہیں کروں گا۔ خاموش بیٹھوں گا اور آسمان کو نکتا رہوں گا۔ کہ رات کے اس پہر

لگتا ہے کہ آسمان قریب آنے لگتا ہے۔ اور پھر وہ بھی قریب آنے لگتا ہے۔“

وہ ایک سادھو کی مانند جیسے دھونی رمائے آلتی پالتی مارے غار حرا کی چھت پر بیٹھا چہرہ اٹھا کر آسمان کی جانب دیکھنے لگا۔ پتہ نہیں اُس کے دل میں کیا تھا۔ وہ کیا مانگ رہا تھا۔ کچھ نہ کچھ تو مانگ رہا تھا اُس سے جو نزدیک آ رہا تھا۔ شاید باتیں کر رہا ہو اُس سے دل ہی دل میں۔ اور شاید اُسے کوئی جواب بھی آتا ہو۔

اگرچہ وارننگ مل چکی تھی کہ فجر کی قربت میں اس تنہائی نے چھن جانا ہے لیکن اس کے باوجود میں رضا کے پاس بیٹھا رہا۔ جی نہ چاہتا تھا وہاں سے اٹھ جائے کو۔ خانہ کعبہ سے نظریں ہٹا کر چلے جانے کو۔ اس پہر تو وہ مزید واضح ہو رہا تھا کہ آس پاس شہر تہ میں کم رو سنیاں رہ گئی تھیں۔ بالشت بھر کھلونا بننا تو کھالی رہے جاتے تھے اور کبھی کبھی مل جاتے تھے اور انہیں پھر سے کچھ دیر آنکھیں مڑکڑکھ کر تلاش کرتا

اور میں لے آیا۔

”اس نعت کا کیا کرو گے۔“

”میں ایک عادی مجرم ہوں۔ جہاں جاتا ہوں جو سفر کرتا ہوں اُس کی داستان بیان کرتا۔ روئیداد قلمبند کرنا میرا پیشہ ہے۔ مجبوری ہے۔ لیکن اس کے سوا وہ لطف بھی ہے جو ایسے سفر۔ ایسی شب ب سری کو بیان کرتے ہوئے مجھے حاصل ہوتا ہے کہ میں اُس کیفیت اور سفر میں سے دوبارہ گزرتا ہوں۔ تو جب پڑھنے والے۔ اس شب کا حال پڑھیں گے تو افتخاری کی نعت کو بھی پڑھنا چاہیں گے۔“

رضاعلی راضی ہو گیا۔ کاغذ کے چند پُڑوں پر۔ ایک وزینگ کارڈ پر نارنج کی روشنی میں اُس نے چند اشعار لکھے اُس قلم سے جو ابھی ابھی غار حرا کے پتھروں سے چھوٹا اور لرزتا تھا اور اُس کی رگڑ اُس میں گونجتی تھی۔

اگرچہ اُس شب میں نے اُس کے لکھے ہوئے حروف آسانی سے پڑھ لیے۔ انہیں رضا کے لہجے میں بار بار دوہرا کر اطمینان کر لیا کہ میں انہیں واپسی پر بخوبی پڑھ لوں گا۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔

کاغذ کے پُڑوں اور وزینگ کارڈ پر درج شدہ اشعار جب میں اب ایک برس کے وقفے کے بعد یہ روئیداد قلمبند کرتے ہوئے پڑھنے کی کوشش کرتا ہوں تو وہ پڑھنے نہیں جاتے۔ فارسی رسم الخط اب اجنبی لگتا ہے۔

جو پڑھ سکتا ہوں۔ محمد رضا افتخاری کی نعت کے شعر جو پڑھ سکتا ہوں وہ کچھ یوں ہیں۔

خدایا عاشقان را باغم عشق آتش کُن

از..... دیگر غیر از غم عشقت رہا کُن

تو خود گفتی کہ در قلب شکستہ خانہ داری

شکستہ قلب من جانا بہ خود وفا کُن۔

اور تو خود کہتا ہے کہ تو شکستہ دلوں میں رہتا ہے۔

تو میں بھی شکستہ دل ہوں تو جاناں وفا کر اور اس میں آکر قیام کر۔

اور پھر۔

اگر عشق گناہ ہے تو میں اس گناہ میں غرق ہو چکا ہوں۔

یہ اشعار وہاں ہی ہیں کہ کتھے مہر علی کتھے تیری ثنا ایسی سرشاری اور جذب کے

اور اس دوران دو مقامات پر خاص توجہ دو۔

جہاں تمہاری ہتھیلی میں تھا ماہوا قلم چٹان سے چھوتا تھا تو تمہارا بازو کانپنے لگتا تھا اور پھر بدن لرزش میں آ جاتا تھا۔ قلم جل ترنگ بجانے لگتا تھا۔ اُس جگہ کے ماتھے پر ایک بوسہ دو۔

اور جہاں کہیں وہ ثبت شدہ جگہ گم تو نہیں ہوگئی۔ جس کے ساتھ فیک لگانے سے تمہاری پشت کمر تک اُس میں فٹ ہو جاتی تھی۔ نہیں وہ جگہ دکھائی تو نہیں دیتی۔ نہ ہاتھ پھیرنے سے چٹان میں وہ دبلی ہوئی محسوس ہوتی ہے تو تم چٹان کے ساتھ فیک لگا کر بیٹھو۔ پھر ہولے ہولے کھسکتے ہوئے آگے ہوتے جاؤ۔ ہاں۔ ایسے۔ چٹان ہموار ہے۔ سطح کھردری ہے۔ ہاں۔ تمہارے کندھے اور تمہاری پشت کولہوں تک ایک خاص مقام پر قبول کر لی گئی ہے۔ یہی جگہ ہے۔ ثبت ہوگئی ہے۔ کیسا آرام مل رہا ہے۔ بدن ٹنکھی ہو رہا ہے۔ چٹان میں جو نامعلوم سانچا تھا اُس میں ڈھل کر کیسا آرام مل رہا ہے۔ اب یہاں سے ہٹنے سے پہلے وہاں اپنا ہاتھ رکھ کر جگہ کا تعین کر لو۔ اور پھر اپنے ہاتھ کے آس پاس جو نامعلوم سانچا ہے اُس پر کچھ دیر کے لیے لب رہنے دو۔ سب کچھ دہرا لیا ہے تو اب کچھ آرام کرو۔ جتنی تھیلے کے سر ہالے پر سر رکھ کر اطمینان سے لیٹ جاؤ۔

سامنے۔ غار حرا کا صحن چاندنی سے یکسر خالی ہو چکا تھا۔

چاند۔ ڈھلتا ہوا۔ خانہ کعبہ کی جانب اُترتا ہوا۔ مدھم ہو چکا تھا۔ اور اُس کی بجھتی کرنوں اور صحن کے درمیان جبل نور کی چٹانیں آگئی تھیں اس لیے وہاں تاریکی کے سائے تھے۔ اور چاندنی کا صرف ایک جزیرہ۔ غار کے اندر سفر کرتا بائیں جانب کی دیوار کے آخری سرے پر چھت کے قریب ٹھہرا ہوا تھا اور ڈوبنے کو لگتا تھا۔

بقیہ جزیروں کی رخصتی سے غار میں جو شکاف تھے جن کے راستے یہ جزیرے اُترتے تھے وہ بھی مدھم ہو رہے تھے۔

خوراک کا ذخیرہ شب بھر ساتھ دیتا رہا اب ختم ہونے کو تھا۔ دو کھجوریں مندر والی ایک بوتل اور تھوڑا سا دودھ۔ انہیں اٹھا کر واپس جذبہ تو نہیں لے جاتا۔ کھجوروں نے مٹھاس کی حد کر دی اور دودھ کے گھونٹ ٹھنڈے اور ذائقے میں سفید تھے۔

اور پھر میں بالکل خالی الذہن ہو کر بیٹھ گیا۔ کد اب کیا کروں۔

پہلی بات ہے میں اپنے تمام چاؤ پورے کر چکا تھا۔ کوئی حسرت باقی نہ رہی تھی۔ کوئی خواہش ایسی نہ تھی جو انجام نہ دے۔ میں ایک ایسا مہمان تھا جو ناتواں اور نہ حال آ پا تھا۔ ایک وسیع و سرخسوان پر

پڑتا تھا لیکن اُن کے درمیان میں جو صحن تھا وہاں بس کوہ طور کی جھاڑی میں سے پھوٹنے والی روشنی کی مانند ایک غبار سا تھا اور اُس کے درمیان جو سیاہ گھر تھا وہ روشنی کی ذراتی دُھند میں روپوش تھا۔ میں نے بہت دیر تک اپنی نظریں اس منور غبار کے اُس مقام پر جمائے رکھیں جہاں میرے حساب سے خانہ کعبہ کو ہونا چاہیے تھا۔ دیکھتا رہا اُسی ایک مقام پر نظر رکھی۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ یہ سچ ہو یا میری توجہ اور تصور نے خواہش کے ساتھ ملاپ کر کے اُسے پل بھر کے لیے تخلیق کر لیا۔ کہ پل بھر کے لیے خانہ کعبہ کا سیاہ لبادہ روشنی سے الگ ہو کر نظر آیا اور فوراً تحلیل ہو گیا۔

رضا سے کچھ کہے بغیر کہ وہ گمن تھا میں اٹھا اور غار میں واپس آ گیا۔

میں جو کچھ کر چکا تھا اُسے آخری بار دہرا نا چاہتا تھا۔

نوافل ادا اتنے کیے جتنی سکتا باقی تھی یہاں تک کہ گھٹنے ڈکھنے لگے۔ کہ مٹھلے کے نیچے جو منگیزے تھے وہ میری عاجزی اور عقیدت سے بھی نرم نہ پڑتے تھے۔ پھر وہ ساری دعائیں جو مانگ چکا تھا پھر سے مانگنے لگا۔ آل اولاد ماں باپ۔ اُن کے ماں باپ۔ عزیز واقارب۔ نزدیکی دوستوں۔ کبھی کبھار کے دوستوں آشناؤں اور ناشناساؤں کے لیے۔ اُن پرندوں اور جانوروں کے لیے جو کبھی میرے رفیق رہے تھے۔ اور اُن کے لیے بھی جو میری حیات کے آسمان پر ڈاروں کی صورت پرواز کرتے تھے۔ شمشال کے مرغ زتیں کے لیے۔ دریائے سندھ کے سُرخاب اور تائینا ڈولفینوں کے لیے بھی۔ اور اُن مناظر کے لیے بھی جنہیں رب نے میری آنکھوں کے لیے تخلیق کیا۔

اس کے بعد ہر شے کو پھر سے ہاتھ لگانے اُس کا لمس محسوس کرنے کی تمنا غالب آ گئی۔

باہر صحن میں آؤ۔ سُرنگ کے دہانے سے چلو۔ جن قدموں پر بابا چلتے ہوئے حرا کی جانب جاتے تھے اُنہی قدموں پر چلنے کی کوشش کرو۔ غار میں داخل ہوتے ہوئے قدرتی طور پر اُس پتھر پر ہاتھ رکھو۔ جس پر اُن کا ہاتھ آیا ہوگا۔ سر نیچے کر کے اُس پتھر سے بچو جو جھکا ہوا ہے کہ یہاں وہ بھی جھکتے تھے۔ پتھروں کو تھا مو۔ جہاں جہاں تھا ماں جاسکتا ہے تھا مو کوئی ایک ذرہ بھی ان پتھروں کا اُن چھو

نہ رہ جائے۔
UrduPhoto.com

صحن کی جانب چہرہ کیے کچھ دیر بیٹھو۔

اب صحن کی طرف پشت کر کے غار کے اندر گھونکنا شروع کرو۔ اُس کے آخر میں جو شکاف ہے اُسے نظر میں رکھو۔

پھر وہی دو حالوں میں رہنا کہ جہاں جہاں چھوٹے ہیں چھوٹے۔

بندھا رہا ہوگا۔ اور میں اُن سے لاڈ کرنے والا کوئی انوکھا نہ تھا۔ لیکن وہ سب کے سب باہا کے عشق میں فنا لوگ ہوں گے۔ کوئی ایسا ہوگا جو چاندنی کے جزیروں کا۔ رات کے گزرنے کا۔ شکافوں میں سے سرسراتی ہوا کا بھی شیدائی ہو۔ کوئی نہ کوئی تو ہوگا۔

بے شک کوئی ایک آوارہ گرد تو آیا ہوگا جو ثواب کو ثانوی حیثیت دیتا ہو اور اُس کے لیے یہ پتھر سنگریزے شکاف اور چاندنی کے جزیرے زیادہ اہمیت کے حامل ہوں۔

ایسا آیا ہوگا۔ تو مجھ ایسا ہوگا۔ دل کا سیاہ۔ اعمال کا سیاہ اور پھر بھی پشیمان نہ ہوتا ہو۔ باہا کی چمن چمن کرتی ڈاچی قصویٰ کے پیچھے پیچھے چلنے والا۔ اُس کی بینکینیاں اُٹھانے والا۔ حشر دہاڑے سے غافل۔ نہ حساب سے ڈرتا نہ عذاب سے خوفزدہ۔ صرف یہ تمنا کہ کبھی تو باہا۔ ڈاچی پر سوار مڑ کر دیکھیں گے کہ یہ کون ہے جو پیچھے پیچھے چلا آ رہا ہے۔

میرے کانوں میں اذان کی آواز آنے لگی۔

کوئی ایک صدائیں۔ سینکڑوں ملی جلی مشترکہ صدائیں جو دادی تک کی سینکڑوں مساجد سے بلند ہوتی۔ جبل نور کی بلندی تک پہنچتی۔ پھر ذرا نشیب میں اتر کر غار حرا کے صحن میں قید ہو کر۔ ایک سر پہلے الاپ کے ساتھ غار کے اندر داخل ہو کر میرے کانوں میں فلاح کے چراغ روشن کرتی۔ اترنے لگیں۔

نجر ہو گئی ہے۔

جدائی کی نجر آ گئی ہے۔

میں غار میں سے نکل کر باہر صحن میں آ گیا۔

”رضا۔“ میں نے پکارا۔

اُس نے اتنی دیر بعد ”ہاں“ کہا کہ مجھے یقین ہو گیا کہ وہ جا چکا ہے۔ وہاں موجود نہیں ہے۔

”فجر کی اذانیں ہو رہی ہیں؟“

”نہیں براور۔ یہ تہجد کی اذان ہے۔ میں تو یہیں پڑھوں گا۔ تم بھی آ جاؤ۔“ اُس کا سراپا چھت

پر نمودار ہو گیا۔ ادھر سے ہی آ جاؤ۔ بس اپنے جوگر جمائے رکھو۔ میں سہارا دیتا ہوں۔ اور میں پہلی ہاریوں

براہ راست رضا کا ہاتھ تھام کر جوگر جھٹاتاؤ پر جا پہنچا۔

”تہجد یہیں پڑھ لو کلی فضا میں۔ ابھی زائرین آ پہنچیں گے۔ یہیں پڑھ لو“

گو یا رضا نے ایمر جنسی ڈیکلیئر کر دی تھی کہ یلغار ہونے کو ہے۔ لیکن میں نیت کرتے کرتے

رُک گیا۔ میں نے ابھی تک کوئی نماز غار حرا میں نہیں پڑھی تھی۔ ”رضا میں نیچے جا رہا ہوں۔“

”اے۔۔۔“ وہ خیران ہوا۔

آ بیٹھا تھا اور میں نے جی بھر کے تمام نعمتوں سے پیٹ بھرا تھا۔ سیر ہو چکا تھا۔ اب مجھے یہاں سے۔ اٹھ جانے پر کوئی ملال نہ تھا۔ کوئی قلق نہ تھا کہ تھوڑی دیر بعد یہ سلطنت مجھ سے چھین جائے گی۔ میں ایک مکمل آسودگی میں پھر سے دراز ہو گیا۔

اور مجھے ایک مدت کے بعد احساس ہوا کہ وہاں صحن میں۔ کہیں نیاز بھی تو تھا۔ پتہ نہیں وہ تھا بھی یا نہیں۔ اگر ہوتا تو کبھی تو اُس کی موجودگی کا احساس ہوتا۔ شاید رات کے کسی پہر جب میں اونگھ میں تھا وہ اُٹھ کر چلا گیا ہو۔ رضا علی نے بھی اُس کی موجودگی کا کچھ تذکرہ نہ کیا تھا۔ اُس نے اُسے دیکھا ہوتا تو ضرور دریافت کرتا کہ یہ کون ہے۔

میں اُس صحن کو تکتا رہا۔ جو میرے گھر کا صحن تھا۔ جب سے ہوش سنبھالا تھا تب سے تھا اور لمحہ موجود تک ابھی تک تھا۔ میں اس صحن میں کھیلا تھا۔ گھٹنوں کے بل رینگتا تھا۔ پھر کھڑے ہونے کی کوشش میں کبھی گر جاتا تھا اور کبھی کچھ دیر قائم رہتا کلاکاریاں مارتا تھا اور میرے دادا اپنی کھدر کی پگڑی سنبھالتے بازو دوا کیے مجھے سہارا دینے کے لیے آگے ہوتے تھے کہ میں کہیں دوبارہ گر نہ جاؤں۔ اور میری دادی میری کے شجرتے چرخہ کاتی رُک جاتی تھیں اور اُن کی تند ٹوٹ جاتی تھی کہ کہیں میں گر نہ جاؤں۔ میری کے اس درخت کی ہر شاخ پر انہوں نے میری پیدائش سے پیشتر خواب میں دیے جلتے دیکھے تھے۔

تو یہ میرے آبائی گھر کا صحن تھا۔

اور میں اُن پتھروں کو تکتا رہا جو جرا کو ڈھکتے تھے۔ اور اُن چٹانوں پر ہاتھ پھیرتا رہا جن کا ایک ایک پور میرے لمس سے آگاہ ہو چکا تھا۔ اور جہاں کہیں بھی اُن کی سطح کھردری تھی میں جانتا تھا۔ اور جتنے بھی گنگرے اور کنارے تھے وہ میری پوروں سے شناسا تھے۔

اور ان آڑے ترچھے ایک دوسرے کے سہارے آرام کرتے پتھروں میں جو چھید تھے۔ جو شکاف تھے اُن میں سے جو خفیف جھونکے اُترتے تھے۔ جو ہوا آتی تھی مدھم سرسراہٹ کی لپیٹ میں تو میں اُس سے بھی واقفیت رکھتا تھا۔

یعنی وہ سب۔ غار حرا کی آڑی ترچھی۔ سلیم۔ چٹانیں اور پتھر اور شکاف بھی یقیناً میرے بے ذہب وجود۔ میرے قد۔ ناک۔ نتھے۔ ہاتھوں پر سکڑتی اور چہرے پر جال بچھاتی جھریوں اور سرخ آنکھوں سے استے ہی آشنا تھے جتنا کہ میں تھا۔

غار حرا کے فرش کے سنگریزے میرے گھٹنوں کو خوب جان گئے تھے۔

میں ابھی تک کہہ رہا تھا کہ اب اس کے بعد یہاں رات گزارنے والے عشاق کا جانا

”یہ نارچ تو بھادو.. پلیز..“

”اوہ سوری..“ اُس نے نارچ آف کر دی..

”رضا پلیز.. اب تم آ جاؤ.. میں صحن میں جا بیٹھتا ہوں تم غار میں کچھ نوافل ادا کرو..“

”نہیں.. میں اُپر جاتا ہوں.. سپید سحر نمودار ہونے کو ہے اُس کا منظر دیکھنے کے لائق ہوتا

ہے.. تم آنا چاہتے ہو“

”نہیں.. میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ غار میں بیٹھے ہوئے جب سحر اس صحن میں اترے گی تو

کیسا منظر ہوگا..“

وہ چلا گیا..

میں پھر تنہا ہو گیا..

اور میں نے جب اپنے آس پاس پھر نگاہ کی تو کسی تہذیبی کا احساس ہوا.. کسی شے کی کمی تھی..

ہاں.. اُس ایک چاندنی کے جزیرے کی کمی تھی جو میری بے دھیانی میں رخصت ہو گیا تھا..

میں نے اپنے تئیں دودھ کی بوتل میں سے آخری دو چار گھونٹ بھرے.. پھر بھی کچھ پھٹکتا

تھا.. رات کا آخری پہر زوال میں تھا..

کچھ دیر بعد سحر نے اس صحن میں اترنا تھا.. اور یہی وہ آخری منظر تھا جس کو دیکھنے کی مجھ میں

چاہت تھی کہ غار میں بیٹھے ہوئے بابا جب شب بھر کے گیان دھیان کے بعد صحن کی تاریکی میں ہولے

ہولے سفیدی گھلتے دیکھتے ہوں گے.. تو کیسے دیکھتے ہوں گے.. ویسے میں دیکھوں.. اُن کی آنکھوں سے

دیکھوں..

چاندنی کا کوئی دھبہ غار میں نہ تھا..

ابھی سویر ہونے میں کچھ وقت تھا..

البتہ سویر کی ٹھنڈک شب بھر کے جاگے ہوئے بدن پر ہولے ہولے ہاتھ پھیرتی تھی.. جتنی

تھیلے پر سر رکھ کر میں پھر لیٹ گیا..

اور نہ چاہتے ہوئے بھی ایک اوتھ میں دفن ہو گیا.. یہ سویر کی سرد ہواؤں کے بو سے تھے جنہوں

نے مجھ بے سندھ کر دیا..

کیا معلوم کب تک..

کتنی سانسیں..

”میں غار حرا کا باسی ہوں وہیں پر ہوں گا..“

”تو پھر یہیں سے اتر جاؤ..“

”نہیں چڑھنا آسان ہے.. اُتروں گا تو گروں گا یہ میں جانتا ہوں“

میں اپنے معمول کے راستے پر ہولیا.. بابا بنگالی کا چھتر سرنگ اور پھر صحن میں.. منزل واری

بوتل سے منہ پر چند چھینٹے مارے.. واجبی سا وضو کیا اور غار میں داخل ہو کر تہجد کی نیت باندھ لی..

حج کے دوران اتفاق ہو جاتا تھا لیکن عام زندگی میں تہجد کم ہی ادا کی تھی.. بلکہ شاید کبھی

نہیں کی تھی.. اور اب ادا کرتا تھا تو غار حرا کی تنہائی میں کرتا تھا.. اور ظاہر ہے زندگی میں دوبارہ ایسا نہ

ہوتا تھا..

میں نے خوابشوں اور دُعاؤں کی فہرست ایک مرتبہ پھر پیش کر دی اور وہ جو آخری دھبہ تھا

چاندنی کا اور گل ہونے کو تھا اُس پر نظر جما کر بیٹھ گیا..

اتنی دیر میں رضا صحت سے اتر کر صحن میں آ کھڑا ہوا.. اُس کے ہاتھ میں نارچ روشن تھی.. اور

اُس کا رخ میری طرف تھا.. میری آنکھیں چندھیا گئیں کہ رضا کیا کر رہا ہے.. اور تب وہ بولا.. نارچ کے

عقب میں جو تاریکی تھی اُس میں سے اُس کی آواز آئی ”مستنصر.. تم.. تم ایک حیرت انگیز چہرے کے

مالک ہو..“

”میں؟“

”ہاں.. تم اس نارچ کی روشنی میں ایک عجیب بہت ہی قدیم شکل کے لگتے ہو.. تم سے نہیں

تمہاری آنکھوں سے ڈر لگتا ہے.. اُن میں کچھ ہے.. صرف تمہاری آنکھیں ہی نہیں بلکہ پورا چہرہ ایسا ہے جو

ان زمانوں کا نہیں..“ اُس کی آواز میں حیرت کے ساتھ کچھ ڈر بھی تھا ”کاش تم اپنے آپ کو دیکھ سکتے کہ تم

کیسے لگ رہے ہو..“

مجھے کچھ بھائی نہ دیا کہ میں کیا کہوں.. کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا جواب دوں.. ہاں ایسا تو ہونا ہی

تھا.. کے ٹوکی کوہ نور دی سے واپسی پر میں اپنے آپ کو آئینے میں پہچان نہ پایا تھا.. میری آنکھیں سرخ

تھیں اور اُن میں وحشتوں کے چراغ جلتے تھے.. میرا چہرہ ایک نارمل انسان کا چہرہ نہ تھا اُس پر بھی وحشتیں

نقش تھیں.. اگر پہاڑوں کے ایک سفر کے بعد نین نقش بدل سکتے ہیں تو بابا کے گھر میں جو مہمان رات بھر

قیام کرے.. وہ تو نہیں رہتا جو کہ وہ تھا.. بے شک میرے لیے ایسا بھی ہو..

میں جانتا تھا کہ رضا کی حیرت میں سچائی ہے.. اور اُس لیے میرا جی چاہتا تھا کہ میں اپنے آپ

کو آئینے میں دیکھوں کہ کچھ سال پہلے کا چہرہ اب کیسا ہوگا..

میرا قیاس ہے کہ صحن میں جمع شدہ مخلوق بھی متوجہ ہوئی۔ اور جو جہاں تھا رک گیا۔ چپ ہو گیا۔ اور اس ٹھنک اور خوف کو توڑنے کے لیے میرے پاس بھی ایک اسم اعظم تھا۔ ایک تعویذ تھا اور میں نے بلند آواز میں ”السلام علیکم“ پکارا۔ اور دوبارہ پکارا۔ اور مسکرانے لگا۔ وہ ایک شخص جس کی نارنج کی روشنی میں آیا ہوا تھا وہ بظہر اہوا ٹھنکا ہوا شخص اپنے ڈر سے باہر آیا اور اب بھی ذرا جھجکتے ہوئے آگے ہوا اور ذرا جھک کر مجھ سے بڑی گرمجوشی سے ہاتھ ملایا۔ وہ پیچھے ہوا تو کچھ اور ہاتھ آگے ہوئے۔ میں نے اُن کے ہاتھ تھام کر کچھ نہ کچھ پڑبان فارسی اُن سے کہا۔ میں نیم تاریکی میں دیکھ تو نہ سکتا تھا لیکن اُن کے چہروں پر جذبات کی جو تہا زت تھی اُسے اپنے زخموں پر محسوس کر سکتا تھا۔ سیاہ پوش خواتین صحن میں سجدہ ریز ہو رہی تھیں۔ سنگریزوں کی تختی کی پروانہ کرتی ہوئیں اپنے ماتھے ٹیک رہی تھیں۔ اور اُن میں سے کچھ مردوں کے عقب میں کھڑی حسرت اور مسرت کی نگاہوں سے مجھے دیکھے جا رہی تھیں کہ میں غار حرام میں تھا۔ بچے ادھر ادھر جھانکنے لگے۔ صحن کی دیوار پر چڑھنے کی کوشش کرنے لگے اور نکلنے لگے۔

مجھے احساس ہو گیا کہ اب مجھے بائبل کا دیوٹر ہمیشہ کے لیے چھوڑ دینا ہے۔ جیسے موت کا ایک دن معین ہے ایسے وہ لمحہ بھی معین ہے جب مجھے بابا کے سانسوں کے سہارے قائم ان آڑے ترچھے پتھروں سے وجود میں آنے والی اس کھوہ سے کوچ کر جانا ہے۔ بابا کی اونچی حویلی سے زخمت ہو جانا ہے۔ رانجن کی جھوک سے جدا ہو جانا ہے۔ رانجن کے ڈیرے میں قیام ایک خواب ہونے کو ہے۔ جیسے کسی کے دن پورے ہو جاتے ہیں اور وہ یہ جہان چھوڑ جاتا ہے ایسے میرے لمبے بھی پورے ہو گئے تھے میں نے جو سانس یہاں لینے تھے وہ پورے ہو چکے تھے۔ کوہ نور دی میں۔ آوارگی میں۔ کسی بھی مقام پر شب ب سری کے لیے خیمہ زن ہوئے تو اگلی سویر ایک نئی منزل کی جستجو اور ہوس میں مبتلا ہوئے۔ خیمہ سمیٹتے کبھی دُکھ نہ ہوتا کہ اگلی منزل نظر میں تصور ہو کر ہلائے چلی جاتی تھی۔ لیکن یہاں سے کوچ کر کے اب کہاں جانا تھا۔

البتہ مجھے یہ یاد ہے کہ میں خواب میں بھی اپنے آپ کو غار حرام میں ہی دیکھتا تھا۔ اور اس خواب میں کچھ آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ انسانی نہ تھیں کسی غیر مرئی مخلوق کی تھیں اور اجنبی زبان میں تھیں۔ میں غار حرام کے خواب سے جاگا تو غار حرام میں تھا اور وہ آوازیں کچھ مدھم مدھم۔ دھیرے دھیرے ملفوف سی۔ سنائی دے رہی تھیں۔ اور وہ یقیناً سُرنگ کے راستے سفر کرتیں میرے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ اس کے بعد غدر برپا ہو گیا۔ اودھم مچ گیا۔ یلغار ہو گئی۔

کہ شب کی نیم سیاہی میں سُرنگ کے اندر سے لوگ اُبلنے لگے۔ مرد خواتین بچے بوڑھے سُرنگ میں سے برآمد ہو کر صحن کو بھرنے لگے۔ میں غار کی تاریکی میں دُکا بیٹھا اُنہیں بے چارگی سے دیکھتا رہا۔ جیسے میں ایک فقیر تھا جس کی جھونپڑی پر قبضہ کرنے والے آگئے تھے۔ ایک غریب کرائے دار تھا جسے بے دخل کرنے والے آگئے تھے۔

فارسی میں گھریلو باتیں کرتے۔ کبھی چیلے ہوتے کبھی جھگڑتے۔ بچوں کو سرزنش کرتے اور اس کے ساتھ ہی بیجان سے لبریز۔ بلند آواز میں درود شریف پڑھتے۔ دُعا میں مانگتے۔ کچھ گریہ کر رہے تھے۔ وہ صحن میں داخل ہوتے گئے۔ تاریکی میں آئے اور جب اُن میں سے کسی ایک کی نارنج کا رخ غار حرام کی جانب ہوا تو وہاں میں تھا۔

نارنج کی روشنی میں آیا ہوا دوڑا نو بیٹھا ایک سُرنگ آکھوں والا۔ اوجیز عمر شخص جس کا چہرہ ان زمانوں کا نہ تھا۔ جو میں تھا۔ چاندنی کے جزیروں کا داغا ہوا۔ جس کے کاندھے دکتے تھے کہ وہ اُن کاندھوں میں ثبت ہوئے تھے۔ جس کی جیب میں ایک قلم تھا جو شاید ابھی تک لرزش میں تھا جس کے گھٹنوں پر غار حرام کے فرش کے سنگریزوں کی شکلیں نقش تھیں اور جس کی دودھ کی بوتل سے منہ لگا کر بابا نے ایک گھونٹ بھرا تھا اور جس کی آنکھوں میں رست جگا تھا۔ جو میں تھا۔

ظاہر ہے وہ جو کوئی بھی تھا جس کی نارنج کی روشنی میں یکدم ظاہر ہو گیا تھا یکدم خوفزدہ ہو گیا کہ یہ کون ہے۔ جیسے رضا ٹھنک گیا تھا۔ رک گیا تھا اور مجھے کوئی ہمت نہ رہی تھی۔ ایسے اُس شخص نے بھی مجھے بھی کھانا اور ٹھکانہ دیا۔

کہتا رہا۔ اور اپنے لڑتے ہوئے میرے ہاتھوں کے قریب کرتا کہتا رہا۔

صحن میں جتنے بھی مرد تھے اُن میں سے بیشتر نے باری باری میرے ہاتھوں کو تھاما اور کچھ نہ کچھ کہا۔ وہ خواتین جو نوافل کی ادائیگی کر چکی تھیں انہوں نے مجھ سے کچھ پردہ نہ کیا۔ ذرا جھک کر مسکراتے ہوئے یا آبدیدہ ہو کر کچھ اظہار کیا۔

اصل میں اس مقام کے ایسے ہی لوگ حقدار تھے۔ رسولؐ کے عشق میں کنھن چڑھائیاں چڑھتے اور وہ بھی رات کے اس پہر۔ جو یہاں پہنچے تھے میں جذبات کی جن منزلوں پر وہ تھے وہاں تک کبھی نہیں پہنچ سکتا تھا۔ حقدار تو یہی تھے میں تو ایک غاصب تھا۔ میں غار میں سے اُٹھا اور باہر آ کر اُن میں شامل ہو گیا۔ سُرنگ کے برابر میں جو چٹان تھی اُس سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ جونہی میں غار سے نکلا اُس کمر خیدہ بوڑھے نے میری جانب نہایت لجاجت سے دیکھا کہ اگر اجازت دو تو میں اندر چلا جاؤں۔ وہ اسی انتظار میں تھا کہ میں اُس مقام کو خالی کروں تو وہ اندر جا کر دو چار لحوں کے لیے سر جھکالے۔ میں نے مسکرا کر ہاتھ ہلایا تو اُس نے غار میں داخل ہو کر سر جھکا دیا۔

صرف صحن میں ہی نہیں۔ سُرنگ میں بھی لوگ منتظر تھے اور اُن پر نظر کی تو جبل نور سے جو سیڑھیاں دکھائی کے برابر میں اُترتی بابا بنگالی کے چھتر تک آتی تھیں اور اُن میں سے تین چار یہاں سے بھی دکھائی دے جاتی تھیں اُن پر بھی سیاہی بولے حرکت میں تھے۔ رات کی نیم تاریکی میں غول کے غول اُتر رہے تھے۔ جبل نور کی چوٹی پر بھی ایک جم گھٹا دکھائی دے رہا تھا جن میں سے کچھ سائے نفل ادا کر رہے تھے۔

اُس معتبر شخص نے اپنے ویڈیو کیمرے اور اُس کی لائٹ کا رخ میرے چہرے پر مرکوز کیا اور مجھ سے سوال کرنے لگا۔ براہ کرم آگاہ کریں کہ آپ کل شام کتنے بجے یہاں تشریف لائے تھے۔ مکمل تنہائی میں یہاں کتنا وقت گزارا۔ اور کیا بتی۔

میں کیا بتاتا کہ کیا بتی۔ اُس کے سوالوں کے جواب میں ہوں ہاں کرتا مسکراتا رہا۔ یکدم مجھ پر خیال آیا کہ نیا ز کہاں ہے۔ ظاہر ہے اس ہنگامے میں وہ سو تو نہیں رہا ہوگا۔ اور وہ وہاں نہیں تھا۔ جانے کب اپنا بوریا بستر سمیٹ کر اوپر چلا گیا تھا۔ غالباً ابھی کچھ دیر پہلے جب مجھ پر خیدہ کا غلبہ ہوا تھا تب۔ یا دائروں کی آمد پر ہی وہ اُنٹھ کر چلا گیا تھا۔

اُدھر خیدہ کمر بوڑھا سلام پھیرتا تو پھر اُنٹھ کر نیت باندھ لیتا۔ جب وہ چوتھی بار نیت کرنے کو تھا تو ایک اور ایسے ہی خیدہ کمر بابا جی نے اُس کی کمر پر ہاتھ رکھ کر شاید اُسے ڈانٹا کہ اب بس بھی کرو۔ پھر ہی باری ہے۔

جانا تھا تو پستی میں ہی جانا تھا۔ نیچے ہی اُترنا تھا۔ کسی مزید بلندی کی جانب تو سفر نہیں کرنا تھا کہ اس بلندی کے اوپر تو کوئی اور بلندی ہے ہی نہیں۔

کہار ڈولی لے کر آجائیں تو ڈھن لاکھ جتن کرے۔ آنسو بہائے۔ لاکھ منت سماجت کرے کہ بس ایک روز اور بائیل کی گلیوں میں رہنے دو۔ اُس کی کچھ سُنی نہیں جاتی۔ کہار آتے ہیں تو کبھی خالی ڈولی لے کر واپس نہیں جاتے۔

تو کوچ کا رخصتی اور جدائی کا لمحہ نزدیک تھا۔ جیسے غار کی چھت پر وہ نزدیک تھا۔ صحن میں بیشتر سیاہ پوش فرہ اور کچھ چھریرے بدن کی خواتین۔ کچھ مصلوٹوں پر اور بیشتر فرش پر نفل ادا کر رہی تھیں اور سیاہ شہزادیاں لگتی تھیں۔ اُن کے ہاں ہاتھ باندھنے کا دستور نہ تھا اس لیے ہاتھ کھولے کھڑی تھیں۔

ایرانی زائرین ہمیشہ سُلج رہتے ہیں۔ سُل کیمروں۔ موبائل فونوں اور ویڈیو کیمروں سے۔ اور اُن میں سے بیشتر جو کچھ دیکھتے تھے کیمرے کی آنکھ سے دیکھتے تھے اس کے سوا کچھ اور کم ہی دیکھتے تھے۔ اور میرا خیال ہے کہ وطن واپس پہنچ کر ہی دیکھتے تھے کہ ہم کہاں گئے تھے۔ فلیش لائٹس مسلسل آنکھوں کو چند حیا کی تھیں اور ویڈیو کیمروں کی لائٹیں مسلسل پتھروں اور چٹانوں پر سفر کرتی انہیں عیاں کرتی تھیں۔

ایک عمر رسیدگی میں ڈھلتا معتبر شخص اپنے ویڈیو کیمرے کی روشنی جب مجھ تک لایا تو میرے قریب ہوا۔ مجھ سے ہاتھ ملایا اور پوچھا ”آپ ہم سے پہلے آ گئے۔ کب آئے تھے؟“ میں نے بتایا تو اُس نے لائٹ آف کر دی اور جھک کر بولا ”آپ ابھی نہیں آئے۔ کل شام سے یہاں ہیں۔ رات غار حرا میں بسر کی ہے؟“

”جی۔“

”پوری رات۔“

”جی۔“

اُس معتبر شخص نے زائرین کی جو یلغار صحن کو بھرتی تھی اُن سے مخاطب ہو کر فارسی میں کچھ وقت آمیز کلام کیا تو آوازوں کا شور یکدم ختم کیا اور وہ سب جھک جھک کر مجھے ایک عجوبے کی صورت دیکھنے لگے۔

ایک خیدہ کمر بوڑھے نے جس کے ہاتھوں کے بال بھڑی اور ہے تھے آنکھوں کے گرد طاقے تھے اور اس ڈھیلا اور ہاتھ آگے ہو کر دیکھ رہا تھا۔ دونوں ہاتھوں کو تھامے رکھا اور پوچھ رہا تھا کہ کیا

ساتھ لے جاؤں۔ لیکن میں اس خیال سے باز آ گیا۔ گریز صرف اس لیے کیا کہ شاید یہ ایک گستاخی ایک بے ایمانی نہ ہو چوری کے زمرے میں نہ آ جائے اس لیے گریز کیا۔ تین تھیلے میں سامان بھر کر میں نے اُس کی زپ چڑھائی۔ پھر جو گر پہنے اور چھوٹا نارنج روشن کر کے غار حرا سے ہمیشہ کے لیے باہر آ گیا۔

زائرین اب مجھے بھلا چکے تھے۔ میں ایک قصہ پارینہ تھا۔ میں جلد از جلد وہاں سے نکل جانا چاہتا تھا کہ یہ وہ غار نہ رہی تھی جو میرا گھر تھی۔ یہ صحن میرا نہ رہا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میرے ذہن پر نقش اور بدن پر ثبت جو غار حرا اور صحن کی شب بھر کی تنہائی اور اپنائیت کی تصویریں ہیں اُن پر اس ہجوم اور دھکم پیل کے دھبے پڑ جائیں۔

زائرین میں سے راستہ بنانا میں سرگم میں داخل ہوا اور وہاں بھی راستہ بنانا پڑتا تھا۔ اور وہاں ایک پُر لطف منظر بھی تھا۔ ایک ایرانی معیار سے بھی فرہ خاتون اُس چٹان اور پتھر ملی دیوار کے درمیان میں بھنسی ہوئی تھی جہاں سے میں اپنی توند سمیت بمشکل گزرتا تھا۔ وہ کبھی اپنے لاچار خاوند پر برستی تھی جو چٹان کے قریب اُس پر نارنج کی روشنی ڈالے سر کھاتا تھا کہ اب کیا کیا جائے اور کبھی اپنی موٹی موٹی ٹانگیں ہلاتی ہنسنے لگتی تھی۔

سرگم سے باہر چھپر تلے آیا تو وہ بھی آباد ہو چکا تھا۔

بابا بنگالی اپنی نشست پر پھسکا مارے بیٹھا بیٹھا سیڑھیوں سے اترنے والے زائرین کو ذرا آگے ہو کر جھک کر سرگم کے اندر اپنی بڑی نارنج سے روشنی ڈالتا راہ دکھاتا تھا اور اُس نے ایسا اہتمام کر رکھا تھا کہ کوئی بھی زائر بابا بنگالی کی توند کے عین آگے پتھر پر نمائش شدہ تومان 'ریال' لیرا اور روپے کے نوٹوں کو درگزر نہ کر سکے اور اُن میں اضافہ کر کے ہی آگے جائے۔ چنانچہ وہ مشمول ہو چکا تھا۔

چونکہ میں ایسا زائر نہ تھا جس کی جیب میں سے کوئی ریال وغیرہ آسانی سے باہر آ سکے اس لیے بابا بنگالی نے قطعی طور پر مجھے قابل توجہ نہ سمجھا۔ بالکل لفٹ نہ کرائی۔ نہ جان نہ پہچان نہ سلام نہ دعا۔ آگے جھکا ہوا ایرانیوں کو راہ دکھاتا رہا۔ دیدہ و دل فرس راہ کرتا رہا۔

میں اپنا تین تھیلے اٹھائے اُس کے برابر میں سے گزر کر پتھروں پر جو گر جماتا غار حرا کی چھت کی جانب اوپر چلا گیا۔ اور اسی محل نارنج کی تھی۔

وہاں غار میں میرا کچھ سامان پڑا تھا۔ میرا کچھ سامان تمہارے پاس پڑا ہے وہ لوٹا دو۔ تین تھیلے وہیں دھرا تھا۔

میں خالی ہاتھ اور ننگے پاؤں باہر آ گیا تھا۔ میرے جو گر 'تبیج' دودھ کی بوتل 'نارنج' ہال پوائنٹ 'ٹشو پیپر' وغیرہ وہیں اُس ہموار پتھر پر رکھے تھے۔ میرا وہ مصلے جس پر لوگ نفل پڑھ رہے تھے۔ مجھے اپنا سامان سمیٹنا تھا۔

میرے لمبے پورے ہو گئے تھے۔ مجھے بابا کی اونچی حویلی سے اب رخصت ہونا تھا۔ رانجن کی جھوک سے جدا ہونا تھا۔ کہا رآ گئے تھے۔ اب مجھے کوچ کرنا تھا۔

میں کوشش کر کے۔ معافی اور تشکر کے کلمات بڑبڑاتا آگے ہوا۔ غار کے دہانے پر متعدد لوگ اپنی باری کے منتظر تھے اور اندر ایک اور بابا جی ایسے تھے کہ باہر آنے کا نام نہ لیتے تھے۔ میں بھی اُن کے ہمراہ انتظار کرنے لگا۔ پھر میری باری آ گئی۔

سامان سمیٹنے سے پیشتر آخری بار بابا کا اور اللہ کا شکریہ ادا کرنے کے لیے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔

لیکن کچھ لطف نہ تھا۔

مجھے یوں نفل ادا کرنے کی عادت ہی نہ تھی کہ پشت پر آوازوں کا شور ہو۔ منتظر لوگ ہوں جن کی بے چین آنکھیں میرے کندھوں کو جلاتی ہوں۔ ایک ہجوم ہو۔ میں نے اس مقام پر ٹھہرنے کے بہت بہانے بنائے۔ آہستہ آہستہ ایک ایک لفظ الگ الگ کر کے پڑھاتا کہ کچھ وقت لگے۔ سجدے میں گیا تو گیا ہی رہا۔ سلام پھیرنے کے بعد ہاتھ دعا میں اٹھائے تو غار حرا کے آخر میں جو شکاف تھا جس میں سے ہلکی نامعلوم سی روشنی آرہی تھی اُسے دیر تک تکتا رہا۔ دعا کے بعد میں نے آس پاس کے پتھروں پر ہاتھ پھیرے۔ اُنہیں الوداع کہا۔ جیسے کسی مکان کو ہمیشہ کے لیے چھوڑنے سے پیشتر اُس کے مکین اُسے حسرت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور جاتے ہوئے دیوار و در کو چھوتے ہیں اُن پر ہاتھ پھرتے ہیں۔

جیسے بے گھر کیے جانے والے آخری بار اپنے گھر کو دیکھتے ہیں۔

میں نے اپنا سر باندھا اٹھایا۔ تین تھیلے اٹھائے اور اپنا سامان سمیٹنے لگا۔ آخر میں اپنے جانناڑ کو اٹھایا اُس کے تلے وہ بوسیدہ ہزاروں جبینوں سے آشنا غار حرا کی واحد زیست وہ مصلے سمٹا چکا تھا۔

میں نے اپنے گھر کی طرف لوٹنے کے لیے دوں اور اس بوسیدہ مصلے کو

غارجرا کی چھت سے ذرا اُدھر جہاں سے جبل نور کی کھائی گہرائی میں گرتی تھی وہاں میں نے اتنی جگہ ٹٹول کر.. ٹارچ کی روشنی میں دریافت کر لی جہاں ایک مصلے بچھانے کی کچھ گنجائش تھی اور کھائی میں لڑھک جانے کا امکان قدرے کم تھا..

مصلے بچھا کر میں نے اپنا تہتی تھیلا اُس کے برابر میں رکھا اور اطمینان سے بیٹھ گیا.. جیسے اپنے گھر سے بے دخل ہو جانے والے مجبوری کے تحت کھلے آسمان تلے رات بسر کرتے ہیں ایسے میں بھی تھا لیکن میرے دل میں کچھ ملال نہ تھا، کوئی رنج نہ تھا کہ میں کیوں بے دخل کر دیا گیا.. میرے اندر ایک امن تھا:

میں بہت شائق اور سکون میں تھا..

میری یا تریا مکمل ہو چکی تھی..

میں وہ یا تری تھا جس نے من مندر میں جتنی بھی گھنٹیاں تھیں اُن کا ترنم رات بھر سنا تھا..

بابا کے عشق کی جو گنگا تھی اُس میں جی بھر کے اُشان کیا تھا..

میں اُن کے نور در نور سراپے کے برگد تلے رات بھر بیٹھا رہا تھا اور مجھے اپنی گناہوں بھری سیاہ چادر کے باوجود چاندنی کے جزیروں.. قلم کی لرزش اور اُن کے جتنے سے دہلی ہوئی چٹان کے ساتھ کندھے ملانے کا گیان حاصل ہو چکا تھا..

تو میں کاہے کو رنج میں مبتلا ہوتا یا ملال کرتا.. میں شائق اور امن میں تھا..

پیچھے دھیان کرتا تھا تو جبل نور کی چوٹی سے اُترنے والی سیڑھیوں پر اب کوئی نہ اُترتا تھا کہ زائرین اُن سیڑھیوں پر براہمان تھے.. غارجرا تک جانے والی سُرنگ اور اُس کے صحن میں اتنے لوگ بھر چکے تھے کہ وہ اُتر نہ سکتے تھے اس لیے وہیں آباد ہو گئے تھے سیڑھیوں پر.. مزے سے منتظر تھے جیسے پکک منانے آئے ہوں..

ڈاکٹر رضاعلیٰ یہاں موجود نہ تھا.. وہ شاید اس جہوم کے نزول سے خوشتر ہی یہاں سے

رخصت ہو چکا تھا..

کیسا شاندار شخص تھا..

غارجرا کی شب تنہائی میں چند لمحوں کے لیے میرا واحد ساتھی.. اُس رات کے اکلاپے میں اُس

تو خود گفتی کہ در قلب شکست خانہ داری

قلب میں ہوا ہے خود وفا میں

اگر عشق گناہ ہے تو میں اس گناہ میں غرق ہو چکا ہوں..
رات اب بھی تاریک اور گھنی تھی لیکن صرف ایک فرق کے ساتھ کہ پہلے ہر سو پُچپ کے ڈیرے تھے اور اب ہر سو قدموں کی آئیں اور زائروں کی باتیں اور مناجاتیں سنائی دے رہی تھیں..
لیکن اب بھی میرے درجات بلند رہے تھے.. ایک تو جبل نور کی بلندی اور پھر یہ کہ میرے آس پاس وہاں اور کوئی نہ تھا..

دوسب کے سب چوٹی سے اُتر کر.. بابا بنگالی کے پہلو سے نکل کر.. سُرنگ میں داخل ہوتے تھے.. غارجرا کے چاؤ میں چلے جاتے تھے.. اُدھر کوئی نہ آتا تھا..
یہاں کوئی نہ تھا..

یعنی کوئی ذی روح نہ تھا.. وہ تو تھا اور نزدیک تھا اور سامنے اُس کا گھر ایک مٹی انچر خانہ کعبہ تھا جو رات کے اس پہر جبل نور کی آخری گھاٹی سے پرے شہروں کی ماں مکہ کی آبادیوں سے بہت پرے تاریکی میں اپنے آپ کو یوں ظاہر کرتا تھا کہ اُس پر ایک خواہناک پریوں کے قلعے کا گمان ہوتا تھا..
اس عقیدت بھری خواہناکی میں ایک کھروڑی حقیقت کا بھی اقرار کر لیا جائے.. میں اپنے مصلے سے اُٹھا.. احتیاط سے قدم رکھتا ذرا آگے گیا.. غارجرا کے صحن میں جھانکا تو وہاں بھگدڑ کی وہی کیفیت تھی.. اُس سے ذرا آگے ہوا.. اتنا کہ ذرہ بھر آگے ہوتا تو ایسا آگے ہوتا کہ پھر لوٹ نہ سکتا.. کھائی میں گر کر جانے کہاں ابدی آرام فرما جاتا..

تو میں اُس آخری کنارے تک گیا..

آس پاس سوائے رات کے اور کوئی نہ تھا تو میں نے ایک بار پھر عمر رسیدگی کے باعث بعض نازک اعضاء پر پڑتے بوجھ کو خالی کیا اور اطمینان کا ایک سانس بھر کر سگریٹ سلگا لیا..
سگریٹ کا آخری کش کھینچ کر میں نے اُسے چنگی میں بھیجا اور تاریک خلاء میں پھینک دیا اور اُس کی مدھم سگاہٹ کھائی میں گرتی چلی گئی..

واپس آ کر منزل وائر سے اپنے ہاتھ بھگوئے مصلے پر بیٹھ کر تسبیح کے کچھ دانے پھر لے اور پھر سامنے نظر آتے منظر نے پیام بھیجے کہ اے مرد ناداں تیری نادانی کی بھی کوئی حد ہے.. میرے اور تیرے درمیان کوئی پردہ حائل نہیں اور پھر بھی تو بیکار بیٹھا ہے.. میری جانب رخ کر.. ہاتھ باندھ لے.. یہ کچھ تیرے نصیب میں پھر نہیں ہونے کا.. اور میں نے پیام کی تعمیل کی.. ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا..

سب سلام پھر تو دائیں جانب وہ پہاڑ نظر آیا جس پر ایک شخص افق تا افق کھڑا نظر آیا تھا..

سے کچھ کچھ سہارا کرتی تھیں۔ لیکن سانس دیکھتے تو تاریکی اور خاموشی میں چپ وادی مگہ۔ فجر کی اذان سے زندہ اور متحرک ہونے لگی۔ اللہ کے گھر کے گرد اُس کا نام لیا جانے لگا اُس کی ہوائی کا اعلان کیا جانے لگا۔

جب اذانوں کا تسلسل ختم ہوا۔ تو میں نے باقاعدہ محسوس کیا کہ خانہ کعبہ میں لوگ فجر کی ادائیگی کے لیے بیت کرنے کو ہیں۔ میں نے جس طور پچھلی شب ایک یکتا تنہائی میں اور جبل نور کی چوٹی ایسے بے مثل مقام پر نماز عشاء ادا کی تھی ویسے ہی اب بھی خانہ کعبہ کو نظر میں رکھتے ہوئے فجر کی ادائیگی کے لیے ہاتھ باندھ لیے۔ اور لمحہ موجود میں بھی میں تنہا غار حرا کی چھت پر کھڑا تھا اپنے بچائے ہوئے مصلے پر۔ تلوں تلے اُس کی نرمی اور اُس کے تلے جو چٹان کی سختی موجود تھی اُسے محسوس کرتے ہوئے۔ اور اختتام پر جب دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو کوئی تازہ حرف دعا یاد نہ آیا کہ دعا مانگنے کے لیے کچھ باقی نہ رہا تھا۔ جو مانگنا تھا اتنی بار مانگ چکا تھا کہ وہ جو جبل نور پر جھکے آسمان کی نزدیکی میں مجھ سے نزدیک تھا وہ بھی شاید تنگ آ چکا تھا کہ اس بے حوصلہ شخص کو کیا مجھ پر کچھ اعتبار نہیں کہ یوں بار بار التجائیں دوہراتا چلا جاتا ہے۔ کیا میری یادداشت پر شک کرتا ہے کہ جو مجھے مسلسل یاد دلاتا چلا جاتا ہے۔

کیا میں نے فجر کی نماز غار حرا کے اندر ادا کرنے کے بارے میں سوچا۔ نہیں۔ اقل نہیں۔ ایک تو مجھے خوب خبر تھی کہ وہاں ہجوم کی کیا حالت تھی۔ کیسا غوغا ہوگا اور دوسرا یہ کہ یہ مقام بھی کیسا اعلیٰ تھا۔ سویر کی اُندنی ہوئی ٹھنڈک کو اپنے رخساروں پر محسوس کرنا۔ اپنے آپ کو بے انتہا میں محسوس کرنا۔ تنہا اور خانہ کعبہ کو نظر میں رکھنا اور اُس میں جو لوگ فجر ادا کرتے تھے اپنے آپ کو اُن میں بھی محسوس کرنا۔

فجر کی ادائیگی کے بعد۔

مجھے رخصت ہو جانا چاہیے تھا۔

جبل نور سے اتر جانا چاہیے تھا۔

اب اور تو کچھ باقی نہ رہا تھا۔

لیکن میں اتنا بھولا نہ تھا۔ قدرے شاکر شخص تھا۔ میرے دل میں کچھ اور بھی تھا۔ یہاں اگلی ٹھہرے رہنے کا کچھ جواز بھی تھا۔ میں اُسی دوزانو حالت میں اپنے مصلے پر بدستور براجمان رہا۔ ابھی ایک اور کیفیت کا شہسوار تھا۔ مجھے اپنے چہرے اور بدن پر ابھی کچھ کرنوں کو وصول کرنا تھا۔

اور بائیں جانب رخ کیا تو وادی مگہ کی آبادیاں تھیں۔

میں اُس شب کی سیاہی میں بہت دیر تک یونہی اپنے مصلے پر بیٹھا رہا۔

اپنا رخ کعبے کی جانب کر کے۔

پھر کچھ دیر لیٹا رہا۔

اچھا اس کھلی فضا میں اپنے مصلے پر نیم دراز ہونا بھی ایک الگ سا لطف تھا۔ غار حرا کے اندر تو حدود تھیں۔ اگرچہ ایک ذاتی سراسر ذاتی بسیرا تھا لیکن یہاں جبل نور اُس پر جھکے آسمان اور وادی مگہ سے ہم آہنگی اور ان کے ساتھ سانس لینے کی۔ اُن کا ایک حصہ ہونے کی انوکھی کیفیت کا سرور تھا۔

چونکہ لیٹے ہوئے۔ حالت بیداری میں مجھے ادھر ادھر چھوٹنے کی عادت ہو چلی تھی جو غار حرا کی عنایت تھی تو یہاں بھی میں اپنے آس پاس بے دھیانی میں ہاتھ پھیرتا رہا۔ برابر کی چٹانوں پر۔ ایک دو پتھروں کو۔ چھوٹا رہا۔

میں نے اپنی دائیں ہتھیلی تلے کچھ سنگریزوں کی سختی محسوس کی۔ سنگریزوں سے جھم میں ذرا بڑے پتھر تھے جو میرے لمس میں آتے تھے۔

یہاں تو بہت ٹنجد اور سخت ہیئت کی چٹانیں تھیں تو یہ سنگریزے یا پتھر کہاں سے آ گئے۔ پہلے نہیں تھے۔ میں متعدد بار ادھر آیا تھا تو پہلے اگر تھے تو میں نے غور نہیں کیا تھا۔ میں نے نارنج روشن کر کے اب غور کیا اور مجھے اُن کی موجودگی کا جواز سمجھ میں آ گیا۔ کسی زائر نے شاید ابھی کچھ دیر پیشتر چوری چھپے اس چٹان کو جو غار حرا کی چھت کا ایک حصہ تھی کسی ہتھوڑی یا کسی اور سخت شے کی ضرب سے توڑا تھا۔ تاکہ رنج سفر کی کوئی نشانی تو پاس ہو۔ اور وہ کوئی نشانی کوئی پتھر توڑ کر لے گیا تھا اور یہ اُس کے باقیات تھے۔ دو چھوٹے چھوٹے پتھر۔ میں نے تو ترغیب کے باوجود اور تنہائی کے باوجود جس میں غار حرا کے اندرون کا کوئی حصہ میں کیسا بے خطر ہو کر توڑ سکتا تھا۔ میں نے ایسا نہیں کیا تھا۔ محض ایک نشانی کی خاطر اُس گھر کا چہرہ خراب نہیں کیا تھا۔ اب ان دو پتھروں کو۔ ابھی جب سویر ہوگی تو کوئی نہ کوئی اٹھا کر لے جائے گا۔ تو میں کیا براہوں۔ میرا تو اس میں کوئی دوش نہیں شاید یہ میری نیک نیتی کا انعام تھا۔ میرے ہی لیے یہ بندوبست کیا گیا تھا۔ یہ نشانی خصوصی طور پر وہیں رکھی گئی تھی جہاں مجھے مصلے بچھانا تھا اور پھر برابر کی چٹان کو چھوٹا تھا۔ چنانچہ میں نے اُن دو پتھروں کو کسی بھی احساس گناہ کے بغیر اٹھایا اور تھقی تھیلے میں سنبھال لیا۔ اور آٹھ میرے پاس ملکہ حرا کی راست اور اُن کی سویر کی کیا کیا نشانیاں ہیں۔ وہ مصلے جو میں نے اُس میں بچھایا تھا۔ ایک شمع ایک قلم تھقی تھیلہ اور دو پتھر۔ اور پھر بہت عزیز وہ جو گھر

بچھایا تھا۔ اگرچہ یہ سب تاریکی میں تھا۔

حیات جتنی ہوتی ہے اتنی ہی سویریں ہوتی ہیں۔ کبھی فیئری میڈ میں اور کبھی جمیل کرومیر کے کنارے۔
تو ان بے آنت سویروں میں یہ محض ایک اور سویر تھی۔

لیکن بس اتنا فرق تھا کہ وہ سب سویریں مجھ پر۔ صرف مجھ پر اترتی تھیں۔

اور یہ سویر جو اترنے کو تھی اس میں بابا بھی شریک تھے۔

وہ جبل نور کی چوٹی کے عین اوپر سے طلوع نہیں ہوا بلکہ دامن سے جس راستے پر میں
چڑھتا ہوا اوپر آیا تھا اُس سمت سے ایک سنہری کنگن کی صورت نمودار ہوا۔ پہاڑ کی ڈھلوان کے عقب
سے ظاہر ہوا تو پہلے اُس کا ایک حصہ دکھائی دیا جو نیم سیاہی کے گلے سے لگا ایک سنہری کنگن دکھائی دیا۔
اس کنگن کی گولائی پوری ہونے میں اور اس آتشیں پیالے کے پوری طرح ابھرنے میں دیر نہ لگی۔ فجر کی
ٹھنڈک اُس کے آگے ماند پڑتی ہوئی تمازت میں بدلنے لگی۔ اور اسی حساب سے میرا چہرہ بھی دھوپ
میں آتا گیا۔

ایسے میں اُن دنوں اُن کا چہرہ بھی اسی دھوپ میں۔ دھوپ کے اسی زاویے کی زد میں آ کر
روشن ہوتا ہوگا۔ روشن جمال یار سے ہے انجمن تمام۔

روشنی پھیلنے سے اندازہ ہوا کہ زائرین کی تعداد بہت زیادہ ہے۔

اُن میں سے دو تین میرے قریب سے گزرتے میرے مصلے پر پاؤں نہ آ جانے کا دھیان
رکھتے آگے آخری کنارے تک چلے گئے۔

اور جب میں فجر کی ادائیگی سے کب کا فارغ ہو چکا تھا ایک مرتبہ پھر اذانیں میرے آس
پاس سے بلند ہونے لگیں۔

جبل نور کے چپتر کے آگے۔ اترتی سیڑھیوں پر۔ اور غار حرا کی چھت پر۔ ایرانی زائرین
کانوں کو چھوتے اذانیں دینے لگے۔ اللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔

میں حیرت سے اس منظر کو سمجھتا تھا۔ درجنوں لوگ۔ کوئی کسی پتھر پر۔ کوئی بہت بلندی پر۔ اور
کوئی سیڑھیوں پر۔ خانہ کعبہ کی جانب رخ کیے۔ جو نشیب میں وادی نمک کی گھنی آبادیوں کے درمیان اب
پہلے کی نسبت کم واضح تھا کہ روشنی نے گھروں شاہراہوں اور بستیوں اور خانہ کعبہ کو ایک ہی صف میں کھڑا
کر دیا تھا۔ پہلے وہ تاریکی کے درمیان ایک چکا چوند منور ماڈل تھا اور اب وہ آبادیوں کا ایک حصہ ہو چکا تھا
اُن سے الگ نظر نہ آتا تھا۔ یہ ایک جادوئی منظر تھا۔

میں اب سورج سے مدد کر پھر منہ دل کعبہ شریف کیسے اپنے مصلے پر بیٹھا ہوں اور میرے
اور گرد اس بلندی پر اذانیں بلند ہوتی ہیں۔

سورج کے طلوع ہونے میں ابھی چند ساعتیں باقی تھیں۔

اور میں نے اُس کی اولین اُن زرد کرنوں کا انتظار کرنا تھا۔ انہیں اپنے چہرے اور بدن پر
محسوس کرنا تھا۔ اُن زرد کرنوں کا جو آج سے چودہ سو برس پیشتر تقریباً انہی موسموں میں اور اسی مقام پر اور
اسی زاویے پر اترتی تھیں اور بابا کے چہرے اور بدن پر پڑتی تھیں۔

میں نے پچھلی شب بابا کے بدن اور آنکھوں کے ساتھ گزاری تھی۔ چاندنی کی سب ساعتوں
کو۔۔۔ ہواؤں کے سب پہلو۔ ہر جھونکے۔ چاندنی کے ہر دھبے۔ اور شب کے گزرنے سے ہر ٹھنڈک کو
جوں کا توں اپنے بدن اور آنکھوں میں محسوس کیا تھا۔ ہر ایک پتھر کو۔ ہر سنگریزے اور ہر چٹان کو۔ اپنے
تئیں اپنی پوروں پر محسوس کیا تھا جیسے بابا محسوس کرتے تھے۔

کیا واقعی اور کچھ باقی نہ رہا تھا۔

باقی تھا۔ بس ایک طلوع آفتاب باقی تھا۔

میں ماہتاب کا نہیں آفتاب کے ابھرنے کا منتظر تھا۔

اور یہ انتظار طویل نہ ہوا۔ مختصر ہوا۔

البتہ مجھے اُس کے سامنے چہرہ بہ چہرہ ادب رو ہونے کے لیے اپنا رخ بدلنا پڑا۔ خانہ کعبہ سے
منہ موڑنا پڑا کہ آفتاب نور کے پہاڑ کی اوٹ میں سے ابھرنے کو تھا کہ ادھر سے ہی سپیدہ سحر روشن۔ بہت
آہستہ آہستہ۔ دھیرے دھیرے روشن ہو رہا تھا۔

وہ نمودار تو ہو چکا تھا لیکن جبل نور کی چوٹی میرے اور اُس کے راستے میں حائل تھی۔ میں
اُسے دیکھ نہ سکتا تھا صرف اُس کی زرد اور نیم روشن علامتیں تاریکی کی چادر میں سنہری دھاروں کی
صورت بہتی تھیں۔ ایک سیاہ رنگ کی اوڑھنی میں دکتی کمیش کے ٹاکوں کی صورت اپنے ہونے کی خبر
دیتی تھیں۔

میں نہیں جانتا کہ ایک گناہوں بھری چادر کو اوڑھنے والے کو اُس نے کیوں اتنی ڈھیل
دی۔ اتنے بے شمار سانسوں کو اس کے لیے وقف کر دیا۔ لیکن اس ڈھیل میں اور ان سانسوں میں اور
اس حیات میں۔ ظاہر ہے میں نے بہت سی سویریں دیکھیں۔ کیسے کیسے آفتاب کیسی کیسی سرزمینوں پر
ابھرتے دیکھے۔

جرمنی کے ہلکے فارلے کی سیاہی میں۔ اور کبھی جمیل ونڈر میر کے کناروں پر۔ دریائے سین
کے کنارے پائل کی شب بھری رفاقت کے بعد۔ یا ماسکو کے ریڈ سکوئر میں۔ ارض روم میں۔ آٹمن
سکندریہ میں۔ ہومر کی مائی الکلیڈا والی سویریں۔ ہر رات میں ان سویروں کا کوئی آنت نہیں۔

نہیں... یہ تو مناسب نہیں... اسے ساتھ لے جاتا ہوں... نیچے پہنچ کر کہیں پھینک دوں گا... میں نے اُسے تہتی تھیلے میں رکھ لیا۔

اٹھا... اور اپنا مصلے سمیٹا... اُسے تہہ کر کے تھیلے میں رکھ رہا تھا تو میری انگلیاں تھیلے میں پڑے چند پتھروں کو چھو گئیں... یہ کیا ہیں... اور پھر فوراً ہی دھیان آ گیا کہ یہ تو نشانیاں ہیں... اور اُس لمحے وہ بلی نمودار ہو گئی۔

بہت آہستہ خرامی سے... جہاں میرا مصلے تھا اور جو سمیٹا جا چکا تھا اُس کے برابر میں جو چٹان تھی وہاں نمودار ہو گئی۔

سورج کی روشنی میں اُس کا ایک ایک بال روشن تھا... البتہ اُس کی آنکھیں دھندلی تھیں... اور میں نہیں جانتا تھا کہ یہ وہی بلی ہے جو پچھلی شب جبل نور کی چوٹی پر ترک مسجد کے سینٹ کے تھڑے پلے ہوئے جس نے میرے ساتھ آنکھیلیاں کی تھیں یا وہی ماؤں بلی ہے جو غار حرا میں میرے برابر میں آ لی تھی۔

وہ جو بھی بلی تھی میرے برابر میں چٹان پر آ بیٹھی اور مجھے نہایت نڈر اور اپناایت کی نظروں سے دیکھنے لگی۔

مجھے خدشہ ہے کہ کچھ لوگ شک کریں گے کہ یہ بلی پھر کیسے نمودار ہو گئی... اگر آپ شک کرنے والوں میں سے ہیں تو یہ بیان آپ کے لیے نہیں ہے... میں نے تو وہی کچھ بیان کرنا ہے جو مجھ پر گزرا ہے۔

میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ بلی میری کسی بھی حرکت سے ٹھٹک جائے اور چلی جائے چنانچہ میں نے نہایت آہستگی سے تہتی تھیلے میں سے دودھ کی بوتل ہولے سے نکالی... اور اُس کے پینڈے میں کچھ دودھ ڈھوپ میں دکھائی دیتا تھا۔

اب یہ دودھ اس ماؤں بلی کو پلاؤں کیسے۔

میرے برابر میں جس چٹان کو کسی نے مجروح کر کے اُس میں سے ایک نشانی الگ کی تھی اُس کی ساخت میں تھوڑا سا نشیب تھا... میں نے بوتل کا ڈھکن کھول کر اُس ہلکے سے نشیب میں دودھ کے آخری گھونٹ انڈیل دیئے... کچھ تو بہہ گیا اور کچھ ایک مختصر سے سفید تالاب کی صورت اختیار کر گیا جسے ڈھوپ مزید سفید کرنے لگی۔

وہ جو بھی بلی تھی دودھ کے سفید تالاب میں اپنی موٹھیں بھونکی اُسے سر کرنے لگی۔

کبھی دودھ اٹھا کر مجھے اپناایت کی نظروں سے لواتی اور پھر دودھ سر کے لگتی۔

مجھے اس منظر کا کچھ گمان نہ تھا... اور یہ ایک غیر متوقع اور سحر انگیز کیفیت تھی جس سے میں دو چار ہوا۔

اگرچہ ایرانی برادران اپنے عقیدے کے مطابق اذان میں کچھ اضافے بھی کرتے تھے لیکن مجھے اس سے کوئی ضعف نہ پہنچتا تھا... کچھ غرض نہ تھی... کہ وہ کم از کم اپنے جذبے کا اظہار کر رہے تھے اور میں منہ اٹھائے اپنے مصلے پر بیکار بیٹھا تھا... وہ اپنے انداز میں رب کی توصیف تو کر رہے تھے اور میں پُچپ بیٹھا انہیں دیکھتا تھا۔

وہ سب جو اذانیں دے رہے تھے ظاہر ہے زیادہ خوش الحان تو نہ تھے لیکن اُن کا جذبہ انہیں سر میں لے آتا تھا۔

میرا بہت جی چاہا کہ میں بھی اُن میں شامل ہو جاؤں... میں اُن کی جانب... کبھی میڑھیوں پر کھڑے کسی شخص کو اور کبھی میرے عین برابر میں کھڑے دو تین لوگوں کو مسکراتے ہوئے بہت حسرت سے دیکھتا جاتا تھا... لیکن مجھ میں اجتناب تھا ایک جھجکتی ہمت نہ تھی... اور یہ خوف تھا کہ اگر میں نے اپنے مصلے پر کھڑے ہو کر صرف اللہ اکبر... کی صدا بلند کی تو تمام اذانیں رُک جائیں گی... سب لوگ میری جانب متوجہ ہو جائیں گے کہ یہ کون ہے... اور کیسی گھگھیا کی ہوئی آواز میں اللہ کو پکار رہا ہے... اس کے اندر شک ہے جو اس کی آواز گلے میں سے پھنس پھنس کر نکل رہی ہے۔

اذانوں کے بعد جو جہاں تھا وہیں نماز یا نوافل ادا کرنے لگا اور خاموشی ہو گئی۔

صرف ڈھوپ بولتی تھی کہ میں آگئی ہوں۔

روشنی کی چمکیلی سرسراہٹ تھی۔

مجھے جانا تھا۔

نیچے اُترنا تھا۔

نور کے پہاڑ کی گھائیوں اُترائیوں کھائیوں اور راستوں پر اب اتنی روشنی اُتر چکی تھی کہ اُس

کے سہارے آسانی سے دامن تک اُتر جاسکے۔

چل خسر و گھراپے۔

میں نے دودھ کی بوتل سے منہ لگا کر اپنے تئیں ایک آخری گھونٹ بھرا... اُسے ذرا ہلایا تو اُس

کے اندر تھوڑی سی چمکاہٹ باقی تھی... ایک آدھ گھونٹ باقی تھا... میں نے ایک اور گھونٹ لیا تب بھی کچھ

دودھ محسوس ہوتا تھا۔

کیا اس بوتل کو بوجھ کر کے کی خاطر میں جہاں کھائی میں پھینک دوں

ابو ہریرہؓ کی بنیوں کی نسل کی ایک لٹی تھی یا نہیں.. لیکن غار حرا میں گزار دی ہوئی اُس رات کی آخری یاد وہی لٹی تھی.. وہ دودھ جو ختم ہونے میں نہ آتا تھا اُسے جبل نور کی ایک چٹان کے نشیب میں طلوع ہونے والے سفید تالاب میں سے موچیں بھگوتی اُسے مزے سے سُرتی لٹی..

نور کے پہاڑ سے اُترتے ہوئے.. میرا تہتی تھیلا ہلکا ہو چکا تھا.. بابا کی مانند میری پوٹلی میں جو خوراک تھی وہ میرے کام آچکی تھی.. کھجوریں، پانی، دودھ، سینڈوچ اور ایک سیب.. اور میں بھی ہلکا، لطیف اور ہر سکون ہو چکا تھا..

کوئی تھکاوٹ نہ تھی.. کچھ اضمحال نہ تھا..
بس سکون اور سرخوشی تھی..

جیسے ایک موسیٰ کو ہر طور سے اُترتے ہوئے سکون اور سرخوشی میں ہوتا ہے..
ایسے میں جبل نور سے اُس سویرا اُترتا تھا..

UrduPhoto.com

UrduPhoto.com

UrduPhoto.com

مَنْدُولِ کعبے شریف

(سفرنامہ حج)

مستنصر حسین تارڑ

(۱) مجموعہ مستنصر حسین تارڑ: نکلے تری تلاش میں، اندلس میں اجنبی، خانہ بدوش (۲) ہنزہ داستان (۳) سفر شمال کے (۴) کے ٹوکھانی (۵) نا نگا پر بت (۶) پاک سرائے (۷) سنولیک (۸) دیو سائی (۹) بریلی بلندیاں (۱۰) چترال داستان (۱۱) رتی گلی (۱۲) بہاؤ (۱۳) راکھ (۱۴) قربت مرگ میں محبت (۱۵) ڈاکیا اور جولاہا (۱۶) قلعہ جنگلی (۱۷) پیار کا پہلا شہر (۱۸) جیسی (۱۹) دیس ہوئے پردیس (۲۰) نکلے تری تلاش میں (۲۱) اندلس میں اجنبی (۲۲) خانہ بدوش (۲۳) نیپال نگری (۲۴) پرندے (۲۵) پکھیر (۲۶) کارواں سرائے (۲۷) ہزاروں ہیں شکوے (۲۸) پرواز (۲۹) مورت (۳۰) کالاش (۳۱) گزارا نہیں ہوتا (۳۲) چک چک (۳۳) اُلو ہمارے بھائی ہیں (۳۴) سنہری اُلو کا شہر (۳۵) شہپر (۳۶) ہزاروں راستے (۳۷) سیاہ آنکھ میں تصویر (۳۸) سورج کے ساتھ ساتھ (۳۹) شمشال بے مثال (۴۰) شتر مرغ ریاست (۴۱) پتلی پیکنگ کی (۴۲) بے عزتی خراب (۴۳) گدھے ہمارے بھائی ہیں

Rs. 450.00

www.sang-e-meel.com

ISBN 969-35-1895-0



9 789693 518955